ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسئلہ کا حل

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ - ھُوَالنَّاصِرُ

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو مدنظر رکھتے ہوئے سائمن کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

دیباچہ

سائمن کمیشن (SIMON COMMISSION) کی رپورٹ پر تبصرہ کرنا ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اِس وقت ہندوستان اور انگلستان میں پیدا ہو رہے ہیں کوئی معمولی امر نہیں ہے کیونکہ ایک طرف ہندوستان کا ایک طبقہ اسے رجعت قھقری قرار دے رہا ہے تو دوسری طرف انگریزی قوم کا ایک حصہ اسے اندھیرے کی چھلانگ بتا رہا ہے۔ طبائع جوش میں ہیں نوجوانِ ہندوستان، آزادی کے خوشنما خواب دیکھ رہا ہے تو تجربہ کار انگلستان آہستگی اور احتیاط کا مشورہ دے رہا ہے۔ وہ اسے اپنی آزادی میں حائل قرار دے رہا ہے تو یہ اسے دیوانگی کے مرض میں مبتلا سمجھ رہا ہے ان حالات میں مشورہ دینا آسان کام نہیں۔ جب ایک خاص خیال انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے تو اچھی سے اچھی بات بھی اسے بُری معلوم دینے لگتی ہے اور وہ اپنے خیر خواہ کو بدخواہ سمجھ لیتا ہے لیکن باوجود اس کے میں موجودہ صورت حالات کو دیکھتے ہوئے خاموش نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ حقیقت کو معلوم کرنے کی طرف بہت کم توجہ ہے اور ایک دوسرے کی طرف سے دل اس قدر بغض و کینہ سے لبریز ہیں کہ حُسن ظنی نام کو بھی باقی نہیں رہی ہے۔ ایک عام ہندوستانی انگریز کی ہر بات میں منصوبہ بازی اور دھوکا دہی کی کوئی چال محسوس کرتا ہے اور ایک عام انگریز ہر آزادی کے خواہشمند

ہندوستانی کو جاہ پسند اور مفسد تصور کرتا ہے۔

پس میں سمجھتا ہوں کہ گو ایک مذہبی آدمی ہونے کے لحاظ سے مجھے سیاست ملکی سے اس قدر تعلق نہیں ہے جیسا کہ ان لوگوں کو جو رات دن انہی کاموں میں پڑے رہتے ہیں لیکن اسی قدر میری ذمہ داری صلح اور آشتی پیدا کرنے کے متعلق زیادہ ہے۔ اور نیز میں خیال کرتا ہوں کہ شورش کی دنیا سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے میں شاید کئی امور کی تہہ کو زیادہ آسانی سے پہنچ سکتا ہوں بہ نسبت ان لوگوں کے کہ جو اس جنگ میں ایک یا دوسری طرف سے شامل ہیں۔ پس اس وقت جب کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اعلان کی وجہ سے لوگوں کی توجہات مسئلہ ہندوستان کے حل کرنے میں لگی ہوئی ہیں میں بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے خیالات دونوں ملکوں کے غیر متعصب لوگوں کے سامنے رکھ دوں۔

میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ کام مشکل ہے۔ ہندوستان جیسا وسیع ملک جس میں تینتیس کروڑ نفوس بستے ہیں اور جس میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں اس کے مستقبل کے متعلق کچھ لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ سے جو سب مخلوقات کا مالک اور خالق ہے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے فضل اور رحم سے کام لے کر اس نازک معاملہ کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائے اور ہمیں اس راستہ کو اختیار کرنے کی توفیق دے جو ہمارے حال اور مستقبل دونوں کے لئے اچھا ہو اور جس پر چل کر ہم نہ صرف اس قابل ہوں کہ اپنی دنیا کو اچھا کر سکیں۔ بلکہ اس کی رضا کے حصول کی بھی ہم میں قابلیت پیدا ہو۔ ہم کمزور ہیں لیکن وہ طاقت والا ہے، ہم مستقبل کی ضرورتوں سے ناواقف ہیں لیکن وہ واقف ہے پس اسی کی مدد سے ہم حقیقی خوشی اور حقیقی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس کے آگے ہم جھکتے ہیں کہ وہ ہماری مدد اور نصرت کرے اور ہماری بہتری کے سامان پیدا کرے۔

اس کے بعد میں انگریز افسرانِ حکومت کو خواہ ہندوستان کے ہوں خواہ انگلستان کے خصوصاً اور باقی انگریزوں کو عموماً کہتا ہوں کہ آپ لوگوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کے سپرد ایک امانت کی ہے اس امانت کو صحیح طور پر ادا کرنا آپ کا فرض ہے۔ مادیت کی ترقی نے خدا تعالیٰ پر ایمان بہت کمزور کر دیا ہے اور جو لوگ اس پر یقین بھی رکھتے ہیں وہ بھی اسے ایک بے تعلق شاہد کی طرح سمجھتے ہیں جو دنیا کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا لیکن یہ بات درست نہیں اگر ایسا ہوتا تو وہ نبیوں کا اتنا لمبا سلسلہ نہ جاری کرتا۔ اس

دنیا کا پیدا کرنے والا خدا اس کی بہتری سے غافل نہیں رہ سکتا تم اس سیاسی امر میں اس کا ذکر کرنے پر ہنسو یا مجھے بیوقوف سمجھو لیکن حق یہی ہے کہ ایک دن سب کو اس کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ بہت ہیں جو اِس زندگی میں اُس کی ہستی کو نظرانداز کر دیتے ہیں لیکن ان کی موت کے وقت کی گھڑیاں حسرت و اندوہ میں گزرتی ہیں۔ پس چاہئے کہ آپ اپنی ذمہ واری کو سمجھتے ہوئے اور خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے تینتیس کروڑ آدمی کی قسمت کے فیصلہ کے وقت اپنے قلیل اور بے حقیقت فوائد کو بالکل نظرانداز کر دیں کہ وہ روپیہ کی گِنتی میں خواہ کروڑوں ہندسوں سے بھی اوپر نکل جائیں لیکن اخلاق و روحانیت کے لحاظ سے ایک آدمی کی آزادی کے برابر بھی ان کی قیمت نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ انصاف سے کام لیں گے تو خواہ آپ کے بعض ابنائے وطن اِس وقت آپ کو گالیاں دیں اور غدار کہیں لیکن ایک دن آئے گا کہ آپ کی اپنی ہی نسلیں نہیں بلکہ تمام دنیا کے لوگ آپ کے نام کو عزت سے لیں گے اور آپ کی یاد کے وقت ادب سے لوگوں کی گردنیں جھک جائیں گی اور آپ کا ذکر ہمیشہ کے لئے بابرکت ہو جائے گا۔

اسی طرح میں اپنے اہلِ وطن سے کہتا ہوں کہ اس نازک موقع پر اپنے دلوں کو تعصّب اور کینہ سے خالی کر دو کہ گو یہ جذبات بظاہر میٹھے معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں ان سے زیادہ تلخ اور تکلیف دہ کوئی چیز نہیں۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کا وقت آ گیا ہے۔ خدا تعالیٰ دلوں میں ایک نئی روح پھونک رہا ہے۔ تاریکی کے بادلوں کے پیچھے سے امید کی بجلی بار بار کوَند رہی ہے۔ خواہ ہر آنے والی ساعت کی تاریکی پہلی تاریکی کی نسبت کس قدر ہی زیادہ کیوں نہ ہو ہر بعد میں ظاہر ہونے والی روشنی بھی پہلی روشنی سے بہت زیادہ روشن ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی مشیّت کا اظہار کر دیتی ہے۔ پس اپنے کینہ اور بُغض سے خدا تعالیٰ کی رحمت کو غضب سے نہ بدلو اور اس کے فضل کو اس کے قہر میں تبدیل نہ کرو کہ وہ ضِدّی اور ہٹ دھرم اور سچائی کے منکر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انگریزی قوم کا وجود ہندوستان میں خواہ کتنا ہی خود غرضی پر مبنی ہو پھر بھی خدا تعالیٰ کے فضلوں میں سے ایک فضل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے آنے کی وجہ سے ہم نے بہت کچھ کھویا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کے آنے کی وجہ سے ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے۔ اگر دنیا کی مادی ترقی کی بنیاد اب جدید مغربی علوم پر رکھی جانے والی

ہے جیسا کہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی ہونے والا ہے تو جو کچھ ہم نے کھویا ہے اسے ہم ایک تختی کے دھوئے جانے سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس فضل پر شکر کرنا چاہئے کہ اس نے ہمارے ملک کو دوسرے مشرقی ممالک کی نسبت زیادہ سہولت کے ساتھ ان علوم کا وارث بنا دیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو سوائے جاپان کے ہندوستان علوم جدیدہ اور ان کے نتائج سے باقی سب ایشیائی ممالک کی نسبت زیادہ بہرہ ور ہوا ہے اور دانستہ یا نادانستہ جس طرح بھی ہو اس صورتِ حالات کے پیدا کرنے میں انگریزوں کا بہت کچھ دخل ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ہندوستانی ہونے کا خیال اور ان کا آپس میں اتحاد بھی بہت کچھ انگریزی سیاست کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور قانون کا ادب اور کم سے کم ہندوستانیوں کے آپس کے اختلافوں میں انصاف بھی انہی کے عہد کا نتیجہ ہے۔

پس ہمیں ان کے عیبوں کے ساتھ ان کے ہنروں کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ جو شخص صداقت کے ایک حصہ کا انکار کرتا ہے وہ دوسرے حصوں کا انکار کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے ہماری بیداری کا موجب بنایا ہے ہمیں بھی اس کے ساتھ مجنونانہ سلوک نہیں کرنا چاہئے اور اس آخری فیصلہ کی گھڑیوں کو بِلاوجہ تلخ کر کے دنیا میں ایک نئی جنگ کی بنیاد نہیں رکھنی چاہئے کہ ظلم جس طرح ایک انگریز کے ہاتھ سے بُرا ہے ویسا ہی ایک ہندوستانی کے ہاتھ سے بھی بُرا ہے۔ پس آپ لوگ نرمی اور محبت سے ایک ایسے فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں کہ جو دلوں کی کدورت اور کینہ کو دھو دے اور ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھیں جو محبت و اتحاد کا ایک نیا دور شروع کرنے والی ہو۔ یاد رکھیں کہ دنیا ایک جسم ہے اور تمام ممالک اس کے عضو ہیں اس وقت تک بہت سے لوگ اس کے اعضاء کو کاٹنے کی کوشش میں لگے رہے ہیں اب خدا چاہتا ہے کہ سب دنیا کو اس کی اصل شکل میں قائم کرے اور ملکیت و ملوکیت کی قیدوں سے آزاد کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے برطانوی حکومت کا ڈھانچہ ایک بہترین ڈھانچہ ہے اور اس میں یہ قابلیت ہے کہ مختلف الاحوال اور دور دراز کے ملکوں کو بغیر ان کی آزادی کو نقصان پہنچانے کے ایک سلسلہ میں منسلک کر دے۔

پس ایسے ذرائع کو استعمال کرو کہ عمدگی اور مضبوطی کے ساتھ ہندوستان بھی اس اتحادِ عالَم کی بنیاد کی ایک مکمل لیکن پیوست اینٹ ہو اور جھوٹی خواہشوں کے پیچھے پڑ کر ایسی راہیں تلاش نہ کرو کہ جو اس عجیب و غریب تجربہ کو جو مختلف ممالک کی آزادی کو قائم رکھتے

ہوئے انہیں ملکیت کی قیدوں سے آزاد کرانے کے لئے کیا جارہا ہے تباہ کر دے۔

خدا تعالیٰ آپ لوگوں کے ساتھ ہو اور ہر ایک جو اس فیصلہ میں حصہ لینے والا ہے' خواہ اِس ملک کا' خواہ اُس ملک کا' اس کے دل اور دماغ پر اپنے الہام کی روشنی ڈالے تاکہ وہ اس کی مرضی کے مطابق چلے یہاں تک کہ دنیا میں ہماری نہیں بلکہ اس کی مرضی کی حکومت ہو کہ اسی میں سب برکت اور اسی میں سب راحت ہے۔

حصّہ اول

باب اوّل

اصولی مباحث

تمہید اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت اس امر کا فیصلہ کر چکی ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کوئی خاص سکیم غور کرنے کے لئے معیّن نہیں کی جائے گی لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں سب سے زیادہ توجہ سائمن کمیشن کی رپورٹ حاصل کرے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانیوں کے احساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے غالبًا برطانوی نمائندے اس رپورٹ کا اس قدر کم نام لیں گے جس قدر کہ کام کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لئے ممکن ہو اور ہندوستانی نمائندے بھی غالبًا اس مخالفت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اس رپورٹ کی ہندوستان میں ہوئی ہے اس کا ذکر بہت ہی کم کریں گے سوائے اس کے کہ مخالفت کے رنگ میں ہو۔ لیکن اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ برطانوی نمائندے ہوں خواہ ہندوستانی دونوں کے دماغوں پر یہ رپورٹ حکومت کر رہی ہو گی اور وہ اس کے اثر سے خواہ کس قدر بھی کوشش کریں آزاد نہیں ہو سکتے۔ اور اس کے دو سبب ہیں۔

(ا) اول یہ کہ اس رپورٹ کے علاوہ کوئی اور مکمل رپورٹ نہیں ہے جس نے قانونِ اَساسی کی تمام شاخوں پر روشنی ڈالی ہو اور ہر ایک امر کی دلیل دی ہو۔ نہرو رپورٹ ہے لیکن وہ (الف) ناقص اور نامکمل ہے۔ (ب) ایسی جماعت نے اسے تیار کیا ہے جو ہندوستانیوں میں سے خاص فوائد کی نمائندہ تھی۔ اور (ج) اس میں بعض دوسری اقوام کے

فوائد کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ (۵) اس کے بہت سے اچھے حصے سائمن کمیشن کی رپورٹ میں شامل کر لئے گئے ہیں۔

(۲) باوجود اس کے کہ سائمن رپورٹ کی شدید مخالفت ہوئی ہے لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس رپورٹ کا ڈھانچہ ایسا ہے کہ اس میں مناسب اصلاح کر کے ایک مفید اور قابلِ عمل اساسِ حکومت بنایا جا سکتا ہے۔ اور بعض پیچیدہ مسائل اس میں ایسے طریق پر حل کر دیئے گئے ہیں کہ جن کے بغیر ہندوستان میں کبھی امن نہیں ہو سکتا اور وہ صورت جو سائمن کمیشن نے تجویز کی ہے غالباً ہندوستانیوں کے منہ سے نکلی ہوئی کبھی بھی انگلستان کے لئے قابل تسلیم نہ ہو سکتی۔ پس انگلستان کی رائے کو آسانی سے متاثر کرنے کے لئے بعض معاملات میں مسلمان اور بعض میں ہندو سائمن رپورٹ کا نام لئے بغیر اس کے دلائل سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہونگے۔

پس ان حالات میں اس رپورٹ کو نظر انداز کرنا بالکل ناممکن ہے اور کسی چیز کے اچھے حصے کو بھی اس کے بُرے حصے کی وجہ سے خراب اور بُرا کہنا خلاف دیانت ہے۔ پس میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کارروائی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں سائمن کمیشن کی رپورٹ پر ریویو کروں۔

سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ رپورٹ اس قدر بُری نہیں جس قدر کہ اس خلاصہ سے ظاہر ہوتا تھا جو ہندوستان میں شائع کیا گیا۔ اس میں کئی جگہ غلطی بھی کی گئی تھی اور کئی جگہ اختصار کی وجہ سے مضمون واضح نہ ہوتا تھا۔ پس ان حالات میں ہر ایک شخص نے اس پر نہایت سختی سے تنقید کی اور انہی لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ لیکن اصل کتاب کو پڑھنے کے بعد میری بھی رائے بدل گئی اور بہت سے دوسرے لوگوں کی بھی رائے بدل گئی۔ اس کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی نقطہ نگاہ سے اس میں بہت سے اچھے امور بھی ہیں اور بہت سے بُرے امور بھی ہیں لیکن باوجود کمیشن کی اس رائے کے کہ یہ رپورٹ ایسے رنگ میں لکھی گئی ہے کہ یا اسے کُلّی طور پر قبول کرنا ہوگا یا کُلّی طور پر رد کرنا ہوگا میرے نزدیک اس کی اصلاح آسانی سے ہو سکتی ہے اور یہ رائے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی انہوں نے صرف نہرو رپورٹ سے متأثر ہو کر لکھ دی ہے۔ میں نے اسے خوب غور سے پڑھا ہے اور میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعض حصوں میں تبدیلی کر کے اور بعض کی جگہ پر بالکل اور قوانین تجویز کر کے ہم اس سکیم کو اختیار کر سکتے ہیں اور

اس سے کسی صورت میں بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

یہ امر صرف سائمن کمیشن سے مخصوص نہیں کہ اس کے بعض حصے بعض دوسرے حصوں سے تعلقِ شدید رکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر سکیم میں یہ بات پائی جاتی ہے اور یہ عقلمند آدمی کا کام ہے کہ جب وہ کسی ایک حصہ میں تبدیلی کرنا چاہے تو یہ بھی دیکھ لے کہ اس کا دوسرے حصوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ پھر اگر دوسرے حصوں میں تبدیلی کرنے سے وہ سکیم کسی مفید غرض کو پورا کرتی ہو تو اس تبدیلی کو اختیار کرے ورنہ موازنہ کرے کہ دوسرے حصوں میں تبدیلی سے زیادہ نقصان ہوتا ہے یا اس حصہ کو قائم رکھنے سے زیادہ نقصان ہوتا ہے جس میں تبدیلی کا اسے خیال پیدا ہوا تھا اور یہی سلوک ہمیں سائمن کمیشن کی رپورٹ سے کرنا چاہئے۔ اور میری ذاتی رائے تو یہی ہے کہ خود سائمن رپورٹ کو ہی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں زیر بحث لانا چاہئے کہ اس میں زیادہ آسانی رہے گی اور کام جلدی سے ختم ہو جائے گا۔ ورنہ مختلف سکیمیں پیش ہونگی جن کے پیچھے وہ اخلاقی طاقت نہ ہوگی جو اس رپورٹ کے پیچھے ہے نہ وہ اس قدر غور اور مطالعہ کا نتیجہ ہوں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگوں کی توجہ کو پوری طرح جذب نہ کر سکیں گی اور نامکمل غور کے نتیجے میں ان کے کئی اچھے نکتے ردّ کر دیئے جائیں گے اور کئی بُری باتیں بظاہر خوشنما ہونے کی وجہ سے قبول کرلی جائیں گے۔ لیکن چونکہ اس سکیم کی سخت مخالفت ہو چکی ہے۔ شاید ممبران راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اسے مصلحت کے خلاف سمجھیں کہ اس رپورٹ کو سامنے رکھ کر اس میں تبدیلی کی کوشش کریں اس لئے اس صورت میں مَیں تو انہیں یہ مشورہ دوں گا کہ خواہ اس رپورٹ کا ذکر وہ نہ کر سکیں لیکن اس کو خوب مطالعہ کر کے اس مجلس میں شامل ہوں اور ہمیشہ اس کے مضامین پر نگاہ رکھیں کہ باوجود بہت سے نقائص کے یہ رپورٹ ان کے بہت کام آئے گی۔ خصوصاً مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس رپورٹ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے انگریزوں کو ہندوستان کے لئے فیڈرل سسٹم کے قبول کرنے کی طرف مائل کر دیا ہے حالانکہ انگلستان اپنی قدیم روایات کے اثر کے ماتحت اس سسٹم کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے اس جگہ یہ بھی لکھ دینا چاہئے کہ باوجود بہت محنت کے کمیشن کے ممبروں نے شاید جلدی کی وجہ سے بعض مقامات پر حسابی غلطی بھی نکالی ہے اور بعض جگہ بعض مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اصل مقام پر پھر اس اشارہ کے مطابق سکیم کو پیش نہیں کر سکے لیکن اس امر پر مجھے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو اگر اللہ تعالیٰ نے کامیاب کیا تو ڈرافٹ بنانے والے اس قسم کے نقائص کی خود اصلاح کرلیں گے۔

باب دوم

ایشیائی ممالک میں نیابتی حکومت

کمیشن نے رپورٹ کے حصہ دوم کی تمہید میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ہندوستان میں مغربی اصول پر آئین۔ حکومت کا تجویز کرنا بالکل درست نہیں کیونکہ جو آئین کہ سینکڑوں سال کے تجربہ کے بعد ایک مغربی ملک کے باشندوں نے تجویز کیا ہے وہ آسانی سے ایک ایسے مشرقی ملک پر چسپاں نہیں ہو سکتا جہاں کہ ہزاروں سال تک خود مختار حکومت کا دور دورہ رہا ہے۔ گو کمیشن نے کسی ایک جگہ اس مضمون پر تفصیلی بحث نہیں کی لیکن مختلف مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور چونکہ علاوہ کمیشن کے بہت سے یورپین مصنف بھی اس کی طرف اپنی کتب میں توجہ دلاتے رہتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس سوال کے متعلق بھی کچھ لکھوں کیونکہ جب تک انسان کے دل کی وہ گرہیں نہ کھل جائیں جن کی وجہ سے وہ کسی خاص مضمون کو سمجھنے کے ناقابل ہو اس وقت تک خواہ وہ سمجھنے کی کوشش بھی کرے اس مضمون کو نہیں سمجھ سکتا۔

اگر کمیشن کا یہ مطلب ہے کہ انگلستان کا نظام اپنی مکمل صورت میں ہندوستان میں جاری نہیں کیا جا سکتا تو میں اس میں کمیشن کی رائے سے بالکل متفق ہوں لیکن اس میں مشرق و مغرب یا کسی پرانی یا نئی روایت کا ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ کسی ملک کے تجویز کردہ آئین بھی کسی دوسرے ملک میں خواہ وہ اس پہلے ملک سے خیالات میں انتہائی درجہ کا متحد ہی کیوں نہ ہو پوری طرح جاری نہیں ہو سکتے۔ انگلستان کا آئین ہندوستان کے لئے ہی ناقابلِ قبول نہیں بلکہ فرانس اور جرمنی نے بھی اسے اپنے ملک میں جاری نہیں کیا اور یونائیٹڈ سٹیٹس (UNITED STATES) جس کے اکثر باشندے انگلستان کے رہنے والے ہیں وہ بھی اس کی نقل کرنے سے قاصر رہا ہے بلکہ خود انگلستان کے ماتحت جو نو آبادیاں ہیں ان میں

بھی پوری طرح انگریزی آئین جاری نہیں۔ پس یہ تو ایسی واضح بات ہے کہ اس کا خاص طور پر ذکر کرنا یا اسے اہمیت دینا بالکل خلافِ عقل ہے۔

لیکن اگر کمیشن کی یہ مراد ہے کہ نیابتی حکومت کا طریق خواہ کسی صورت میں ہو مشرقی حالات کے منافی ہے اور اس کے جاری کرنے میں احتیاط چاہئے تو مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اگر آج سے چند سو سال پہلے یہ بات کہی جاتی تو اور بات تھی لیکن آج جب کہ سب دنیا میں آئینی حکومت کا دور دورہ ہے اور ایران اور افغانستان بھی جو تعلیم کے لحاظ سے بھی اور مغربی ممالک سے تعلقات کے لحاظ سے بھی ہندوستان سے بہت پیچھے ہیں اس طریق کو جاری کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایران اور ترکی تو ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں اور جاپان بھی اس میں بہت کچھ ترقی کر چکا ہے یہ کہنا کہ ہندوستان جو دنیا کی اس نئی تحریک کا بہت حد تک مطالعہ کر چکا ہے اور تھوڑا بہت تجربہ بھی رکھتا ہے اس کے لائق نہیں بالکل درست نہیں ہو سکتا۔

دنیا کی تاریخ بھی اس رائے کے مخالف ہے۔ انگلستان نے بے شک صدیوں میں نیابتی حکومت کا سبق سیکھا ہے لیکن فرانس اور جرمنی نے اس طریق کو یکدم ہی اختیار کر لیا تھا۔ یہی حال پولینڈ اور آسٹریا کا ہے۔ ان کی حکومتوں کے تغیر پر سینکڑوں نہیں بلکہ چند ہی سال لگے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ نمونہ تیار کرنے میں دیر لگتی ہے لیکن نمونہ کی نقل میں اس قدر دیر نہیں لگتی۔ سٹیم انجن کی دریافت پر جس قدر دیر لگی تھی اتنی دیر اس کا دوسرا نمونہ بنانے میں نہیں لگی اور نہ ہر ملک کی ضرورتوں کے مطابق انجنوں کے نئے نمونوں کے بنانے میں دیر لگی پس یہ استدلال کمیشن کے ممبروں یا دوسرے یوروپین مصنفوں کا درست نہیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے خواہ مزاج مختلف ہوں، حالات مختلف ہوں لیکن وہ اصولی اتحاد جو سب دنیا کے لوگوں میں پیدا ہو رہا ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان بے شک انگلستان کے آئین کی لفظ بہ لفظ نقل نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کے ہمسایہ ملک فرانس اور جرمن اس کی نقل نہیں کر سکتے لیکن اپنی ضرورتوں کے مطابق وہ ایک نیا ڈھانچہ ضرور تیار کر سکتا ہے اور اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔ گو ابتداء میں مشکلات ہونگی لیکن کونسا تجربہ بغیر خطرات کے قبول کرنے کے کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خطرات کو کم کرنے کی کوشش کریں لیکن خطرات کی وجہ سے ترقی کی طرف قدم نہ اٹھانا ہمیں خطرات سے تو شاید نہ بچاوے لیکن ترقی سے ضرور محروم کر دے گا۔

باب سوم

کیا ہندوستان آزادی کا مستحق ہے؟ اگر ہے تو کس حد تک؟

پیشتر اس کے کہ ہم ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت پر بحث کریں ہمیں اصولی طور پر یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا ہندوستان اخلاقاً یا سیاستاً آزادی کا مستحق ہے اور اگر ہے تو کس حد تک؟ کیونکہ بغیر اس کے کہ ہمارے خیالات اس سوال کے متعلق ایک اصل پر قائم ہوں ہماری بحثیں بالکل فضول اور لغو ہونگی اور سوائے اس کے کہ ہم اور زیادہ پیچیدگیوں میں پڑ جائیں ہمارے مباحثات کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

پس سائمن رپورٹ یا کسی اور رپورٹ پر غور کرنے سے پہلے یا انگریزوں اور ہندوستانی نمائندوں کے تفصیلی تبادلہ خیالات سے پہلے اس سوال کا حل کر لینا ضروری ہے۔ جب اس سوال کا حل ہو جائے گا تو اگلی بحثیں آسانی سے طے ہو سکیں گی ورنہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ہندوستان کو آزادی کا حق ہی حاصل نہیں وہ کس طرح اس بحث کے طے کرنے میں مُمِدّ ہو سکتا ہے کہ کس حد تک ہندوستان کو اختیارات دیئے جائیں؟ اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان کو فوراً آزاد کر دیا جائے وہ کب اس بحث میں مدد دے سکتا ہے کہ آئندہ سکیم میں کن کن حفاظتی تدابیر کی ضرورت ہے؟ آزادیٔ ہند کے سوال کو ان دو نقطۂ نگاہ سے دیکھنے والے افراد بھی کسی سمجھوتہ کی طرف آ ہی نہیں سکتے۔ اور اگر وہ ایک دوسرے کی دھمکیوں یا اصرار یا لوگوں کے مجبور کرنے سے کسی سمجھوتہ پر پہنچیں بھی تو یقیناً وہ سمجھوتہ کسی اصل پر مبنی نہ ہوگا بلکہ اس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے مخالف ہوں گے۔ اور ایک حصہ بجائے

دوسرے حصے سے پیوست ہونے کے اُس جبریا مصلحت سے مطابقت رکھے گا جس کے اثر کے نیچے اس کا تصفیہ ہوا تھا اور ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی سکیم ملک کے لئے کس قدر خطرناک ہوگی؟

پس میرے نزدیک بہتر ہوگا کہ اصل مضمون کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے اسے قریب الفہم بنانے کے لئے اس سوال کو اپنے علم کے مطابق حل کرنے کی کوشش کروں کہ کیا ہندوستان آزادی کا مستحق ہے اور اگر ہے تو کس حد تک؟ اور اس غرض کے لئے پہلے میں اس سوال کے پہلے حصہ کو لیتا ہوں۔

کیا ہندوستان آزادی کا مستحق ہے

اس سوال کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے۔ مذہبی طور پر، اخلاقی طور پر اور سیاسی طور پر۔

مذہبی سوال سب سے مقدم ہے لیکن چونکہ انگلستان اور ہندوستان اور خود ہندوستان کی مختلف اقوام کا مذہب ایک نہیں اس لئے مذہب کی رو سے بحث اس سوال کے حل کرنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ پس میں اسے چھوڑ کر اخلاقی پہلو کو لیتا ہوں۔

۲۰۔ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو (MR. MONTAGUE) نے ہاؤس آف کامنز میں جو تقریر کی۔ اس میں ہندوستان کے آئندہ نظامِ حکومت کے متعلق ایک یہ فقرہ بھی تھا کہ:۔

"حضور ملک معظم کی حکومت کی پالیسی جس کے ساتھ حکومت ہند کو بھی پورے طور پر اتفاق ہے یہ ہے کہ انتظام مملکت کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کو بتدریج بڑھنے والا حصہ دیا جائے اور آہستہ آہستہ آزاد محکمے قائم کر دیئے جائیں تاکہ ترقی کرتے کرتے ہندوستان میں برطانوی تاج کے ماتحت ایک آزاد نیابتی حکومت قائم ہو جائے۔"

اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی تمہید میں اسی فقرہ کو لفظ بلفظ نقل کر کے برطانوی پارلیمنٹ بھی اس میں ظاہر کردہ خیالات سے اپنا اتفاق ظاہر کر چکی ہے۔

یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مسٹر مانٹیگو (MR. MONTAGUE) کا اعلان ان کا اپنا ذاتی اعلان نہ تھا بلکہ برطانوی وزارت کا تسلیم شدہ اعلان تھا اور سائمن رپورٹ سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان میں (RESPONSIBLE GOVERNMENT) کے الفاظ لارڈ کرزن (LORD CURZON) کے قلم سے لکھے ہوئے اب تک موجود ہیں۔

پس اس اعلان سے حکومت ہند کے علاوہ جس کی رضامندی صاف لفظوں میں ظاہر ہے

برطانوی وزارت بھی اپنا اتفاق ظاہر کر چکی ہے۔ حکومت ہند' وزارت برطانیہ اور پارلیمنٹ کے بعد بادشاہ کی شخصیت ہی رہ جاتی تھی کہ جن کی تصدیق صاف لفظوں میں اس اعلان کے متعلق نہ تھی۔ لیکن ۱۵۔ مارچ ۱۹۲۱ء کو حضور ملک معظّم کی طرف سے گورنر جنرل ہندوستان کے نام جو ہدایت نامہ جاری کیا گیا اس میں صاف لفظوں میں اس اعلان کی طرف اشارہ کر کے نہ صرف اس کی تصدیق کی گئی ہے بلکہ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ملک معظّم تحریر فرماتے ہیں۔

"دسویں۔ اوپر کے تمام امور کے لئے ہماری خواہش اور مرضی ہے کہ ہماری پارلیمنٹ نے جو اصول ہندوستان میں ایسی نیابتی حکومت کے قیام کے لئے جو ہماری مملکت کا جزو رہے تجویز کئے ہیں۔ ان پر اس طرح عمل کیا جائے کہ آخر کار اس کے نتیجہ میں برطانوی ہندوستان ہماری ڈومینینز (DOMINIONS) میں اس مقام کو حاصل کر سکے جس کا وہ حقدار ہے۔"

ان اعلانات سے ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ معظّم' پارلیمنٹ' وزارت برطانیہ اور حکومتِ ہند سب کے سب اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں ان کی حکومت کا طریق آئندہ ایسا ہو گا کہ جس کے نتیجہ میں ہندوستان کے مختلف حصص سلف گورنمنٹ (SELF GOVERNMENT) حاصل کر لیں گے اور ہندوستان بحیثیت مجموعی نیابتی حکومت حاصل کر لے گا۔ یہ ایک وعدہ ہے جس سے انگلستان اخلاقاً کسی صورت میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اور اگر وہ "تدریجی" یا ایسے ہی الفاظ کی پناہ لے کر اس وعدہ کے پورا کرنے میں دیر کرے تو بھی گو وہ قانوناً زیر الزام نہ ہو لیکن اخلاقاً وہ بہت بڑی ذمہ واری کے نیچے آ جائے گا اور اس چیز کو جو آخر میں حکومتوں کے نشان کے طور پر اکیلی باقی رہ جاتی ہے یعنی "نیک نامی" ناقابلِ تلافی طور پر نقصان پہنچا دے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس اعلان میں درجہ نو آبادیات کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ نیابتی حکومت کا ہے اور ان دونو اصطلاحوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ گو اس فرق کی طرف توجہ دلانے والے بعض ایسے انگریز ہیں جن کو میں اپنا دوست سمجھتا ہوں لیکن میں اس میں ان سے اختلاف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اعلان مذکور کے تین جملے قابل غور ہیں۔

اول۔ "ہندوستانیوں کی بڑھنے والی شمولیت تمام محکمہ جات میں" اس جملہ میں

"بڑھنے والی" کا لفظ کوئی حد نہیں رکھتا سوائے اس حد کے جو طبعی ہے یعنی جب کہ تعداد پوری ہو جائے۔ پس اس لفظ کے استعمال کرنے کے سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہندوستانیوں کو سب قسم کی ملازمتوں میں متواتر بڑھنے والا حصہ دیا جائے گا یہاں تک کہ سب ملازمتیں ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ جائیں گی۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ ایگزیکٹو (EXECUTIVE) پورے طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ جائیں گی۔

دوسرا قابلِ توجہ جملہ "خود مختار محکموں کے تدریجی نشوونما" کا ہے۔ اس میں "خود مختار محکموں" سے مراد یقیناً میونسپل کمیٹیاں' ڈسٹرکٹس بورڈز اور صوبہ جاتی حکومتیں ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹیاں بھی خود مختار محکمے نہیں کہلا سکتے جب تک کہ صوبہ جاتی حکومتیں ان پر حاکم نہ ہوں اور وہ خود مختار نہ ہوں کیونکہ لوکل بورڈ' بالا حکومت سے آزاد ہو کر کام نہیں کر سکتا۔ اور کوئی میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ خود مختارانہ حکومت کرنے والا نہیں کہلا سکتا جب تک کہ جس حکومت سے اسے احکام ملتے ہوں اس کا قیام اس کے ووٹروں کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ پس میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا خود مختار ہونا صوبہ جاتی حکومت کے خود مختار ہونے پر منحصر ہے۔ اور اس فقرہ میں یقیناً انہی تین حصصِ حکومت کا ذکر ہے۔ پس دوسرے لفظوں میں اس جملہ میں صوبہ جات کی آزادی کا وعدہ ہے۔

تیسرا قابلِ توجہ جملہ وہ ہے جس میں اوپر کی پالیسی کا آخری نتیجہ بیان کیا گیا ہے یعنی "اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ آخر برطانوی ہند میں ایک ایسی خود مختار حکومت بتدریج قائم ہو جائے جو برطانوی شہنشاہی کا جزو ہو۔"

اس جملہ میں بتایا گیا ہے کہ اوپر کی دونوں تجویزوں کی غرض یہ ہے کہ برطانوی ہند میں نیابتی حکومت تو قائم ہو جائے لیکن وہ برطانوی شہنشاہیت کا حصہ رہے باہر نہ نکل جائے۔ اس جملہ کے صاف لفظوں میں معنی یہ ہیں کہ پارلیمنٹ نے اس آخری حد تک ہندوستان کو خود مختار حکومت دینے کا وعدہ کیا تھا کہ اگر اس سے زیادہ حق دیا جائے تو ہندوستان برطانوی ایمپائر (EMPIRE) کا حصہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اور یہی چیز ہے جس کا دوسرا نام "ڈومینین سٹیٹس" (DOMINION STATUS) ہے۔ ڈومینین سٹیٹس اور کامل آزادی میں صرف ایک قدم کا فرق ہے وہ قدم اگر کوئی ڈومینین اٹھائے تو وہ برطانوی ایمپائر کا حصہ نہیں رہتی۔ اور چونکہ اس حد تک پہنچی ہوئی خود مختار حکومت کا ہندوستان سے وعدہ کیا گیا ہے اس لئے یہ کہنا کہ اس

سے ڈومینین سٹیٹس مراد نہیں' درست نہیں۔

اس وعدہ سے صاف ظاہر ہے کہ ایگزیکٹو بھی ہندوستانیوں کو دے دی جائے گی اور صوبہ جات کو بھی پوری آزادی دے دی جائے گی۔ اور اس طرح آزادی دیتے دیتے مرکزی حکومت ہند کو بھی اس آزادی کے مقام پر پہنچا دیا جائے گا کہ تاج برطانیہ سے علیحدگی کے حق کے علاوہ سب اختیارات اسے حاصل ہونگے۔

لیکن اگر ہم اس تفصیل میں نہ بھی پڑیں تو بھی خود مختار حکومت کے معنی ڈومینین سٹیٹس کے ہی ہیں۔ اور اصول آئین کے علماء اس کے یہی معنی کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر میں Doctor C.F.Strong. M.A. P.H.D کی کتاب Modern Political Constitutions کا ایک حوالہ نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک خود مختار نو آبادی وہ ہے جسے نیابتی حکومت حاصل ہو اور جسے نیابتی حکومت کہتے ہیں وہ عملی سیاست میں صرف اس امر کا نام ہے کہ ان نو آبادیوں میں وزارت کو ملکی نمائندوں کے تابع کر دیا جائے جہاں کہ اس سے پہلے وہ برطانوی حکومت کے تابع ہوا کرتی تھی کیونکہ نیابتی حکومت کے صرف یہ معنی نہیں کہ وہ نو آبادی جسے اس قسم کی حکومت حاصل ہو اپنے لئے اپنے فائدے کے مطابق قانون وضع کرنے میں آزاد ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کی وزارت آئندہ پوری طرح اور براہ راست ملک کے منتخب نمائندوں کے ماتحت ہوگی۔ [۱]

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ اصول آئینی کے ماہرین کے نزدیک رسپانسیبل (RESPONSIBLE) گورنمنٹ کے صرف یہ معنی نہیں کہ کسی ملک کو اپنے معاملات کے متعلق قانون سازی کا اختیار کلی طور پر مل جائے بلکہ یہ بھی کہ ایگزیکٹو پوری طرح اور براہ راست ملک کے منتخب نمائندوں کے ماتحت ہو اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی ڈومینین کو اس سے زیادہ اختیار حاصل ہے۔

دوسرا حوالہ مَیں مسٹر وڈرو ولسن سابق پریذیڈنٹ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کا پیش کرتا ہوں۔ جو سلف گورنمنٹ کے متعلق ہے۔ وہ اپنی کتاب Constitutional Government inthe United States. میں لکھتے ہیں:۔

"نیابتی حکومت آئینی طریق حکومت کی آخری منزل ہے۔" [۲]

اور جب کہ انگلستان ہندوستان کو سلف گورنمنٹ دینے کا وعدہ کر چکا ہے جو کہ آئینی ارتقاء کی آخری منزل ہے تو پھر ڈومینین سٹیٹس کی وہ کونسی بات رہ گئی جو اسے اس وعدہ کے مطابق نہیں مل سکتی۔

اوپر کے حوالہ جات سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ انگلستان صاف طور پر ہندوستان کو رسپانسیبل گورنمنٹ یا ڈومینین سٹیٹس دینے کا وعدہ کر چکا ہے اور اب اپنے اعلان سے پیچھے ہٹنا اس کے لئے اخلاقاً بالکل ناجائز ہے اور اسے اس قسم کا مشورہ دینے والے لوگ اس کی عزت کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔

اب میں دوسرے سوال کو لیتا ہوں کہ کیا ہندوستان سیاسی طور پر آزادی کا مستحق ہے؟

میرے نزدیک اس سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے۔ سیاسی استحقاق دو طرح حاصل ہوتے ہیں۔ یا خدمت سے یا قابلیت سے۔ ہندوستان نے جنگ عظیم کے موقع پر انسانی آزادی کے قیام کے لئے ایک بے نظیر قربانی کر کے اپنے اس حق کو ثابت کر دیا ہے۔ جنگ کے دوران میں برطانیہ کے وزراء بار بار ہندوستانیوں سے اپیل کرتے تھے کہ دُوَلِ متّحدہ دنیا کی آزادی کو برباد کرنا چاہتی ہیں اور انہیں اس بُرے ارادہ سے روکنے کے لئے ہندوستان کو انگلستان کی مدد کے لئے کھڑا ہو جانا چاہئے۔ ہر اک شخص جانتا ہے کہ ہندوستان نے اس آواز کا جواب کس شاندار طور پر دیا۔ دس بارہ لاکھ آدمی کا مہیا کر دینا معمولی بات نہیں خصوصاً جب کہ ہندوستان کو اس جنگ سے کوئی ذاتی سرور کار نہ تھا۔ ایک محکوم قوم کو انتخاب کے لئے کوئی وسیع میدان حاصل نہیں ہوتا وہ ایک محکومی اور دوسری مملوکی میں چنداں فرق نہیں کرتی پس عام ہندوستانی اس امر کے سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا کہ انگریزی غلبہ اور جرمن غلبہ میں کچھ فرق ہے اس کے لئے یہ دونوں باتیں برابر تھیں۔ مگر پھر بھی پرانے تعلقات کو گو وہ محکومی کے تعلقات تھے اس نے محبت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے توڑنے کو پسند نہ کیا اور اپنا سب کچھ حکومت کے قدموں پر لا کر نثار کر دیا۔ اس قربانی کو آج کی اطمینان کی حالت کے اثر کے نیچے نہ دیکھو ان حالات کو سامنے لا کر دیکھو جب ہر وقت ڈوور[؎] کی بندرگاہ کی طرف انگلستان کی نگاہ لگی رہتی تھی اور جب انگلستان کی بہادر عورتیں ہر رات اس خوف میں سوتی تھیں کہ یہ رات ان مُحبّانِ وطن کے لئے جو فرانس کے میدان میں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے بے حفاظت کُھلے میدان میں پڑے ہیں کیا پیغام لاتی ہے؟ جب ہر صبح شادی شدہ عورتیں دھڑکتے ہوئے دلوں

کے ساتھ اٹھتی تھیں اور پہلا خیال ان کے دلوں میں یہ ہوتا تھا کہ کیا اب بھی وہ سہاگ کی حالت میں ہیں یا بیوہ ہو چکی ہیں۔ جب حیران و ششدر بچے اپنی ماؤں کا منہ تکا کرتے تھے کہ کس مصیبت نے ان کے چہروں کو زرد اور ان کی آنکھوں کو بے کیف کر رکھا ہے اور حیران ہوتے تھے کہ ان کے والد کو کیا ہو گیا ہے کہ واپس ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جب مائیں اپنے بچوں کو حسرت و اندوہ سے تھپکی دیا کرتی تھیں جنہوں نے کبھی اپنے باپ کا منہ نہ دیکھا تھا اور نہ آئندہ دیکھنے کی امید تھی۔ جب اربابِ حلّ و عقد جمع ہوتے تھے تو ان کا پہلا سوال یہ ہوتا تھا کہ اب آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ جب انگلستان کی آزاد روح جس نے سات سَو سال کی متواتر جدوجہد کے بعد حقیقی آزادی حاصل کی تھی اپنی سب سے عزیز چیز کو ہاتھوں سے جاتا ہوا دیکھتی تھی۔ ہاں جس وقت ایک مسکراہٹ خدمت اور ایک کلمۂ تعریف وفاداری کہلاتا تھا۔ اس ماحول کو اپنے ذہن میں دوبارہ پیدا کر کے' ان خطرات کو سامنے لا کر' ان امیدوں کو جگا کر' ان بے کسیوں کی یاد کو تازہ کر کے پھر سوچو کہ محکوم ہندوستان جس پر اس جنگ کا کوئی بھی اثر نہیں تھا اس نے کس بہادری اور کس دلیری سے اس نازک موقع پر انگلستان کی مدد کی۔ جانے دو احمدیہ جماعت کو کہ وہ خوشامد پسند اور فطرتی وفادار مشہور ہے۔ گاندھی جی کو دیکھو کہ وہ پیدائشی عدم تعاون کرنے والا شخص بھی اس وقت انگلستان کے لئے ریکروٹ مہیا کرنے کی خدمت میں لگا ہوا تھا اور ہندوستان کی جنگی قومیں اپنے جگر گوشے نکال نکال کر انگلستان کی آزادی کے قیام کے لئے دے رہی تھیں۔ اب جب کہ وہ خطرہ گزر گیا ہے بعض انگریز کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہندوستانیوں نے روپیہ کے لئے کیا۔ لیکن کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ کیا انگریز فاقے کر کے لڑا کرتے تھے اور حکومت کا کوئی خرچ نہیں کرایا کرتے تھے؟ جو لڑے گا وہ کچھ خرچ بھی کرائے گا۔ باقی جان روپیہ سے نہیں خریدی جاتی۔ ہاں چند اپنی زندگی سے مایوس ہو کر روپیہ کی خاطر جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن ملکوں کے ملک کبھی روپیہ کے لئے اپنی جان بیچنے کو تیار نہیں ہوا کرتے۔ اور اگر تنخواہ لالچ کو ظاہر کرتی ہے تو اختلافی ہوں یا اتحادی ان کے سب آدمی لالچ ہی سے کام کیا کرتے تھے۔

ہندوستان نے کس جوش سے اس موقع پر انگلستان کا ساتھ دیا۔ اس کا جواب میں اپنے دوست سر مائیکل اوڈوائر (SIR MICHAEL O'DWYER) کے الفاظ میں دیتا ہوں۔ جو اُس وقت پنجاب کے جو در حقیقت ہندوستان کا ایک ہی جنگی صوبہ ہے لفٹیننٹ گورنر تھے۔

"وہ شاندار جواب جو پنجاب نے برطانوی ایمپائر کی آواز کا دیا اور بھی زیادہ شاندار نظر آتا ہے جب ہم اس امر کو دیکھتے ہیں کہ پچھلی جنگوں کے مواقع پر عموماً اور دوسری افغانی جنگ کے موقع پر خصوصاً یہ ثابت ہو گیا تھا کہ جنگ کے موقع پر کسی بڑی تعداد میں ریکروٹ بھرتی کرنا خواہ ہندوستان کی سرحد پر ہی جنگ کیوں نہ ہو بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پنجاب کی نصف سے زیادہ آبادی مسلمان ہے اور جن لوگوں کو دیہاتی مسلمانوں کا صرف سطحی علم تھا وہ خیال کرتے تھے کہ ایسی جنگ کے لئے جو ترکوں کے خلاف تھی اور جو مصر، فلسطین اور عراق جیسے اسلامی ممالک میں جہاں کہ اسلامی مقدس مقامات ہیں لڑی جا رہی تھی مسلمان بھرتی نہیں ہوں گے۔........ لیکن یہ سب مایوسانہ خیالات باطل ثابت ہوئے۔ جنگ کی ابتداء میں صرف ایک لاکھ پنجابی سپاہی تھا لیکن جنگ کے خاتمہ تک پانچ لاکھ آدمی فوجی خدمت کر چکا تھا۔ دورانِ جنگ میں اندازاً تین لاکھ ساٹھ ہزار سپاہی بھرتی ہوا تھا۔ جو کہ کل ہندوستان کی بھرتی کے نصف سے بھی زائد تھا اور ان میں سے نصف پنجاب کے مسلمان تھے جو اس علم کے ساتھ بھرتی ہو رہے تھے کہ وہ ترکوں کے خلاف جنگ کرنے جا رہے ہیں اور جن میں سے شاذو نادر کے سوا باقی سب باوجود سخت کوشش کے جو انہیں غدار بنانے کے لئے کی گئی حکومت کے وفادار رہے۔"[4]

آگے صفحہ ۲۱۹ پر وہ پنجابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"انہوں نے شروع جنگ سے ہی بغیر کسی جبر کے دلی شوق سے ہماری آواز پر شاندار طریق سے لبیک کہا۔"[5]

یہ اس شخص کی گواہی ہے جس نے میرے نزدیک انگلستان کے بچانے میں غالباً لارڈ **کچنر** (LORD KITCHENER) اور مسٹر لائڈ جارج (LOYD GEORGE) کے بعد سب سے زیادہ کام کیا تھا اور جس کی خدمات کا میرے نزدیک سوواں حصہ بھی اعتراف نہیں ہوا اور یہ اس ملک کی قربانی ہے جسے اس جنگ سے کسی حقیقی نقصان کا خطرہ نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ خدمات پنجاب کی ہیں لیکن ہم پنجابی اپنے آپ کو باقی ہندوستان سے جُدا نہیں سمجھتے۔ ہمارا صوبہ جنگی اقوام کا وطن ہے اس لئے اس نے لڑنے والی فوج دی۔ دوسرے

صوبوں کی آبادی کے اخلاق اور ہیں انہوں نے مزدور اور روپیہ دیا ہر ایک سے جو کچھ ہو سکا اس نے دیا اور دل کھول کر دیا۔

لیکن یہ بھی درست نہیں کہ باقی ملک نے لڑنے والے فوجی نہیں دیئے۔ سر اوڈوائر (SIR O'DWYER) تحریر کرتے ہیں کہ:۔

> "گورنمنٹ آف انڈیا نے خود اس طرف توجہ نہیں کی چنانچہ جب اپریل ۱۹۱۸ء میں حضور ملک معظّم نے اپیل کی تو اس پر سب صوبہ جات میں بیداری پیدا ہوئی اور جنگ کے آخری چھ ماہ میں باقی ہندوستان نے ایک لاکھ تراسی ہزار فوجی ریکروٹ دیئے"۔[۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے بعد ملک میں بے چینی پیدا ہوئی لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوستان کے احساسات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ٹرکی جس کے فتح کرنے میں مسلمانوں کا بہت سا دخل تھا اس کے ساتھ مسلمانوں کے احساسات کو کچلتے ہوئے سب سے بُرا سلوک کیا گیا اور بعض انگریز ہندوستان کی خدمات کو یہ کہہ کر حقیر ثابت کرنے لگے کہ یہ سب کچھ روپیہ کی خاطر کیا گیا تھا۔

غرض اس جنگ کے موقع پر جسے جنگ آزادی کہا جاتا ہے ہندوستان نے اپنی خدمات کے ذریعہ سے اپنے آپ کو مہذب دنیا میں برابری کے ساتھ شریک ہونے کا اہل ثابت کر دیا اور اس لحاظ سے وہ آزادی کا مستحق ہے۔ سوال کے پہلے حصہ کو حل کرنے کے بعد اب میں اس کا دوسرا پہلو لیتا ہوں۔

کیا ہندوستان قابلیت کے لحاظ سے آزادی کا مستحق ہے؟

جہاں تک میں نے اس سوال پر غور کیا ہے میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ کوئی ملک بھی ایسا ممکن ہے جو آزادی کا مستحق نہ ہو۔ اگر کسی ملک کی تعلیم کم ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ جیسا وہ ملک ہے ویسے ہی اس کے حاکم ہوں گے۔ یہ سوال تبھی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ بقائے انسب کے اصول کو پورے طور پر صحیح تسلیم کر لیا جائے لیکن جمہوریت کا اصول تو بقائے انسب کے اصول کے بالکل بر خلاف ہے جسے اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر سوائے چند پروفیسروں اور فلاسفروں کے کسی کو بھی ملک کی حکومت میں دخل نہیں حاصل ہونا چاہئے۔

علاوہ ازیں قابلیت خود ایک مبہم لفظ ہے۔ اس کے معنی نہ کتابی علم کے ہیں اور نہ مختلف زبانیں جاننے کے۔ ایک شخص یا ایک قوم باوجود بالکل اَن پڑھ ہونے کے حکومت کے قابل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ لارڈ برائس جو آئینِ اَساسی کے سب سے بڑے ماہر گزرے ہیں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس کی مثالیں مل سکتی ہیں کہ عوام الناس نے بعض ملکوں میں اسی طرح اپنے رائے دہندگی کے حق کو خوبی سے ادا کیا ہے جس طرح کہ ان لوگوں نے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔" ےہ

نیز تاریخ سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ ایسے ممالک جن میں تعلیم کم تھی ان میں اپنے ملک کے مناسب حال رسپانسیبل گورنمنٹ جاری تھی۔ پس محض اس وجہ سے کہ ہندوستان کے لوگ اس قدر تعلیم یافتہ نہیں ہیں جس قدر کہ اس زمانہ میں یورپ کے لوگ ہیں ہندوستان کو آزادی کے قابل نہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ ہندوستانی گو دوسرے ملکوں کے لوگوں پر حکومت کرنے کے قابل نہ ہوں لیکن وہ اپنے ملک پر حکومت کرنے کے ضرور قابل ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر ان عارضی حالات کو نظرانداز کر دیا جائے جن کے ماتحت ایک قوم دوسری قوم کے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے تو حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ جب تک سب اقوام انسانیت کے دائرے کے اندر محدود رہتی ہیں پیدا ہو سکتی ہے کہ جو دوسری اقوام پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کرنے کے قابل ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اصول سیاست کے مطابق قابلیت صرف حکومت کرنے کی خواہش کا نام ہے۔ یہی سب سے اہم امر ہے جسے ہمیں مدنظر رکھنا چاہئے اور جب کسی ملک میں یہ خواہش زور کے ساتھ پیدا ہو جائے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس قوم کو آزادی دے دینی چاہئے۔ کیونکہ تعلیم سے بھی زیادہ یہ خواہش اہمیت رکھتی ہے۔ لارڈ برائس کی یہ تحریر صداقت سے پُر ہے کہ:۔

"یہ بات جو کہی جاتی ہے بالکل سچی ہے کہ علم اور تجربہ اور نیز ذہانت کسی قوم کو آزاد حکومت کا مستحق بنانے کے لئے نہایت ضروری امور ہیں۔ لیکن تجربہ نہ ہونے سے بھی زیادہ خطرناک نقص جو اس مقصد کے حصول کی راہ میں ہوتا ہے وہ افرادِ قوم میں آزادی کی خواہش کا موجود نہ ہونا ہے۔" ۸ہ

یہ بالکل سچ ہے کہ سلف گورنمنٹ (SELF GOVERNMENT) بغیر عوام الناس میں

خواہش آزادی کے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اور یہ امر بھی ویسا ہی صحیح ہے کہ جب یہ خواہش کسی ملک کے باشندوں میں پیدا ہو جائے تو ان کو آزادی سے محروم رکھنا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

ہندوستان کے گزشتہ واقعات سے یہ امر روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ ہندوستان میں اب یہ عام خواہش ہے کہ اسے آزادی حاصل ہو جائے۔ یہ تغیر اس قدر جلد ہوا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ آج سے بارہ تیرہ سال پہلے میں تجربہ کی بناء پر کہا کرتا تھا کہ یہ خواہش صرف چند تعلیم یافتہ لوگوں میں ہے اور باقی لوگ اس سے ناآشنا ہیں۔ آج میں اپنے تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ اب یہ خواہش عوام الناس میں بھی پیدا ہو گئی ہے۔ بوجہ ایک مذہبی راہنما ہونے کے مجھے کثرت سے گاؤں کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ ان گوشوں میں جہاں تعلیم کا نام و نشان نہیں زمیندار شوق سے اس دن کے آنے کے متعلق گفتگو کر رہا ہوتا ہے کہ ہندوستان کو کب آزادی ملے گی؟

میں اس سوال کو بالکل اَن پڑھ زمینداروں کے منہ سے سن کر محو حیرت ہو جاتا ہوں کہ "کیا انگریز اب ہمارے ملک کو کچھ دیں گے بھی یا نہیں؟" اس سوال کا کروڑوں انسانوں کے دلوں میں اس قدر جلد پیدا ہو جانے کا احتمال آج سے بارہ سال پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا بڑا باعث جنگ عظیم ہے۔ ان دنوں میں برطانیہ نے ہندوستان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بڑی کثرت سے ملک میں اپنی مظلومیت اور جرمنوں کے ہاتھوں مختلف ممالک کی آزادی کے تباہ ہو جانے کا پروپیگنڈا کیا تھا۔ اس پروپیگنڈا نے بعض ایسے اصول سے ہندوستانیوں کو واقف کر دیا جنہیں خود اُن کے لیڈر ان کے کانوں میں نہیں ڈال سکے تھے۔ بے شک یہ امر ایک بہت بڑا دخل اس تغیر میں رکھتا ہے لیکن کونسا تغیر دنیا کا بلاوجہ ہوا کرتا ہے۔ ایک وجہ اس تغیر کی یہ بھی ہے کہ ہندوستانیوں کو کانگریس نے ان کے بعض حقوق کے تلف ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے بدلنے سے ان کے وہ حقوق انہیں مل جائیں گے اور ان کے بوجھ کم ہو جائیں گے۔

زمینداروں کی حالت پنجاب میں پچھلے چار سال سے بہت خراب ہے۔ فصلوں کی متواتر تباہی اور اس سال غلہ کا نرخ گر جانے کے سبب سے زمینداروں کی کمر بالکل ٹوٹ گئی ہے۔ انہیں یقین دلایا گیا ہے کہ حکومت کے تغیر سے ان کی یہ مشکلات دور ہو جائیں گی اور اس کی

وجہ سے وہ حکومت کے تغیر کے خواہاں ہو رہے ہیں گو ان میں سے ایک حصہ ابھی اس قدر دلیر نہیں کہ حکام کے سامنے بھی یہ بات کہے، لیکن اپنی مجالس میں وہ یہ باتیں ضرور کہتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ خواہش عارضی اسباب کی وجہ سے ہے لیکن یہ دلیل اس خواہش کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتی۔ بالکل ممکن ہے کہ سلف گورنمنٹ میں ان مشکلات کا علاج نہ ہو سکے لیکن لوگ مشکلات میں یہ نہیں دیکھا کرتے کہ دوسری تدبیر کامیاب ہو گی یا نہیں۔ وہ صرف یہ دیکھا کرتے ہیں کہ موجودہ تدبیر ہماری مشکلات کو دور نہیں کر سکی اور وہ اسے توڑ کر کوئی اور تدبیر جو خواہ کتنی ہی خلاف عقل کیوں نہ ہو اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جایا کرتے ہیں۔ جس وقت انگلستان میں تحریک آزادی پیدا ہوئی ہے اس وقت بھی عارضی تکالیف ہی اس کی موجب تھیں۔ میگنا چارٹا (MAGNA CHARTA) کا باعث اہالئی انگلستان کا آئین سیاست کا مطالعہ نہ تھا بلکہ کنگ جان (KING JOHN) کے حقیقی یا خیالی مظالم سے بچنے کی خاطر انہوں نے میگنا چارٹا حاصل کیا تھا۔ پس میگنا چارٹا آئینِ اَساسی کے احساس سے پیدا نہیں ہوا بلکہ آئینِ اَساسی میگنا چارٹا کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

غرض یہ دلائل اقوام کے تغیر میں کام نہیں آتے اور نہیں آسکتے۔ آزادی کے سیاسی استحقاق کے لئے جس امر کو دیکھنا چاہئے وہ صرف ایک عام خواہش ہے اور وہ اس وقت ہندوستان میں پیدا ہو چکی ہے۔ اگر ہندوستان میں اس سوال کے متعلق عام رائے لی جائے تو جو لوگ اس صورت حالات کو تسلیم نہیں کرتے ان کی آنکھیں کُھل جائیں گی۔ اور میرے نزدیک تو کانگریس کے بائیکاٹ کی تحریک نے بھی ایک حد تک ثابت کر دیا ہے کہ ملک میں ایک عام خواہش حصول آزادی کی پیدا ہو چکی ہے۔ اور جب یہ خواہش پیدا ہو چکی ہے تو انگلستان کا دیانتدارانہ فرض ہے کہ وہ اب اس سوال کو مناسب طریق پر حل کرے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اس نئے تجربے میں نقصان ہونگے۔ بے شک ہوں گے لیکن بقول لارڈ برائس:۔

"غلطیاں ہونگی اور نقصان یقیناً اٹھانا پڑے گا لیکن جب تک کسی قوم کو اس کا کوئی مضبوط ہمسایہ غلام نہیں بنا لیتا یا اپنے اندر جذب نہیں کر لیتا' ناکامیاں شاذونادر ہی ناقابلِ اصلاح ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خود مختار حکومت کی برکات میں سے یہ ایک برکت ہے کہ نقصان سے علم پیدا ہوتا ہے اور علم سے دانائی پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف غیر حکومت خواہ کس قدر ہی خیر خواہ کیوں نہ ہو

اس کے ماتحت لوگوں کا علم اول تو بڑھتا نہیں اور اگر بڑھتا ہے تو نہایت ہی ست رفتار سے۔"[۹]

انگلستان کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس خواہش کے پیدا کرنے میں خود اس کا بھی بہت کچھ حصہ ہے اور دوسرے لوگ اس کی اس کوشش کی قدر کریں یا نہ کریں میں اس کی کوشش کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے لوگ اس کے ممنون ہوں۔ بہرحال جب کہ انگلستان نے یہ خواہش ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا کی ہے پھر ۱۹۱۹ء کے انڈیا ایکٹ کے ذریعہ اس خواہش کو اور بھی تیز کر دیا ہے تو وہ اب کسی صورت میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اسے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو اس کے سب سے بڑے آئین اساسی کے ماہر نے جس کے کئی حوالے میں پہلے نقل کر چکا ہوں کہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"قوموں پر ایسے وقت آیا کرتے ہیں کہ جب آگے بڑھنا کھڑے ہونے سے بہرحال بہتر ہوتا ہے جب کہ اختیارات دینا زیادہ دانشمندی کے مطابق ہوتا ہے۔ خواہ ان کے غلط استعمال کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ بہ نسبت اس کے کہ اختیارات کو روک کر بے چینی پیدا کی جائے۔"[۱۰]

میں انگلستان کا ایک خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے جس نے بمعہ اپنی جماعت کے ہر فتنہ اور فساد کے موقع پر قیام امن کی اہم خدمات انجام دی ہیں اور جو اس وقت بھی بائیکاٹ وغیرہ کا مقابلہ کر رہا ہے' اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ وقت آگیا ہے اور اب اسے وہ تجربہ کرنے دینا چاہئے جس کے لئے وہ فی الحقیقت بے تاب ہو رہا ہے۔ اگر وہ وقت نہ آچکا ہوتا تو کانگریس کی خلافِ اخلاق اور خلافِ عقل تجاویز کبھی بھی ملک میں کامیاب نہ ہوتیں۔ ان کی وسیع کامیابی بتا رہی ہے کہ ملک کے ایک کافی حصہ کی دماغی کیفیت ہندوستان کی آزادی کے سوال کے متعلق اپنا توازن کھو چکی ہے۔

کیا ہندو مسلم اختلاف کی موجودگی میں ہندوستان کو آزادی دی جا سکتی ہے؟

جب کبھی ہندوستان کی آزادی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ یہ سوال اٹھا دیا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مختلف اقوام میں اس قدر اختلاف ہے کہ انہیں حکومت دینا گویا انہیں تباہ کرنا ہے لیکن بعض لوگ اس کے مقابلہ میں یہ کہا کرتے ہیں کہ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں

کو خود لڑواتی ہے تاکہ کبھی بھی ہندوستان آزاد نہ ہو سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں شدید اختلاف ہے۔ ایسا شدید کہ ہر بہی خواہِ ملک اسے دیکھ کر تکلیف محسوس کرتا ہے۔ میں جب کبھی اس اختلاف پر غور کرتا ہوں تو میرا دل حسرت واندوہ سے بھر جاتا ہے لیکن حسرت واقعات کو نہیں بدل سکتی۔ مگر یہ امر بھی درست نہیں کہ اس کا موجب انگریز ہیں اور یہ کہ وہ جان بوجھ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑواتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزوں میں کوئی بُرا نہیں۔ ان میں بھی اسی طرح بُرے لوگ ہیں جس طرح ہندوستانیوں میں ہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ہندو مسلمان کو لڑواتے بھی ہوں جس طرح کہ بعض ہندوستانی اپنے بھائیوں کو لڑواتے ہیں۔ لیکن میں ایک منٹ کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی قوم جو دانائی اور انسانی ہمدردی میں ایک قابل تقلید نمونہ دکھا رہی ہو اخلاق میں اس قدر گر گئی ہو کہ اس کے تمام افراد یا اکثر افراد دو قوموں میں لڑائی کروا کے تماشہ دیکھتے ہوں۔ اگر ہندوستان کے کسی ایک مقام پر ہندو مسلمان میں فساد ہوتا تو میں سمجھتا کہ کسی انگریز افسر کی کارروائی ہے۔ پھر اگر صرف ان علاقوں میں فساد ہوتا جو براہ راست انگریزوں کے ماتحت ہوتے ہیں تو میں ایسا سمجھ لیتا لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں فساد ہندوستانی افسروں کے ماتحت بھی ہوتا ہے بلکہ شاید زیادہ ہوتا ہے۔ اور ریاستوں میں بھی ہوتا ہے جن میں انگریزوں کی سیاست براہ راست کام نہیں کر رہی ہوتی۔ پھر باوجود ان حقائق کے انگریزوں پر فسادات کا الزام لگانا کسی طرح شرافت نہیں کہلا سکتا اور میرے نزدیک اس قسم کا الزام لگانے والے صرف اپنی گندی فطرت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر یہ فساد انگریز کروا رہے ہیں تو وہ فسادات اور مظالم جو سکھوں کی طرف سے مسلمانوں پر سکھ حکومت کے زمانہ میں ہوتے تھے یا وہ خانہ جنگیاں جو سیواجی نے اورنگ زیب کے زمانہ میں کیں اور وہ قتل عام جو اس کے ہاتھوں مسلمانوں کا ہوا اس کا ذمہ وار کون تھا؟ جب انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔ اور جب اسلامی حکومت کے تنزل کے زمانہ سے ہی ہندو مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنے کی فکر میں لگ گئے تھے تو اس الزام کو انگریزوں پر عائد کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

یہ میں تسلیم کر لوں گا کہ جس طرح ہمارے مختلف میلان ہوتے ہیں انگریزوں کے بھی مختلف میلان ہوتے ہیں۔ جو انگریز شروع ملازمت میں ایسے علاقہ میں لگتا ہے کہ جس میں

مسلمان مضبوط اور کام کرنے والے ہوں وہ مسلمانوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور جو ہندوؤں کے علاقہ میں مقرر ہوتا ہے وہ زیادہ تر ہندوؤں کی طرف مائل ہو جاتا ہے مگر یہ ایک ایسا طبعی امر ہے کہ جس سے کوئی قوم بچ نہیں سکتی۔ انسانی مدنی الطبع ہے اور جن لوگوں سے اسے زیادہ ملنے کا موقع ملتا ہے وہ ان کی طرف طبعاً زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بحیثیت قوم انگریزوں پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا اور یہ کوئی قصور نہیں۔ اور اگر ہے تو اس کا فائدہ زیادہ تر اس الزام کے لگانے والے یعنی ہندو ہی اٹھاتے ہیں کیونکہ انہی کی اس ملک میں کثرت ہے۔ اسی وجہ سے انگریز زیادہ تر انہی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان فسادات کا اصل موجب ہندو دماغ کی بناوٹ ہے۔ ہندو بوجہ چُھوت چھات اور قومی برتری کے خیال کے دوسری اقوام سے مل کر کام کر ہی نہیں سکتا سوائے اس کے کہ اسے یہ یقین ہو کہ یہ قوم مجھ پر برتری نہیں حاصل کر سکتی۔ یہ خیالات اسے ورثہ میں ملے ہیں اور ان کے دور کرنے کے لئے محنت درکار ہے جس کے لئے افسوس ہے کہ ہندو لیڈر بوجہ غالباً اس سے زیادہ اہم امور یعنی ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنے کی طرف توجہ دینے کے ابھی فُرصت نہیں نکال سکے لیکن اپنے قصور کو دوسری قوم پر تھوپنا ایک صریح ظلم ہے۔ بہرحال میں اس سوال کے متعلق آگے چل کر تفصیل کے ساتھ لکھوں گا سردست میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اختلافات ضرور موجود ہیں اور نہایت خطرناک صورت میں۔ اور ان کی ذمہ واری انگریزوں پر نہیں بلکہ ہندوؤں پر ہے لیکن باوجود اس کے ہندوستان کو آزادی سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلافات کی موجودگی میں رسپانسیبل گورنمنٹ (RESPONSIBLE GOVERNMENT) کے راستہ میں سخت روک ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رسپانسیبل گورنمنٹ کے بغیر اس قسم کے اختلافات مٹ بھی نہیں سکتے۔ ہندوؤں میں اختلاف پیدا کرنے کا مادہ اس لئے ہے کہ وہ ہزار سال سے حکومت کے مفہوم سے ناواقف ہیں۔ جب کہ انگریز اس وقت حکومت کر رہے ہیں اور مسلمان ابھی قریب کے زمانہ میں حکومت کر چکے ہیں اور اب بھی ان کے بھائی بند آزاد ممالک میں حکومت کر رہے ہیں۔ پس وہ جانتے ہیں کہ ترقی جس قدر ایک ملک کے باشندوں میں صلح سے حاصل ہو سکتی ہے جنگ سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہندو بوجہ ایک عرصہ سے حکومت سے محروم ہونے کے خیال

کرتے ہیں کہ جب تک دوسروں کو پیس نہ دیا جائے ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ وہ کامیابی کی وسیع راہوں سے بے خبر ہیں اور غالباً اس میں چُھوت چھات اور قومی تفریق کا بھی بہت کچھ دخل ہے مگر اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہندوستان میں رسپانسیبل گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے تاکہ ہندوستان کے باشندوں کو تجربہ سے صلح و آشتی کے فوائد معلوم ہوں اور ان کے اخلاق کی اصلاح ہو۔ اگر اس علاج کو اختیار نہ کیا گیا تو کبھی بھی یہ نقص دور نہ ہو گا اور کبھی بھی ہندوستان آزادی کا مستحق نہ بنے گا۔

پس ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ کس طرح آئندہ نظام حکومت میں اس فساد کے امکانات کو کم کیا جائے نہ یہ کہ اس اختلاف کی موجودگی میں ہندوستان کو آزاد حکومت دی ہی نہ جائے۔

اگر ہندوستان آزادی کا مستحق ہے تو کس حد تک؟

سوال کے اس حصہ کا جواب دینے کے بعد کہ کیا ہندوستان آزادی کا مستحق ہے؟ میں سوال کے اس حصہ کو لیتا ہوں کہ اگر ہے تو کس حد تک؟

بعض لوگ اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہندوستان پوری آزادی کا مستحق ہے بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو برطانیہ سے الگ ہو کر اپنی حکومت قائم کرنی چاہئے۔ گو کانگریس کے نمائندے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں نہیں لیکن چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کے نمائندوں میں ایسے شامل ہوں جو کانگریس کے اس مطالبہ کو پیش کر دیں اس لئے میں انہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ان کا یہ فعل نہ صرف ہندوستان سے دشمنی کا موجب ہو گا بلکہ دنیا سے دشمنی کا موجب ہو گا۔

انگلستان پر آپ خواہ کتنے الزام لگا لیں۔ انگلستان نے ڈومینین سٹیٹس (DOMINION STATUS) کی ایجاد سے دنیا کے اتحاد کی جو راہ کھول دی ہے وہ میرے نزدیک ایک الٰہی اشارہ ہے جو آئندہ طریق عمل کی طرف ہماری راہنمائی کر رہا ہے۔ ہم قوموں اور ملکوں کے سوال میں اس قدر پھنس گئے ہیں کہ ہمارے ذہن سے یہ امر بالکل اُتر گیا ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں اور جس طرح ایک باپ کی اولاد الگ الگ جائیداد رکھنے کے باوجود پھر ایک ہی رشتہ میں

منسلک ہوتی ہے ہم بھی باوجود الگ الگ ملکوں میں بسنے کے پھر ایک ہی وجود کی طرح ہوں اور نہ تو ملکوں کا اختلاف اور نہ قوموں کا اختلاف ہمارے ان برادرانہ تعلقات کو نقصان پہنچا سکے جو ہمارے پیدا کرنے والے نے ہم میں قائم کئے ہیں۔ بے شک لوگ مجھے مذہبی دیوانہ کہہ لیں لیکن میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے کہ وہ دنیا کو ایک مقام پر جمع کر دے بعد اس کے کہ وہ پراگندہ ہو رہی تھی اور یہ اس کا ارادہ آثار سے ظاہر ہے۔ میل جول کے سامان نئے سے نئے پیدا ہو رہے ہیں' قومیں آپس میں مل رہی ہیں' اتحادِ اُمم کی خواہش ہی نہیں پیدا ہو رہی بلکہ دنیا ایسی مشکلات میں سے گذر رہی ہے کہ کسی نہ کسی قسم کے اتحاد کے لئے وہ مجبور ہو رہی ہے۔ ان تدابیر میں سے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کو متحد کرنے کیلئے کی جا رہی ہیں ایک لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) بھی ہے اور دوسرے برطانوی حکومت کا موجودہ ڈھانچہ ہے جو میرے نزدیک ابتدائی تدابیر میں سے سب سے مکمل صورت میں ہے اس کے ذریعہ سے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ملک ایک خیالی زنجیر میں بندھے ہوئے اور ایک رشتہ میں منسلک نظر آتے ہیں۔ کوئی طاقت اور کوئی فوج اس اتحاد کا موجب نہیں' کوئی جبر اسے قائم نہیں رکھے ہوئے' ایک دلی ارادہ اور ایک دلی خواہش یہ سب کچھ کرا رہی ہے۔ ہر حصہ اپنے ملک میں آزاد ہے ویسا ہی آزاد جیسے کہ وہ ملک جو اس سلطنت سے باہر ہیں مگر پھر سب مل کر ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں' ایک دوسرے کی مشکلات میں ہمدردی کرتے ہیں' ایک کُل کا اپنے آپ کو جزو سمجھتے ہیں۔ کوئی اسے خیالی دنیا کہے یا قوتِ واہمہ کا حد سے بڑھ جانا خیال کرے میں تو اس سسٹم کو دنیا کے آئندہ اتحاد کے لئے بطور بیج کے خیال کرتا ہوں اور دنیا کے اتحاد کے خواب کی تعبیر سمجھتا ہوں۔ اگر ہندوستان اس سلسلہ کو اپنی شمولیت سے مضبوط کر دے تو یقیناً وہ اتحادِ عالَم کی ایک شاندار خدمت کرے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے مخفی اسباب پیدا کر کے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کے نقائص دور ہو کر ایک دن یہ ایسا مکمل ہو جائے گا کہ جو تھوڑا بہت شائبہ انگلستان کی برتری کا ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔ اور اس وقت اس کی خوبیوں سے متأثر ہو کر کئی آزاد کہلانے والے ممالک بھی جب ان کے باشندوں کے دلوں سے قومیت کی تنگ دلی کم ہو جائے گی اس میں شمولیت کے خواہشمند ہو جائیں گے۔ اور غالباً اللہ تعالیٰ کی مشیت جو دنیا سے جنگ کو ایک وقت تک مٹا دینے کے متعلق ہے اسی صورت میں پوری ہوگی اور امن ایک

مستحکم بنیاد پر قائم ہو جائے گا۔ اُس وقت بہت سے ممالک جن میں انگلستان بھی ایک فرد ہو گا صرف ایک مرکزی نقطہ سے وابستگی پیدا کر کے ایک آزاد نظام کے حصے ہو جائیں گے اور یا تو ان کے باہم اتّصال کے لئے کوئی ایسی وزارت قائم کی جائے گی جو براہ راست کسی ملک کے نظام سے تعلق نہ رکھتی ہو گی اور یا پھر تمام ممالک جو اس نظام کا حصہ ہونگے ان کے وزراء باری باری اس خدمت کو انجام دیں گے اور مساوات اپنی پوری صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔ یہ محض وہم کی پرواز نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل دنیا کو اس طرف لے جا رہا ہے اور محبت کی بنیاد پر اتحادِ اُمَم کی ہر سکیم اس کے کسی نظام کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔

پس جب کہ دنیا کے تغیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو ملکیت اور قومیت کی قیدوں سے آزاد کرانے اور ایک پائیدار اتحاد میں جکڑنے کے سامان پیدا ہو رہے ہیں تو کیا یہ ہماری بے وقوفی نہ ہو گی کہ ہم جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس راہ کے اختیار کرنے کی طاقت دی ہے اس موقع کو گنوا دیں اور بجائے دنیا میں اتحاد پیدا کرنے کے شقاق کی راہ کھولیں اور بجائے جوڑنے کے توڑنے لگیں۔ بے شک انسان کو خدا تعالیٰ نے بہت کچھ طاقتیں دی ہیں لیکن جو قوم اس رَو کی خلاف ورزی کر رہی ہوتی ہے جسے خدا تعالیٰ چلاتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور حوادث کے ساحل پر اس کے جہاز ٹکرا ٹکرا کر غرق ہو جاتے ہیں۔

پس میں سب نمائندوں سے اور اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے جوشوں پر قابو پاتے ہوئے انگلستان سے علیحدگی کے خیال کو دل سے نکال دیں کہ اس طرح وہ اپنے ملک کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے لیکن دنیا سے دشمنی کے مرتکب ضرور ہو جائیں گے۔

الغرض انگلستان سے علیحدہ ہونے کا خیال نہ صرف امکان کے خلاف ہے بلکہ قانونِ قدرت کے منشاء کے بھی خلاف ہے پس اسے ہمیں بالکل نظرانداز کر دینا چاہئے اور اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ انگلستان سے تعلق رکھتے ہوئے ہندوستان کس حد تک آزادی کا مستحق ہے؟

اگر اس سوال کا تعلق موجودہ زمانہ سے نہ ہو بلکہ آئندہ زمانہ سے ہو تو میں جواب دوں گا کہ ہندوستان ویسی ہی آزادی کا مستحق ہے جیسی آزادی کہ دوسری آزاد نو آبادیوں کو حاصل ہے اور جسے ڈومینین سٹیٹس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس سوال کا تعلق موجودہ

زمانہ سے ہو تو میں ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر کہوں گا کہ ہندوستان ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس وقت کامل آزادی مل جائے فوراً ڈومینین سٹیٹس مل جانے کو میں برکت نہیں بلکہ عذاب قرار دوں گا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تجربہ سے ہی انسان مضبوط ہوتا ہے لیکن تجربہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب اس حد سے زیادہ تجربہ کو لے جایا جائے تو پھر تجربہ ہلاکت کا بھی موجب ہو جاتا ہے۔ پس یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ہمیں تجربہ کرنے دو ہم تجربہ سے سیکھ جائیں گے۔ اگر اس قسم کی آزاد حکومت جو ڈومینین سٹیٹس کہلاتی ہے ہندوستان کو یکدم دے دی جائے تو سب سے بڑی مصیبت یہ ہوگی کہ اسے اس کا تجربہ کرنے کی مہلت بھی کوئی نہ دے گا۔ باہر کے ممالک کو جانے دو شاید اِن کا خطرہ خیالی ہو لیکن ہمارے اپنے اندر لڑنے کی کافی روح موجود ہے۔ پیشتر اس کے کہ تجربہ ہندوستانیوں کو مضبوط کرے وہ تجربہ کی حد سے آگے نکل چکے ہوں گے اور دنیا تباہی اور بربادی کا ایک ایسا منظر دیکھے گی جو قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں بھی نظر نہیں آیا۔ ہم ایک وطنیت کے خواہاں لیکن اس صورت میں ہماری قومیت بھی باقی نہیں رہے گی۔

سٹیج پر کھڑے ہو کر یہ کہہ دینا یا قلم پکڑ کر یہ لکھ دینا کہ ہندوستان اِس وقت مکمل آزادی کے قابل ہے آسان ہے لیکن حقائق کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بحری جہاز کہاں ہیں جو ہمارے ساحل کی حفاظت کریں گے اور ہماری تجارتوں کو بے خطرہ فروغ پانے دیں گے؟ اور وہ فوجیں کہاں ہیں کہ جو ہماری سرحدوں کو بچائیں گی اور ہمارے ملک کے امن کو قائم رکھیں گی؟ اور وہ درس گاہیں کہاں ہیں جو ہماری سیاسی اور ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے والے نوجوان ہمیں دیں گی؟

بعض لوگ اس موقع پر کہہ دیں گے کہ ان چیزوں کا نہ ہونا انگریزوں کا قصور ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ یہ کس کا قصور ہے؟ سوال تو یہ ہے کہ کیا ان حالات میں فوراً کامل آزاد حکومت مل سکتی ہے؟ کیا یہ کہہ کر کہ یہ انگریزوں کا قصور ہے ہندوستان اس قابل ہو جائے گا کہ فوراً اپنے ملک کے انتظام کو سنبھال لے؟

یہ دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ مثلاً آئرلینڈ نے ایک دن میں آزاد گورنمنٹ حاصل کرلی تھی کیونکہ آئرلینڈ اور ہندوستان میں فرق ہے۔ آئرلینڈ انگلستان کا ایک جزو تھا اور آزاد حکومت کی سب کَلیں اس میں اسی طرح موجود تھیں جس طرح کہ آزاد ممالک کی ہوتی

ہیں۔ اس کے باشندے اعلیٰ فوجی عہدوں پر مامور تھے اور نظام سلطنت کے ہر شعبہ میں آئرلینڈ کو تجربہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں آئرلینڈ کا ملک ایک چھوٹا جزیرہ ہے جسے بوجہ انگلستان سے ملحق ہونے کے کسی بحری طاقت سے خطرہ نہیں اور ملک میں صرف ایک ہی قوم بسنے کی وجہ سے کوئی زیادہ پریشانی کے سامان نہیں۔

یہی حال دوسرے ممالک کا ہے جو جنگ عظیم کے بعد آزاد ہوئے ہیں۔ گو وہ نام کے لحاظ سے دوسری حکومتوں سے ملحق تھے لیکن کام کے لحاظ سے وہ اپنے حاکموں کے ساتھ شریک تھے اور ان کی جُدائی صرف نام کی جُدائی تھی لیکن یہ حال ہندوستان میں نہیں۔ ہندوستان میں اگر کوئی حصہ فوراً آزاد کیا جا سکتا ہے تو وہ صوبہ جات ہیں۔ جن کے سب کَل پُرزے پہلے ہی ہندوستانیوں کے قبضہ میں آچکے ہیں۔ باقی رہا مرکز اس کے آزاد کرنے کے لئے بہت کچھ تیاری کی ضرورت ہے۔

فلپائن کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس نے ان جزائر کو اور کیوبا کو آزاد کرانے کے لئے سپین سے جنگ کی لیکن باوجود ارادہ کے انہیں فوراً آزادی دینے کے قابل نہ ہوئیں اور کیوبا کے متعلق تو تھوڑی لیکن فلپائنز کے متعلق بہت زیادہ نگرانی اور حفاظت کی ضرورت انہیں محسوس ہوئی۔ چنانچہ فلپائنز کی حکومت تو اب تک بھی ان کی نگرانی کی محتاج ہے۔

اس زمانہ میں کسی ملک کو پوری آزادی حاصل کرنے کیلئے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہے۔

۱ فوج کے انتظام کرنے کی اہلیت رکھنے والے افسروں کی۔

۲ اس قسم کے کارخانوں کی جہاں اسلحہ جنگ تیار اور مرمت ہو سکیں۔

۳ ہوائی جہازوں پر کام کرنے والے اور ان کے جنگی کام کی اہلیت رکھنے والے اعلیٰ افسروں کی۔

۴ بحری بیڑے کی جو ساحل کی حفاظت نہ صرف غنیم سے بلکہ بد دیانت تاجروں کی دخل اندازی سے بھی کرے۔

یہ چار چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن کی آزادی کے لئے فوری ضرورت ہے۔ باقی اور بیسیوں امور ہیں کہ جن کی تکمیل کی ضرورت ہے۔ گو انہیں ایک وقت تک نظرانداز بھی کیا جا

سکتا ہے لیکن مذکورہ بالا امور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہندوستانی کمیشن والے فوجی افسروں یا نوجوان سکنگ کمیشن والے افسروں کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک دن میں سب ذمہ داری کے عہدوں کو سنبھالنے کی قابلیت پیدا کر لیں گے۔ نہ ایک دن میں جنگی بیڑا اور اس پر کام کرنے والے یا ہوائی جہاز اور ان پر کام کرنے والے یا جنگی سامانوں کی مرمت کے ماہر پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اپنے ہمسایوں سے صلح رکھیں گے۔ کیونکہ ہمسایوں سے صلح رکھنی ہمارے اختیار میں نہیں ہے بلکہ ہمارے ہمسایوں کے اختیار میں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی ہم سے صلح رکھیں گے۔ ان کا موجودہ اظہار دوستی ہرگز ہمیں تسلی نہیں دلا سکتا۔ اٹلی نے جس دن ٹرکی کے افریقن علاقہ پر حملہ کرنا تھا اسی دن اس کے وزیر اعظم نے اعلان کیا تھا کہ ٹرکی سے ہمارے تعلقات ایسے اچھے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ موجودہ زمانہ میں ہمیں نہ صرف افغانستان کی طرف سے خطرہ ہے بلکہ شمالی سرحد کی طرف سے روس اور نیپال دونوں حکومتوں سے خطرہ ہے۔ پہلے زمانوں میں شمالی لوگوں کو ہندوستان پر حملہ کا خیال نہیں پیدا ہوا تھا لیکن مغلیہ حکومت کے آخری دور میں نیپال کو ہندوستان کی فتح کا خیال پیدا ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ انگریزوں کی وجہ سے اس کا حملہ ناکام ہوا تھا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ آزاد ہندوستان پر بھی اس کا حملہ اسی طرح ناکام ہو گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انگریز اس وقت ملک کو بچانے کے لئے آئیں گے اس قدر دور ملک سے جب کہ خود اس ملک میں جنگی تیاری کا مرکز موجود نہ ہو مدافعت بالکل ناممکن ہوتی ہے اس وقت جنگ کی مشینری یہاں موجود ہے۔ ہندوستان کو پوری آزادی دینے کے بعد یہ حالت نہیں رہ سکتی اور نئے سرے سے مرکز قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پس ان حالات کے ماتحت ہمیں ایک عرصہ تک انگریزی دخل ہندوستان کی مرکزی حکومت میں تسلیم کرنا ہو گا اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہندوستان کو آزادی کچھ مدارج طے کرنے کے بعد ہی مل سکتی ہے، یکدم نہیں۔

باب چہارم

آزادی کے مختلف مدارج کس طرح مقرر کئے جائیں؟

پہلے باب کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم اس سوال پر غور کریں کہ اگر کامل آزادی فوراً نہیں مل سکتی اور یہ عارضی روک انگلستان نہیں بلکہ ہندوستان کے فائدہ کیلئے ہے تو پھر وہ کونسا طریق اختیار کیا جائے کہ جس کے ذریعہ سے بغیر ناواجب دیر کے ہندوستان کو ہر قدم پر اس قدر آزادی ملتی جائے جس قدر آزادی کا کہ وہ اُس وقت مستحق ہو۔

اس سوال کے دو حل اس وقت تک تجویز کئے جا چکے ہیں۔ ایک حل مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ [لـه] (MONTAGUE CHELMSFORD REPORT) میں تجویز کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ایک رائل کمیشن بیٹھے جو یہ فیصلہ کرے کہ گذشتہ سالوں میں کس قدر ترقی ہندوستان نے کی ہے اور اب اس کے نظامِ اساسی میں کس قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اس حل کو سائمن کمیشن نے رد کر دیا ہے اور ہندوستان کی موجودہ شورش کا بہت بڑا حصہ اس حل کی طرف منسوب کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ جن حالات میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ تیار ہوئی تھی اُن کے ماتحت قیامِ امن کا بہترین علاج یہی تھا کہ ہندوستانیوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ یہ سکیم آخری تجویز نہیں ہے بلکہ انہیں آئندہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد اختیارات ملتے چلے جائیں گے۔ وہ بالکل نیا تجربہ کر رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ نتیجہ کیا نکلے گا اور ان کے سامنے ان آنے والے دس سالوں کی تاریخ نہ تھی جو

سائمن کمیشن کے سامنے تھی۔ پس ان حالات میں وہی سکیم بہتر تھی جو انہوں نے تجویز کی اور یہ بالکل درست نہیں کہ دوبارہ کمیشن کے قیام کی امید کی وجہ سے ہندوستان میں کوئی شورش ہوئی بلکہ حق یہ ہے کہ شورش کا موجب یہ تھا کہ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ یہ سمجھتا تھا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم نے ہندوستان کو اس قدر حق نہیں دیا جس قدر کہ اسے دینا چاہئے تھا بلکہ اس دس سال کے بعد دوبارہ غور ہونے کے خیال سے کئی وہ لوگ جو دوسری صورت میں شورش میں شامل ہو جاتے اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ہاں میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ پچھلے دس سال میں ہندوستان میں جو تغیرات پیدا ہوئے ہیں ان کی بناء پر زیر بحث سوال کا وہی حل بہتر ہے جو سائمن کمیشن نے تجویز کیا ہے۔

سائمن کمیشن کا تجویز کردہ حل یہ ہے:۔

"چاہئے کہ نیا اساس جس قدر ممکن ہو اپنے اندر ہی ترقی کا سامان رکھتا ہو۔ چاہئے کہ اس میں ناقابل تبدیل اور ہمہ گیر اصول نہ ہوں۔ بلکہ اس میں حسبِ ضرورت ترقی اور اختلاف کی گنجائش ہو۔" [۲۱]

میری رائے میں یہ حصہ کمیشن کے بہترین نتائج میں سے ہے۔ اگر سائمن کمیشن حقیقتاً اس اصل کے مطابق سکیم پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو میرے نزدیک وہ ہمیشہ کے لئے ہندوستانیوں کے شکریہ کا مستحق ہے۔ کمیشن کے اس اصل کے ماتحت آئندہ ہندوستان کی آئینی ترقی کے لئے کسی اور کمیشن کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ایک ہی دفعہ پارلیمنٹ ایک ایسا مسودہ پاس کر دے گی جس کے ماتحت ہندوستان آپ ہی آپ اپنے وقت پر اُس آزادی کو حاصل کرلے گا جو اس کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ مگر جہاں تک میں نے سکیم پر غور کیا ہے یا تو اس مقصد کو سائمن کمیشن اپنی تفصیل میں مدنظر نہیں رکھ سکا یا پھر ہندوستان کی آزادی کا مفہوم سمجھنے میں اسے دھوکا لگا ہے اور وہ ہندوستان کی آزادی کو دوسرے ملکوں کی آزادی سے مختلف چیز سمجھتا ہے۔

پہلے میں صوبہ جات کو لیتا ہوں۔ صوبہ جات کا نظامِ حکومت کمیشن نے یہ مقرر کیا ہے:۔

۱ کہ گورنر کو وزارت کی مجالس کا پریزیڈنٹ تجویز کیا ہے۔

۲ گورنر کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو سول سروس کے کسی فرد کو یا کسی ایسے شخص کو جو نہ سروس میں ہو اور نہ کونسل کا ممبر ہو وزیر مقرر کر دے۔

۳ اسے اختیار دیا ہے کہ خواہ ایک وزیر اعظم مقرر کر کے اس کے مشورہ سے وزارت مقرر کرے۔ خواہ مختلف اقوام میں سے وزیر چُن لے۔

ہر ایک شخص جو آئینی حکومت کے اصول سے واقف ہے سمجھ سکتا ہے کہ ایسی حکومت ذمہ دار حکومت نہیں کہلا سکتی اور اس قسم کی تجویز زیادہ سے زیادہ عارضی طور پر برداشت کی جا سکتی ہے لیکن رپورٹ خاموش ہے کہ اس طریق کو کس طرح بدلا جا سکے گا۔ آیا اس میں تغیر کرنا گورنمنٹ کے اختیار میں ہوگا' کونسلوں کے اختیار میں ہوگا' گورنر جنرل اور سیکرٹری آف سٹیٹ کے اختیار میں ہوگا' یا پارلیمنٹ کے اختیار میں ہوگا' اگر گورنر کے اختیار میں ہوگا تو ایک گورنر کے فیصلہ کو دوسرا گورنر بدل سکے گا یا نہیں۔ اگر بدل سکے گا تو نظامِ حکومت ہمیشہ آگے پیچھے ہوتا رہے گا۔ اگر کونسلوں کے اختیار میں ہوگا تو وہ پہلے ہی سیشن میں اسے بدل دیں گی۔ اگر گورنر جنرل اور سیکرٹری آف سٹیٹ کے اختیار میں ہوگا تو اس کی بھی کوئی آئینی صورت نہیں بتائی اور اگر پارلیمنٹ کے اختیار میں ہوگا تو وہی سوال نئے کمیشنوں کا پیدا ہو جائے گا۔ مگر اس سے بھی مشکل سوال مرکزی حکومت کا ہے جس میں کہ حکومت کو نیابتی اصول پر ابھی قائم ہی نہیں کیا گیا۔ وہاں موجودہ نظام کو نسل کس طرح بدلا جا سکے گا۔ اس کا جواب کمیشن کی رپورٹ نہیں دیتی بلکہ وہ خود تسلیم کرتی ہے کہ اس کی کوئی تدبیر انہیں نہیں سوجھی۔ وہ اقرار کرتی ہے کہ:-

"یہ تو ممکن ہے کہ اس وقت ایک ایسا نظام حکومت مقرر کر دیا جائے جو آئندہ ترقی کے مخالف نہ ہو لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی قانون پارلیمنٹ میں ایسا پاس کر دیا جائے جس کے ذریعہ سے ہندوستان کی مرکزی حکومت اندرونی اصلاح اور ارتقاء کے ذریعہ سے آپ ہی آپ آزادی کی طرف قدم بڑھاتی جائے۔ [۱۳]"

یہ خیال کرتے ہوئے کہ اصل سوال مرکزی حکومت کا ہی تھا صوبہ جات کے موجودہ نظام میں تو معمولی تغیرات کے ساتھ ایک معقول نظامِ حکومت جو ہر روز کی شورش سے نجات دے دے۔ ممکن تھا اس فقرہ کے یہ معنے بنتے ہیں کہ جب کہ مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم نے کم سے کم یہ انتظام کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً آئینِ حکومت پر نظر ثانی ہوتی رہے۔ سائمن کمیشن نے صرف اظہارِ حیرت کر دیا ہے اور پیش آنے والی مشکل کا کوئی علاج نہیں بتایا۔ وہ ایک اعلیٰ اصل قائم کرنے میں تو کامیاب ہوا ہے لیکن اس اصل سے کام لینے میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ تفصیلی بحث میں ضروری مقامات پر کمیشن کی رپورٹ کے اس نقص کی طرف توجہ دلاؤں۔

باب پنجم

ہندوستان کی دُہری مشکلات

انگلستان سے سمجھوتہ اور اقلیتوں کے سوال کا حل

اس امر پر اپنی رائے ظاہر کرنے کے بعد کہ سائمن کمیشن کی یہ سفارش کہ آئندہ ہندوستان کے لئے ایسا نظام تجویز کیا جائے کہ جس کے اندر ہی ترقی کی گنجائش ہو اب میں اس اہم سوال کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں جو ہندوستان کی آئینی ترقی کے راستہ میں بطور ایک چٹان کے حائل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بوجہ ایک لمبے عرصہ سے ہندوستان پر حکومت کرنے کے انگلستان سے سمجھوتہ کرنا بھی بہت مشکل ہے لیکن اس سے بھی زیادہ یہ مشکل ہے کہ ہندوستان کے لئے کوئی ایسا طریق حکومت تجویز کیا جائے جس کے ذریعہ سے وہ لوگ برسرحکومت آئیں جو واقعہ میں حکومت کرنے کے مستحق ہوں اور وہ لوگ حکومت پر قائم نہ ہوں جو اسے نفاق و شقاق کا ذریعہ بنالیں۔ کارلائل نے کیا سچ کہا ہے کہ

> "فضیلت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو حکومت سے علیحدہ کرنے کے بعد بھی اصل سوال حل طلب رہ جاتا ہے جو یہ ہے کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دی جائے جو واقعہ میں اس کے اہل ہیں۔ آہ! ہم اس سوال کا حل کس طرح کریں؟"

کارلائل کا یہ قول ہر ملک پر صادق آتا ہے لیکن ہندوستان کی حالت پر تو یہ بہت ہی چسپاں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے انگریزوں سے سمجھوتہ اس قدر مشکل نہیں جس قدر کہ اپنے لئے ایک مناسب قسم کی گورنمنٹ تجویز کرنے کا سوال مشکل ہے۔ ہمارا ملک تعصب اور اختلاف کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کو ان دونوں

خصلتوں کا گھر بنا دیا ہے۔ اس اختلاف کی موجودگی میں سیلف گورنمنٹ بجائے مفید ہونے کے ملک کے لئے سخت مضر ہو سکتی ہے۔

بعض لوگ تو اس مشکل کا حل یہ بتاتے ہیں کہ جب تک یہ حالت دور نہ ہو جائے ہندوستان کو کسی قسم کی آزادی دی ہی نہ جائے لیکن جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں یہ علاج صحیح نہیں۔ اگر ہندوستان کو آزادی نہ ملی تو یہ اختلاف دور ہو ہی نہیں سکتا اور صورتِ حالات بد سے بد تر ہوتی چلی جائے گی۔

کیا ڈیماکریسی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے منافی ہے؟

بعض دوسرے لوگ اس کا یہ علاج بتاتے ہیں کہ یہ کوئی مرض ہی نہیں اس کو مرض سمجھنا ہی مرض کو بڑھا رہا ہے۔ اگر ہندوستان "ڈیماکریسی" (DEMOCRACY) جس کے معنی اکثریت کی حکومت کے ہیں چاہتا ہے تو پھر اسے اقلیتوں کا سوال نظر انداز کر دینا چاہئے کیونکہ "ڈیماکریسی" کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ اکثریت حکومت کرے۔ اقلیت کو چاہئے کہ اپنے آپ کو اکثریت کے ساتھ وابستہ کرے یا پھر خود اکثریت بننے کی کوشش کرے مگر "ڈیماکریسی" کا مطالبہ کرتے ہوئے ساتھ ہی یہ مطالبہ کرنا کہ اکثریت کو حکومت نہ کرنے دو اور اسے پابندیوں میں جکڑ دو گویا ایک طرف "ڈیماکریسی" کے اصول کو رد کرنا ہے تو دوسری طرف فتنہ و فساد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھولنا ہے۔ عام طور پر یہ سوال بعض انگریزوں یا دوسرے مغربی لوگوں کی طرف سے اٹھایا جاتا ہے اور سوال کرنے والوں میں سے بعض کی غرض تو یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ نہ کریں اس میں ان کا نقصان ہے۔ اور بعض یہ اعتراض محض ہندوستان کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے کرتے ہیں۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ خیال "ڈیماکریسی" کے مفہوم کے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ہر اکثریت کی حکومت کو "ڈیماکریسی" نہیں کہہ سکتے بلکہ اس اکثریت کی حکومت کو "ڈیماکریسی" کہتے ہیں جو خالص ملکی فوائد کو مدنظر رکھتی ہے نہ کہ کسی خاص قوم یا عقیدہ کے لوگوں کے فوائد کو اگر ایک ملک میں ایک قوم یا ایک مذہب کے دس لاکھ آدمی بستے ہوں اور دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے ایک لاکھ اور وہ دس لاکھ اپنی قوم یا اپنے مذہب کے لوگوں کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کریں تو یہ ہرگز "ڈیماکریسی" نہیں کہلائے گی۔ انگلستان

کی رومن کیتھولک اکثریت جب پراٹیسٹنٹ (PROTESTANT) اقلیت کے خلاف قواعد بنا رہی تھی تو وہ ہرگز "ڈیماکریسی" کی عامل نہیں تھی۔ "ڈیماکریسی" اس اکثریت کی حکومت کو کہتے ہیں جس کا جتھا ان اصول پر بنا ہو جو حکومت سے متعلق ہیں۔ وہ اکثریت جس کا جتھا ملکی سیاست پر نہیں بلکہ کسی خاص مذہبی یا قومی فوائد کی بناء پر بنا ہو اس کی حکومت کو جمہوری حکومت نہیں کہا جا سکتا وہ فرقہ وار حکومت ہے۔ ڈاکٹر سی۔ ایف۔ سٹرانگ (C.F.STRONG) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی "ڈیماکریسی" کی تعریف یہ کرتے ہیں۔

"ڈیماکریسی سے ہماری مراد اس قسم کی حکومت ہے جس میں کہ حکومت کا اختیار قانوناً کسی خاص قوم کو نہ دیا گیا ہو۔ بلکہ تمام ملک کو بہ حیثیتِ مجموعی دیا گیا ہو۔"[۱۴]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر سٹرانگ نے یہ شرط لگائی ہے کہ حکومت قانوناً کسی فرقہ کے سپرد نہ ہو لیکن قانوناً سپرد ہونے یا عملاً ایسا ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ اگر گورنمنٹ قانوناً کسی خاص قوم کے سپرد ہوگی تو ہم کہیں گے کہ یہ قانوناً ڈیماکریسی نہیں اگر عملاً ایسا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ وہ حکومت عملاً ڈیماکریسی نہیں۔ بہرحال حقیقی ڈیماکریٹک حکومت وہی ہے جس میں حکومت اس اکثریت کے قبضہ میں ہو جس کا جتھا سیاسی امور کی بناء پر بنا ہو نہ کہ قومی یا مذہبی امور کی بناء پر۔ لارڈ برائس ڈیماکریسی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جس طرح دوسری حکومتیں اس امر کی محتاج ہیں اسی طرح جمہوریت بھی اس امر کی محتاج ہے کہ فردی آزادی کا اس میں پوری طرح خیال رکھا جائے۔"[۱۵]

پس کوئی حکومت جس میں افراد کے حقوق محفوظ نہ ہوں ہرگز ڈیماکریسی نہیں کہلا سکتی۔ اور ڈیماکریسی کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ اس کے ذریعہ اقلیتوں کی قربانی کی جائے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی ڈیماکریسی تحریر شدہ یا غیر تحریر شدہ آئین حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور آئین حکومت کی ایک بہت بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ افراد یا جماعتوں کے حقوق کو تلف ہونے سے بچایا جائے پس اسی نقطہ نگاہ سے ہمیں ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال کو دیکھنا چاہئے۔ اگر تو ہندوستان کی اقلیتیں سیاسی اور تمدنی ہیں اور اکثریت بھی سیاسی اور تمدنی ہے تو بے شک ڈیماکریسی کے ماتحت اقلیت کو اکثریت پر قربان ہو جانا چاہئے اور اکثریت کو حکومت کا پورا حق ہونا چاہئے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف اکثریت سے مراد ہندوستان میں ایک

خاص قوم اور مذہب کی اکثریت ہے تو وہ اکثریت ڈیماکریسی کے نقطہ نگاہ سے اکثریت نہیں بلکہ ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے جسے کوئی حق نہیں کہ اقلیت پر بغیر حد بندی کے حکومت کرے۔

اگر اس اصل کو تسلیم کر لیا جائے کہ اکثریت اقلیت پر بغیر حد بندی کے حکومت کرنے کی مجاز ہے تو اس سے دنیا کی تمام علمی ترقی رک جاتی ہے۔ ذہنی ترقی کی ہر نئی رو اور ہر جدید علم پہلے معدودے چند افراد کی توجہ کو ہی کھینچتا ہے اور اکثریت اس کی مخالف ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جانی دشمن ہوتی ہے۔ اگر اکثریت کو غیر محدود حکومت کرنے کا اختیار ہو تو پھر وہ مختلف مظالم جو دنیا میں مذہب یا فلسفہ کے نام پر ہوتے چلے آئے ہیں انہیں جائز اور درست کہنا ہو گا لیکن کبھی بھی فطرت انسانی نے ان کے جواز کو قبول نہیں کیا۔ اگر اس اصل کو قبول کر لیا جائے تو دنیا کی تمام علمی' اخلاقی اور مذہبی ترقی رک جاتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ دنیا ایک دن سوتے سوتے اٹھے اور اس کے اکثر افراد ایک نئے مذہبی' فلسفی یا تمدنی یا علمی نکتے کے قائل ہو گئے ہوں۔ ہر نئی تحقیق اقلیتوں میں نشوونما پاتی رہی ہے اور پاتی رہے گی پس دنیا کی نجات اقلیتوں کی حفاظت میں ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کو نظرانداز کر دو تو دنیا تمام علمی اور اخلاقی ترقیوں سے محروم ہو جائے گی۔

پھر جو لوگ اقلیت کو اکثریت کے رحم پر چھوڑ دینے کا مشورہ دیتے ہیں وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہر ایک اقلیت ایک قسم کی نہیں ہوتی اور نہ ہر ایک چیز قربان کر دینے کے قابل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو کسی صورت میں قربان نہیں کی جا سکتیں۔ اگر گلیلیو (GALILEO) اپنے وقت کی اکثریت سے ڈر کر سیاروں کی حرکات کے مسئلہ کو چھوڑ دیتا تو دنیا آج کہاں ہوتی؟ اس قسم کا مشورہ دینے والوں کو پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ہندوستان کی اقلیتوں کی بنیاد کس امر پر ہے۔ اگر ان کی بنیاد ٹیرف ریفارم (TARIFF REFORM) یا اِنکم ٹیکس کے اصول میں اختلاف رکھنے پر ہے تو بے شک انہیں نظرانداز کیا جا سکتا ہے لیکن جب کہ ان کی بنیاد مذہب پر ہے جسے آزادی اور وطنیت سے بھی زیادہ متبرک سمجھا جاتا ہے اور اگر مذہب کوئی چیز ہے تو اسے ایسا ہی سمجھنا چاہئے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ اقلیت ایسی حکومت کو برداشت کرے جو مذہب کے اختلاف کی وجہ سے اس پر ظلم کرتی ہو۔ یا ایسے قوانین پاس کرتی ہو جس سے اس کی غرض اس مذہبی اقلیت کے افراد کو دق کر کے ملک سے نکل جانے یا اکثریت کے مذہب کو قبول کرنے یا دائمی طور پر ایک ادنیٰ پوزیشن قبول کرنے پر مجبور کرنا ہو۔

ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک اقلیت اور اکثریت کے درمیان مذکورہ بالا امور مَابِهِ النِّزَاع ہوں تو اقلیت ہرگز اکثریت کی مرضی پر چلنے کیلئے مجبور نہیں کی جا سکتی۔ اور میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا اختلاف اسی قسم کا ہے۔

کیا تجربہ رواداری سکھادے گا؟

مذکورہ بالا دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کا یہ خیال ہے کہ بے شک اقلیت کے حقوق کی حفاظت ہونی چاہئے لیکن اس کا یہ طریق نہیں کہ قوانین کے ذریعہ سے اس کی حفاظت کی جائے۔ رواداری تجربہ اور ذمہ داری سے خود بخود آ جاتی ہے۔ پس بغیر کسی حفاظت کی تدبیر کے ملک میں ایک آزاد نظامِ حکومت قائم کر دینا چاہئے۔ اکثریت یا اقلیت جس میں بھی نقص ہو ایک دوسرے سے واسطہ پڑنے پر خود بخود اس کی اصلاح ہو جائے گی اور طبائع آپس میں مل جائیں گی۔ یہ نقطہ نگاہ ہندوؤں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔

اگر دو قوموں میں ادنیٰ سا اختلاف ہو اور وہ امور جن کی نسبت خطرہ ہو معمولی ہوں تو ایک طریق اصلاح کا وہ بھی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب اقلیت اور اکثریت کا اختلاف اس قسم کا ہو کہ ایک دوسرے کو کُچلنا چاہے تو کیا پھر بھی یہ علاج کامیاب ہو سکتا ہے؟ اگر تجربہ سے یہ معلوم ہو کہ ایک قوم دوسری قوم کو کھاتی جاتی ہے تو پھر کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ اکٹھے رہنے سے ایک کو دوسری سے خطرہ نہیں ہو گا پھر اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اقلیت اور اکثریت زندگی کے کئی شعبوں میں اکٹھی رہتی چلی آئی ہیں لیکن باوجود اس اکٹھا رہنے کے اکثریت اقلیت کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئی تو کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ زیادہ اہم امور میں اکٹھا رہنے سے اکثریت اقلیت سے ایسا سلوک نہیں کرے گی۔ غرض اگر اختلاف معمولی ہو تو بے شک یہ جرأت کی جا سکتی ہے کہ دونوں قوموں کو کچھ عرصہ کے لئے اکٹھا چھوڑ دیا جائے اور انتظار کیا جائے کہ سیاست خود مروّت سکھالے گی لیکن جب کہ اختلاف اہم ہو اور ایک قوم دوسری کو کھانے کی عادی ہو چکی ہو تو پھر محض اُمیدِ موہوم پر ایک قوم کو تباہی کے گڑھے میں نہیں دھکیلا جا سکتا۔

یہ ثابت کر چکنے کے بعد کہ جب اقلیت کو اہم امور میں اختلاف ہو جسے وہ قربان نہ کر سکتی ہو تو اس سے اکثریت کے حکم پر سر جھکانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح جب اکثریت کے عمل سے اور ارادہ سے ثابت ہو جائے کہ وہ اقلیت کو نقصان پہنچاتی رہی ہے اور

آئندہ نقصان پہنچانا چاہتی ہے تو اس صورت میں اقلیت کو اکثریت کے سپرد کر کے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ آہستہ آہستہ رواداری کی روح پیدا ہو جائے گی۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کے تعلقات نہایت اہم ہیں اور اکثریت کا تعلق اقلیت سے گذشتہ تجربہ اور آئندہ ارادوں کی بناء پر ایسا نظر آتا ہے کہ اسے اکثریت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوؤں کا اقلیتوں سے سلوک

ہندوستان میں اس وقت اکثریت ہندو قوم کی ہے اور اس کے مقابلہ میں مسلمان، ادنیٰ اقوام اور انگریز اینگلو انڈین وغیرہ تعداد میں کم ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ اقوام کا سوال تو اتنی دفعہ انگلستان کے لوگوں کے سامنے آچکا ہے کہ اس کے متعلق میں کچھ زیادہ لکھنا پسند نہیں کرتا لیکن میں یہ بتادینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندو دوسری اقلیتوں سے کیا سلوک کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کو جو واقف نہیں ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہندو لوگ دوسری اقلیتوں سے بھی جہاں تک ان کی طاقت ہے اچھوت اقوام کا سا ہی سلوک کرتے ہیں اور جب تک ان کی یہ حالت قائم ہے اس وقت تک کوئی عقلمند قوم ان پر اعتبار نہیں کر سکتی۔

سب سے پہلے تو میں ایک دوسرے سے میل ملاقات کے معاملہ کو لیتا ہوں۔ دنیا میں محبت اور رواداری قائم کرنے کا اصل ذریعہ یہی ہے کہ افراد آپس میں ملتے جلتے رہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے سے دلوں کی کدورت دور ہوتی رہتی ہے اور ملنے میں ایک دوسرے کے قلب کی صفائی کا اظہار کرنے کے لئے بہترین طریق دنیا میں مصافحہ کا ہے۔ تمام اقوام ایک دوسرے سے ملتے وقت مصافحہ کرتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مصافحہ کا طبیعت پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور یہ گویا ادنیٰ سے ادنیٰ ذریعہ ایک دوسرے سے اظہار محبت کا ہوتا ہے لیکن ہندو اپنی روایات میں اس قدر محصور ہے کہ دوسری اقوام سے اتنے سلوک کا بھی روادار نہیں۔ جب آپ کسی ہندو کو دیکھیں گے تو وہ خواہ آپ کا کیسا ہی واقف ہو اس کی تمام تر کوشش یہ ہوگی کہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک غیر قوم کے آدمی سے مصافحہ کرنے سے نجات حاصل کرے۔ وہ ہاتھ جوڑے گا سامنے جھک کر گھٹنوں کو ہاتھ لگالے گا لیکن جہاں تک اس کا بس چلے گا اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں لگائے گا کیونکہ اس کے نزدیک ایسا فعل اسے ناپاک کر دیتا ہے۔ شاید انگریزوں کو یہ عجیب بات معلوم ہوگی اور وہ خیال کریں گے کہ ہم سے

تو ہندو مصافحہ کرتے ہیں لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ فعل ان میں سے اکثر کا بالکل بناوٹ اور ظاہر داری کے طور پر ہوتا ہے ورنہ دل میں وہ مسلمان کیا اور انگریز کیا سب کو سخت حقارت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ چھو جانے کو غلاظت سے بھر جانے کے برابر سمجھتے ہیں۔ اور یہ صرف قیاس نہیں بلکہ واقعہ ہے اس کے ثبوت میں میں ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ کا قول نقل کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"میں جب کسی انگریز سے ملتا ہوں تو ملنے کے بعد پانی سے ہاتھ دھو لیتا ہوں۔"[۱۶]

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ ان ہندوؤں کو چھوڑ کر جو مذہب سے بیزار ہیں باقی اصل ہندو صرف دکھاوے کے لئے دوسری اقوام کے لوگوں سے مصافحہ کرتے ہیں ورنہ وہ دل میں اسے ایک ناپاک فعل تصور کرتے ہیں۔

دوسرا ذریعہ اقوام میں تعلق بڑھانے کا مل جل کر کھانا پینا ہے اس طرح بھی بہت کچھ اختلاف مٹتا ہے لیکن کوئی ہندو جو حقیقی ہندو ہے کبھی مسلمان یا انگریز یا اور کسی قوم کے ہاتھ کا چُھوا ہوا نہیں کھاتا اور جو ہندو انگریزوں کی دعوتوں میں آکر کھالیتے ہیں در حقیقت وہ یا تو ہندو مذہب سے بیزار یا ناواقف ہیں اور یا پھر وہ انگریزوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس بارہ میں ہندو قوم کا تعصّب اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ پنڈت مدن موہن مالویہ جی تو اس مجلس میں جس میں کوئی غیر ہندو بیٹھا ہو پانی پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک خاص مجلس (جو گاندھی جی کا روزہ تڑوانے کے لئے جو انہوں نے ہندو مسلم فساد کی بناء پر رکھا تھا) منعقد کی گئی تھی اور جس کی غرض یہ بتائی گئی تھی کہ ہندو مسلمانوں میں شدھی کی وجہ سے جو فساد پیدا ہو گیا ہے اسے دور کیا جائے اس میں مجھ سے بھی خواہش کی گئی تھی کہ میں اپنی جماعت کے نمائندے بھیجوں۔ ان نمائندوں کا بیان ہے کہ پنڈت مالویہ جی پیاسے بیٹھے رہے اور اس وجہ سے پانی نہ پیا کہ اس مجلس میں کچھ مسلمان بیٹھے ہیں آخر ان کے لئے الگ کمرہ کا انتظام کیا گیا تو انہوں نے وہاں جا کر پانی پیا۔ جس قوم کے لیڈروں کے تعصّب کا یہ حال ہے کیا اس کی نسبت یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھے گی۔ ہر ایک شخص جو ہندوستان سے واقف ہے جانتا ہے کہ ہندو مسلمان دکاندار سے کبھی کوئی چیز لے کر نہیں کھاتے۔ بظاہر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ صفائی کا خیال ہے حالانکہ ایک غریب مسلمان بھی صفائی میں ہندو سے بہتر ہوتا ہے۔ ہندو

مٹھائی بنانے والا جس کی مٹھائی شریف سے شریف ہندو شوق سے خرید کر کھا لیتا ہے ایسا غلیظ ہوتا ہے کہ شاید اس کے برابر غلیظ انسان تلاش کرنا مشکل ہو گا اور اس کے برتنوں کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔ بسا اوقات کتے انہیں چاٹ جاتے ہیں اور وہ اس کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کرتا لیکن جب ایک مسلمان پاس سے بھی گذر جاتا ہے تو وہ "دور رہنا' دور رہنا" کا شور مچا دیتا ہے اور اس فعل کی بنیاد ہرگز مذہب پر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہندوؤں کا اقرار ہے یہ تدبیر صرف دوسری اقوام کو اقتصادی طور پر کمزور کرنے اور ہندوؤں کی دولت بڑھانے کے لئے کی گئی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کا ایک مشہور مذہبی اخبار "مسافر آگرہ" چھُوت چھات کے متعلق لکھتا ہے:-

"اگر یہ چھوت چھات نہ ہوتی تو آج کسی قسم کی تجارت بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں نظر نہ آتی۔ ہم کہتے ہیں اگر ہماری تجارت کی کسی طاقت نے حفاظت کی تو وہ طاقت اس بائیکاٹ کی تھی"۔

"اس تحریک سے ہندو قوم کو جو زبردست فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ جن میں کسی قسم کے مبالغہ کی گنجائش ہو۔ مثال کے طور پر آپ سب سے پہلے تجارت ہی کو لے لیجئے۔ آج ملک کی تمام خوردنی اور عمدہ اشیاء کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔"[۶۷]

ایک مذہبی اخبار کا یہ بیان بالکل واضح کر دیتا ہے کہ چھوت چھات کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اقتصادی بائیکاٹ کی ہی ایک شکل ہے۔ اس کی اصل غرض یہ ہے کہ دوسری اقوام کے بائیکاٹ پر پردہ پڑا رہے اور انہیں یہ کہہ کر خاموش کرایا جا سکے کہ ہم جو تم سے چیزیں نہیں خریدتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارا مذہب اس سے روکتا ہے۔ اس بائیکاٹ کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ملک میں کھانے کی دکانیں ہندوؤں کی ہیں اور مسلمانوں کی قریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور ہندوؤں کی اس چھوت چھات کی وجہ سے سٹیشنوں پر بھی کھانے کا ٹھیکہ عام طور پر ہندوؤں کو دیا جاتا ہے اس خیال سے کہ مسلمان ہندوؤں کے ہاتھ کا کھا لیتے ہیں اور ہندو مسلمان کے ہاتھ کا نہیں کھاتے۔ اب اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ فی کس سال میں ایک روپیہ کی مٹھائی یا کھانا بازار سے خریدا جا سکتا ہے۔ یہ اندازہ درحقیقت بہت تھوڑا ہے تو بھی بالغ مسلمانوں کی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر سال مسلمانوں کی جیب سے چار کروڑ روپیہ ہندوؤں کو مل جاتا ہے

جس کے واپس آنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ جس قوم نے اپنی ہمسایہ قوم کے بائیکاٹ کی ایسی منظم صورت نکالی ہے کیا اس کی نسبت اقلیتوں کو یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس پر اعتبار کریں اور اپنی قسمت کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دیں؟

یہ صورت صرف کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ اور تجارتوں کا بھی ایک تھوڑے فرق کے ساتھ یہی حال ہے۔ مسلمان عام طور پر ہندوؤں کی دکانوں پر سے سودا خریدتے ہیں لیکن ہندو شاذ و نادر ہی مسلمان کی دوکان سے سودا خریدتا ہے۔ کسی شہر میں، کسی بازار میں، کسی دن صبح سے شام تک پہرہ لگا کر دیکھ لو مسلمان کی دکان پر ہندو گاہک بہت کم آتا دکھائی دے گا۔ اگر مسلمان سے کسی قدر ارزاں چیز بھی ملے گی تو بھی وہ ہندو سے ہی خریدے گا۔

ہندوؤں کا یہ تعصّب اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو مکان بھی کرایہ پر نہیں دیتے۔ چنانچہ الٰہ آباد کے ایک مشہور ہندو لیڈر جو موجودہ کانگریسی تحریک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈر کہلاتے ہیں ان کے بہت سے مکانات الٰہ آباد میں ہیں لیکن ان کا حکم ہے کہ مکان کسی مسلمان کو کرایہ پر نہ دیا جائے۔ اور یہ امر ان سے مخصوص نہیں ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کا یہی حال ہے۔ میں ۱۹۱۷ء میں بوجہ بیماری بمبئی گیا سمندر کے کنارہ پر رہنے کا چونکہ مشورہ تھا باندرہ جو بمبئی کے مضافات کا ایک قصبہ ہے اس میں ایک بنگلہ کرایہ پر لیا۔ میری والدہ صاحبہ ہمراہ تھیں انہیں کاربنکل کی تکلیف ہو گئی اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ علاج کی سہولت کے لئے بمبئی میں مکان لے لیا جائے۔ مجھے چونکہ ڈاکٹری مشورہ سمندر کے کنارہ کے پاس رہنے کا تھا چوپاٹی پر مکان کی تلاش کی گئی لیکن کوئی مکان خالی نظر نہ آیا۔ آخر ایک ریاست کے وزیر اعظم جو بغرضِ تبدیلی آب و ہوا بمبئی میں آئے ہوئے تھے ان کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مکان خالی کرنے والے ہیں۔ ان سے دریافت کیا گیا تو اتفاقاً وہ وطن کے لحاظ سے پنجابی نکلے اور وطنیت کے خیال سے انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ مکان بقیہ ٹرم کے لئے ہمیں کرایہ پر دے دیں گے۔ کرایہ وغیرہ کا فیصلہ ان کے ساتھ ہو گیا مکان پر قبضہ کرنے کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی لیکن بعد میں انہوں نے انکار کر دیا۔ جب ہم نے زیادہ زور دیا تو انہوں نے بتایا کہ بمبئی میں ایک بڑی جماعت ہندوؤں کی ایسی ہے جس نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ مکانات مسلمانوں کو کرایہ پر نہ دیئے جائیں۔ چنانچہ میں نے جب آپ سے وعدہ کر لیا تو بعض لوگ اس بات کو سن کر میرے

پاس آئے اور کہا کہ اگر کسی مسلمان کو تم نے مکان کرایہ پر دیا تو آئندہ تم کو بھی کرایہ پر مکان اس علاقہ میں نہیں ملے گا۔ بے شک اس کی نظیریں مل جائیں گی کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مکان کرایہ پر دیا ہوگا لیکن وہ مکان بنائے ہی اس غرض سے گئے ہونگے کہ کرایہ پر چڑھائے جائیں ورنہ ہندوؤں نے بڑے شہروں میں اپنے لئے الگ علاقے تجویز کر چھوڑے ہیں۔ ان میں کسی مسلمان کو نہیں آنے دیتے بالکل اسی طرح جس طرح ساؤتھ افریقہ (SOUTH AFRICA) میں ہندوستانیوں سے اور اقوام کے لوگ سلوک کر رہے ہیں لیکن ان کے طریقِ عمل پر جہاں ہندو شور مچاتا ہے وہاں خود اسی کی نقل ہندوستان میں کر رہا ہے کیونکہ وہ سمجھ چکا ہے کہ اس طرح **سگریگیشن** (SEGREGATION) کرنے سے قوموں کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔

یہ **سگریگیشن** صرف مکانوں کے متعلق ہی نہیں بلکہ جائدادوں کے متعلق بھی ہے اور ایک منظم صورت میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے جائیدادیں چھڑوا کر ہندوؤں کے قبضہ میں لائی جائیں۔ اگر ہندوستان کے بنیوں کے ان منصوبوں کو دیکھا جائے جو وہ مسلمانوں کی جائیدادوں کو اپنے قبضہ میں کرنے کے لئے کرتے ہیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کی اصل غرض مالی فائدہ کے لئے جائیداد پر قبضہ کرنا نہیں ہوتی بلکہ مسلمانوں کو کمزور کرنا ہوتی ہے۔ بسا اوقات جائیداد اس روپیہ کے مقابلہ میں حقیر ہوتی ہے جو انہوں نے قرض کے طور پر دیا ہوا ہوتا ہے لیکن ان کی اصل آمد ان جائیدادوں کے حصول کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ اس علاقہ کے حاکم ہو جاتے ہیں اور اپنے مقروضوں پر ایک جابر بادشاہ کی طرح حکومت کرتے ہیں۔ یہ تو بھلا کسے توفیق ملے گی کہ وہ اصولی طور پر اس قرضہ کے سلسلہ کی تحقیق کرے مگر میں اس کے متعلق مسٹر تلک جو مشہور مرہٹہ لیڈر گذرے ہیں ان کی وصیت کا ذکر کرتا ہوں جس سے اس ارادہ کا پتہ لگ جائے گا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے حکیم وارثی صاحب کا ایک بیان شائع کیا ہے۔ مسٹر وارثی صاحب تحریک آزادی میں جوش سے حصہ لینے والے تھے اور بطور والنٹیئر تلک صاحب کے مکان پر پہرہ دیتے رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسٹر تلک نے مرتے وقت اپنے ایک دوست سے کہا کہ مسٹر گاندھی کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ:۔

"میری طرح ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جس طرح بھی ہو سکے ہندوستان کی سب جائیدادیں ہندوؤں کے قبضہ میں آ جائیں۔ پھر صرف حکومت کا مسئلہ باقی رہ

جائے گا جس کا حل بالکل آسان ہو گا۔ مقدم بات یہ ہے کہ ملکیت ہندوؤں کے قبضہ میں آجائے۔"

سرکاری ملازمتوں میں بھی یہ سگریگیشن (SEGREGATION) جاری ہے۔ پوری کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان اپنا جائز حق نہ لے سکیں۔ تمام محکمے ہندوؤں سے پُر ہیں۔ ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ مسلمان ملتے نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں نالائق قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ مسلمان عرضی دیتے ہیں تو اسے پھاڑ دیا جاتا ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ کوئی جگہ نہیں۔ اسی دن یا دوسرے دن ہندو آجاتا ہے تو اس کے لئے جگہ نکل آتی ہے۔ ایک معزّز افسر تعلیم نے مجھ سے ذکر کیا کہ ایک مسلمان امیدوارِ ملازمت میرے پاس آیا اور میں نے اسے کہا کہ وہ دفتر میں عرضی دے دے۔ دوسرے دن اس نے مجھے آکر کہا کہ ہیڈ کلرک نے اس پر یہ لکھ کر عرضی واپس کر دی ہے کہ کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی دن یا دوسرے دن اس ہیڈ کلرک نے ایک ہندو کی عرضی میرے سامنے پیش کر دی کہ فلاں جگہ نکلی ہے اس پر اس شخص کو مقرر کیا جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ فلاں مسلمان کی درخواست پر تو تم نے لکھا ہے کہ جگہ نہیں ہے اب اس ہندو کے لئے جگہ کہاں سے نکل آئی۔ تو کھسیانا سا ہو کر کہنے لگا کہ غلطی ہو گئی۔ اس کوشش کے علاوہ کہ مسلمان سروس میں نہ آسکیں ایک منظّم کوشش یہ بھی جاری ہے کہ مسلمان جو سروس میں آچکے ہیں ان کو نکال دیا جائے۔ ہندو سنگھٹن کی ایک غرض یہ بھی تھی۔ چنانچہ سنگھٹن کی تحریک جو ۱۹۲۲ء سے شروع ہوئی اس کے معاً بعد پنجاب کے متعدد مسلمان افسروں کے خلاف مقدمات چلے اور انہیں ملازمتوں سے الگ کیا گیا۔ اور ان سب واقعات کی تہہ میں ہندو سنگھٹن کار فرما تھا۔ اگر کوئی مسلمان مسلمانوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو یا گورنمنٹ کا ساتھ دینے والا ہو تو پھر اس کی شامت ہی آجاتی ہے۔ اگر ایک آزاد کمیشن کے ذریعہ سے تحقیق کرائی جائے تو ناقابلِ تردید ثبوت اس امر کا مل جائے گا کہ اگر کسی مسلمان افسر نے چند مسلمانوں کو ملازمت دلائی ہو خواہ وہ ان کی تعداد کے حق کے لحاظ سے کم ہی کیوں نہ ہو تو اس مسلمان کے خلاف کیا اخبارات میں اور کیا دفاتر میں ایک شور پڑ جاتا ہے اور خفیہ شکایات کی بھی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں رہتی۔ انہی چند ماہ میں احمدی چونکہ کانگریس کا مقابلہ کرتے رہے ہیں ہندوؤں کے ایک منظّم پروپیگنڈا کے ذریعہ سے انہیں تکلیف پہنچائی جا رہی ہے۔ حال میں پنجاب کی ایک نہر کے ایک ڈپٹی کلکٹر اور ایک اسسٹنٹ انجنیئر کو

ان کے ہندو آفیسر نے سزائیں دلوائی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الزام محکمانہ لگائے گئے ہیں لیکن ہر ایک شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ پندرہ بیس سالہ سروس کے بعد ایک ہی محکمہ میں ایک جماعت کے دو معزّز افسر جو کانگریس کے پروپیگنڈا کی مخالفت کر رہے تھے ایک ہی ہندو افسر کے ذریعہ سے جو کانگریس کا مؤیّد ہے نالائق قرار پا جاتے ہیں تو ضرور اس میں کوئی بات ہوگی۔ آخر وجہ کیا ہے کہ ایک ہی کمیونٹی (COMMUNITY) کے دو افسر گرفت میں آجاتے ہیں اور ایک ہی وقت میں گرفت میں آتے ہیں حالانکہ اس سے پہلے اپنی سروس کے لمبے عرصہ میں وہ ترقیات حاصل کرتے چلے آئے تھے اور محکمہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ یہ نتیجہ غلط نکالا گیا ہے ہندوؤں کی مقررہ پالیسی یہ نہیں ہو سکتی اس لئے میں اس وقت ہندوؤں کے مشہور لیڈر بھائی پرمانند ایم۔ اے کی شہادت اس بارہ میں پیش کرتا ہوں۔ وہ ہندوستان کی مختلف رنگ میں خدمت کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ہندو گورنمنٹ سروس میں ہیں۔ ان کا نقطہ نگاہ یہ بیان کرتے ہیں۔

"سرکاری مہربانی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں اور کچھ سرکاری عہدے اپنے ہاتھ میں رکھیں اور سرکار کے ساتھ مل کر پہلے مسلمانوں کو کمزور کریں اور ہندوؤں کی طاقت بڑھالیں۔ جب اس طرح طاقت بڑھ جائے گی تو پھر سوَراج حاصل کرنے کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے۔"[۱۸]

یہ اس شخص کا بیان ہے جس نے لالہ لاجپت رائے کی زندگی کے آخری ایام میں ان سے بھی زیادہ ہندو قوم میں رسوخ اور طاقت پیدا کرلی تھی۔ تمدنی طور پر جو مسلمانوں کا بائیکاٹ ہو رہا ہے وہ بھی کم شدید نہیں۔ مسلمان ہندوؤں کو ملازم رکھتے ہیں لیکن ہندو مسلمان کو بہت ہی کم ملازمت دیتا ہے اور جب دیتا ہے تو صرف اپنے مطلب اور فائدہ کیلئے دیتا ہے۔ باجہ اور گائے کے سوال کو ایک عظیم الشان جھگڑے کا موجب بنایا ہوا ہے۔ وید کے زمانہ کے ہندو خود گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے اور قربانیاں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ رگوید اور اتھروید سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اتھروید کانڈ ۹۔ سوکت ۳ کے نویں منتر میں لکھا ہے کہ:۔

"اہل خانہ گائے کا شیریں دودھ اور لذیذ گوشت مہمان کو کھلائے بغیر نہ کھائے۔"

پنڈت ابناس چندر داس ایم۔ اے لکھتے ہیں:۔

"قدیم آریوں کے ہاں گائے کے گوشت کھانے کی شہادت پائی جاتی ہے۔ لیکن دودھ نہ دینے والی گائیں شاذو نادر ہی ماری جاتی تھیں۔"[۱۹]

ہندوؤں میں قربانی کا اس قدر رواج تھا کہ بدھ حکومتوں کے خلاف بغاوت کی وجہ یہ قرار دی گئی تھی کہ انہوں نے قربانی کو روک دیا تھا۔ چنانچہ مہامہوپادھیائے پنڈت ہرپرشاد شاستری لکھتے ہیں:۔

"اس (اشوک کی ریاست کے خلاف ہندوؤں کی بغاوت) کا سبب جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے یہ تھا کہ اشوک نے اپنی حکومت میں جانوروں کی قربانی بند کر دی تھی۔ مگر پشیہ پتر نے تخت پر بیٹھتے ہی دارالخلافہ میں اشومیدھ یگیہ کیا۔" (جانور کی قربانی کی عبادت گزاری)[۲۰]

اب یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ بدھوں کے زمانہ میں تو قربانی روکنے کو بغاوت کا ذریعہ بنایا گیا تھا اور اس زمانہ میں قربانی کی اجازت کو جنگ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یقیناً مسلمانوں کے آخری زمانہ میں عوام الناس کو بھڑکانے کے لئے یہ ایک تدبیر ایجاد کی گئی تھی اور اسے ترقی دیتے دیتے اب ایک قومی خیال بنالیا گیا ہے۔ گائے کے متعلق ہندو قوم کا ظلم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ کوئی صوبہ ایسا نہیں جس میں گائے کی وجہ سے خون ریزی نہ ہو چکی ہو اور کوئی سال نہیں گزرتا کہ جس میں گائے کی قربانی کی وجہ سے فساد نہ ہو جاتا ہو حالانکہ مسلمان اپنے لئے گائے قربان کرتے ہیں اور خود کھاتے ہیں' ہندوؤں کو اس سے کیا تعلق۔ اور اس ظلم پر مزید برآں یہ بات ہے کہ ان فسادات پر ہندو قوم فساد کرنے والوں کو ڈانٹتی نہیں بلکہ ان کے لئے عُذر تلاش کرتی ہے۔ پچھلے دس سال میں جس قدر فساد ہوئے ہیں ان کی اگر لسٹ بنائی جائے تو نوّے فیصدی فسادوں کی بنیاد ہندوؤں کی طرف سے ثابت ہوگی۔ اور پھر ساتھ ہی یہ عجیب بات ثابت ہوگی کہ جو فساد مسلمانوں کی غلطی سے ہوئے ہیں ان پر مسلمانوں نے اپنی قوم کو بڑی سختی سے ڈانٹا ہے لیکن وہ نوے فیصدی فساد جو ہندوؤں کی طرف سے ہوئے ہیں ان پر ہندو قوم اور ہندو پریس نے یا تو الزام مسلمانوں پر لگانے کی کوشش کی ہے اور یا پھر فسادیوں کی تائید میں عُذر تلاش کرنے لگ گئے ہیں۔ اب ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ ڈیماکریسی جس کا پہلا اصل یہ ہے کہ دوسرے کے فعل میں دست اندازی نہ کی جائے' وہ اور یہ طریق عمل کسی صورت میں یکجا نہیں رہ سکتے۔

جہاں جہاں ہندوؤں کا زور ہے وہاں میونسپل قواعد ایسے بنائے گئے ہیں کہ گائے کا ذبیحہ بند ہو جائے، گورنمنٹ بھی مذبحوں کے کھولنے میں رُکاوٹ ڈالتی ہے۔ جہاں چھاؤنی ہو وہاں تو فوجیوں کے لئے گائے کا گوشت مہیا کرنے کے لئے خود سرکاری طور پر انتظام کیا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کی ضرورت کو فساد کا موجب سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی علاقہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی ناقابل برداشت ہے مگر ہندو ریاستوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ تو انتہاء سے بڑھا ہوا ہے اور اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستان میں آزاد حکومت ہوئی تو ہندو اس بارے میں مسلمانوں سے کیا سلوک کریں گے۔ کشمیر جس میں پچانوے فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے اس میں گائے ذبح کرنے پر کہتے ہیں کہ سات سال قید کی سزا مقرر ہے۔ اس کا الزام موجودہ مہاراجہ صاحب پر نہیں وہ ایسے والد کے بیٹے ہیں کہ جن کو اسلام سے اُنس تھا۔ وہ سلسلہ احمدیہ کے پہلے خلیفہ سے جب کہ وہ کشمیر میں شاہی طبیب تھے خاص اُنس رکھتے تھے اور انہیں بھائیوں کی طرح جانتے تھے۔ بلکہ ان کے والد کے تعلق کی وجہ سے ہی انہیں کشمیر چھوڑنا پڑا۔ پس میں انہیں خاص محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بے تعصّب حکمران بننے کی توفیق دے گا اور وہ دوسرے ہندو راجوں کے لئے ایک عمدہ مثال قائم کریں گے۔ دوسری ریاستوں کا حال بھی کم خراب نہیں۔ ایک اعلیٰ انگریز پولیٹیکل افسر کی روایت ہے کہ میں ایک ریاست میں ریذیڈنٹ تھا۔ وہاں مسلمانوں نے گائے ذبح کر دی ان لوگوں سے ایک لاکھ روپیہ ریاست نے لے کر چھوڑا لیکن دوسرے ہی دن ایک بچہ کا قتل ہو گیا تو پچیس روپیہ پر معاملہ کو دبا دیا گیا وہ کہتے ہیں جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ریاست والوں کو ملامت کی۔

اس سے بھی بڑھ کر اب یہ ظلم ہو رہا ہے کہ بعض ہندو ریاستوں میں تبلیغِ اسلام کو بالکل روک دیا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ کوئی شخص عدالت میں حاضر ہوئے بغیر مذہب نہیں بدل سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہندو ہونا چاہے تو اسے فوراً اجازت مل جاتی ہے لیکن اگر ہندو مسلمان ہونا چاہے تو بڑی لمبی تحقیقات ہوتی ہے۔ ان اشخاص کے نام دریافت کئے جاتے ہیں جنہوں نے اسے تبلیغ کی تھی۔ پھر انہیں بھی دق کیا جاتا ہے اور اس مسلمان ہونے کے خواہشمند کو بھی تکلیف دی جاتی ہے اور بعض دفعہ جھوٹے الزام لگا کر قید کر دیا جاتا ہے اور یہاں تک تنگ کیا جاتا ہے کہ اس کی نظروں میں دنیا تاریک ہو جاتی ہے اور یوں

نظر آتا ہے کہ گویا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اس ملک میں خدا تعالیٰ کی بادشاہت نہیں ہے اور یا تو وہ شخص اس علاقہ کو چھوڑ دیتا ہے یا پھر ڈر کر اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔

یہی ظلم مہذب دنیا کو حیران کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن بعض جگہ ظلم اس سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں یو۔پی میں ہندوؤں نے کمزور مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوشش شروع کی تو ایک ہندو ریاست جو اس علاقہ کے ساتھ تھی وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے خود کھڑے ہو کر اپنے سامنے ایک گاؤں کے لوگوں کو جبراً شُدھ کیا۔ ایک بوڑھی عورت جیا نامی (میں نے اس کا نام اس لئے لکھ دیا ہے تا آئندہ نسلوں میں اس کی یاد قائم رہے) ایسی تھی جس نے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ میں مذہب کو ہرگز قربان نہیں کروں گی۔ اسے طرح طرح سے دکھ دیا گیا لیکن وہ ساٹھ سالہ بڑھیا اپنے ایمان پر ثابت قدم رہی بلکہ ایک بڑی میٹنگ جو اس کی قوم نے شُدھی کے متعلق غور کرنے کے لئے انگریزی علاقہ میں منعقد کی تھی' اس میں وہ کھڑی ہو گئی اور اس نے بڑے زور سے اعلان کیا کہ میں اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا پسند کروں گی لیکن اسلام کو نہیں چھوڑوں گی۔ اگر تم مردوں نے اس ظلم کا مقابلہ نہ کیا تو ہم عورتیں اس کا مقابلہ کریں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس عورت کو پانی سے روک دیا گیا' اس کے کھیتوں کو کاٹنے سے روکا گیا' میں نے جب یہ واقعات سنے تو اپنی جماعت کے تعلیم یافتہ آدمیوں کو بھیجا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے کھیت کاٹیں اور چونکہ اس کو رہائش کی بھی تکلیف تھی اس کے لئے ایک مکان بنوا دیا اور اس غرض سے وہاں مبلّغ بھیجے کہ ان لوگوں کو ڈھارس دیں اور اسلام کی طرف واپس لائیں لیکن ریاست نے جھٹ قانون بنا دیا کہ کوئی انگریزی علاقہ کا آدمی اس علاقہ میں رات کو نہ رہے۔ اس پر ہمارے مبلّغ انگریزی علاقہ میں خیمے لگا کر رہنے لگے۔ صبح کو وہ وہاں سے چلے جاتے تھے اور شام کو واپس آ جاتے تھے۔ شدید گرمی میں ناقابل برداشت تکالیف اٹھا کر انہوں نے اس ظلم کا مقابلہ کیا...... لیکن حکومت برطانیہ کے دفاتر نے باوجود توجہ دلانے کے کوئی توجہ نہ کی کیونکہ ان کے خیال میں ریاستیں آزاد ہیں۔ جب کہ ریاستوں کے بارہ میں اس وقت ان کا یہ حال ہے تو کون امید کر سکتا ہے کہ آئینی گورنر آزاد صوبہ جات کے معاملات میں مسلمانوں کی خاطر دخل دے گا پس یہ حفاظتی تدبیر ہمیں کب تسلی دے سکتی ہے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ متعصّبانہ خیالات صرف بعض لوگوں کے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ ہندو قوم بدقسمتی سے بہ حیثیت قوم اس مرض میں مبتلا ہو چکی ہے اور صرف ایک قلیل تعداد

اس مرض سے بچی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس وقت شہادت کے طور پر میں خود مسٹر گاندھی کو پیش کرتا ہوں۔ مسٹر گاندھی نے ۱۹۱۸ء میں ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا۔

"یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یورپین کے لئے گاؤ کُشی جاری رہنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں ہے جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤ کُشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ اور ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں' اس کی روح کے سراسر خلاف عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤ کُشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے اِغماض نہ کرے گا۔"[۲۱]

مسٹر گاندھی کے اس بیان کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جذبہ تعصب صرف چند جاہل افراد میں ہے اور اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔

ہندوؤں کے آئندہ ارادے اقلیت کے متعلق

اس امر کے ثابت کرنے کے بعد کہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کے لئے اکثریت نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے جس کی موجودگی میں صرف ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو حفاظت کا ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ہندوؤں کے آئندہ ارادے اقلیت کے متعلق کیا ہیں کیونکہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ ایک اکثریت پہلے سے ارادہ کر کے آزادی کے حصول کو اقلیت کی ہر محبوب چیز کے قربان کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے تو یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اس کا نقطہ نگاہ کسی قریب کے مستقبل میں بدل جائے گا۔

انگریزی حکومت سے وفاداری کا مسلمانوں کو کیا صلہ ملے گا

ہندوؤں کے مشہور قومی لیکچرار ستیہ دیو صاحب اپنے ایک لیکچر میں بیان کرتے ہیں:۔

"میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل اگر وہ قوم پرست نہ بنیں بڑے خطرہ میں رہے گا۔ ہندوستان کے مسلمان اگر اپنے مذہبی........ دیوانہ پن میں ڈوبے رہے (یعنی ہندو نہ ہو گئے) تو ان کا کام صرف بدیشی گورنمنٹ کی مدد کر کے ہندوستان

کو غلام رکھنا رہ جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کسی آزادی کے موقع پر ملک کے سب لوگ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی ہستی بڑے خطرے میں پڑ جائے گی۔ مسلمانوں کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ قوم پرستی کا ہے۔" [۲۲]

اس اعلان کے الفاظ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو صرف اسلام کے مجرم کی ہی سزا نہیں ملے گی بلکہ انگریزی حکومت سے تعاون کی بھی سزا ملے گی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ اروِن (LORD IRWIN) اور مسٹر بن (MR. BEN) نے جو پچھلے دنوں مسلمانوں کی وفاداری کے متواتر اعلان کئے ہیں اس میں انہوں نے مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں کی بلکہ مذکورہ بالا اعلان کی موجودگی میں ان کے موت کے وارنٹ (WARRANT) پر دستخط کئے ہیں۔

مسلمان کن شرائط پر ہندوستان میں رہ سکیں گے

یہی ملکی خادم ساگر صوبہ سی۔ پی میں اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کرتا ہے:۔

"ہندوؤ! سنگھٹن کرو اور مضبوط بنو اس دنیا میں طاقت ہی کی پوجا ہوتی ہے۔ اور جب تم مضبوط بن جاؤ گے تو یہی مسلمان خود بخود تمہارے قدموں پر اپنا سر جھکا دیں گے۔" "جب ہم ہندو سنگھٹن کے ذریعہ سے خاطر خواہ طور پر مضبوط ہو جائیں گے۔ تو مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط پیش کریں گے۔ (۱)۔ قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھنا چاہئے ...... (۲)۔ حضرت محمد کو رسول خدا نہ کہا جائے۔ (۳) عرب وغیرہ کا خیال دل سے دور کر دینا چاہئے۔ (۴) سعدی و رومی کی بجائے کبیر و تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔ (۵) اسلامی تہواروں اور تعطیلوں کی بجائے ہندو تہوار تعطیلات منائی جائیں۔ (۶) مسلمانوں کو رام و کرشن وغیرہ دیوتاؤں کے تہوار منانے چاہئیں۔ (۷) انہیں اسلامی نام بھی چھوڑ دینے چاہئیں اور ان کی جگہ رام دین' کرشن خاں وغیرہ نام رکھنے چاہئیں۔ (۸) عربی کی بجائے تمام عبادتیں ہندی میں کی جائیں۔" [۲۳]

پھر یہی صاحب فرماتے ہیں:۔

"بھارت ورش کی قومی زبان ہے سنسکرت۔ عربی اور فارسی کو مَیں

بھارت ورش سے باہر کر دینا چاہتا ہوں۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ہندو سَوَراج میں مسلمانوں سے یہ سلوک کرنا چاہتے ہیں کہ ان سے ان کا مذہب' ان کا تمدن اور ان کی زبان اور ان کے نام تک چُھڑوانا چاہتے ہیں۔

شاید کوئی کہے کہ ستیہ دیو گو کتنے ہی بڑے آدمی ہوں لیکن ہندو قوم کے چوٹی کے لیڈر نہیں اس لئے میں چند چوٹی کے لیڈروں کے حوالہ جات نقل کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مونجے جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (ROUND TABLE CONFERENCE) کے نمائندے مقرر ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو یوں نصیحت کرتے ہیں۔

"ہندو اگر سنگھٹ ہو جائیں تو انگریزوں اور ان کے مسلمان پٹھوؤں کو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر نیچا دکھا کر سوراج حاصل کر سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کی تجاویز فورٹین ڈیمانڈز آف مُسلمز (FOURTEEN DEMONDS OF MUSLIMS) منتقانہ مقابلہ کی دھمکی دے رہی ہیں جن کی ہندوؤں کو کچھ پرواہ نہیں۔ ہندوؤں کو یہ پرانا خیال دل سے نکال دینا چاہئے کہ مسلمانوں کی مدد کے بغیر سَوَراج حاصل ہونا محال ہے۔"

ڈاکٹر مونجے صاف لفظوں میں ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو ان کا حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے زور سے انگریزوں اور مسلمانوں دونوں کو درست کر کے رکھ دیں گے اور مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ جن لوگوں کا شروع میں یہ حال ہے ان کا انجام کیا ہو گا؟

ایک اور ہندو لیڈر لالہ ہردیال ایم۔ اے جن سے یورپ و امریکہ کے لوگ خوب واقف ہیں لکھتے ہیں۔

"جب انگلستان کچھ عرصہ بعد ہوم رول (HOME RULE) یعنی ۷۵ فی صدی سَوَراجیہ ہمیں پیش کرے تو وہ ہندو قومی دل کے ساتھ عہد و پیمان کرے۔"[۲۴]

پھر یہی صاحب لکھتے ہیں:۔

"ہندو سنگھٹن کا آدرش یہ ہے کہ ہندو قومی سنتھاؤں انسٹی چیوشنز (INSUITUTIONS) کی بنیادوں پر ہندو قومی ریاست قائم کی جائے۔ ہندو قومی

سنتھائیں یہ ہیں۔ مثلاً سنسکرت بھاشا، ہندی بھاشا، ہندو قوم کا اتہاس، ہندو تہوار، ہندو مہاپرشوں کا سمرن، ہندوؤں کے دیش بھارت یا ہندوؤں کے ستھان کا پریم، ہندو قوم کے ساہتیہ کا پریم وغیرہ وغیرہ۔ پھر جو لوگ آج کل کے نیم عربی، نیم ایرانی مسلمانوں کو قومی تحریک میں خواہ مخواہ شامل کرنا چاہتے ہیں وہ اس صداقت کو نہیں سمجھتے کہ ہر ایک قومی ریاست پرانی قومی سنتھاؤں پر قائم کی جاتی ہے جن سے لوگوں میں یگانگت کا بھاؤ پیدا ہوتا ہے۔"[۲۵]

پھر یہی صاحب لکھتے ہیں:۔

"جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے سوراجیہ لینے کا وقت قریب آئے گا۔ تو ہماری جو نیتی (پالیسی) عیسائیوں اور مسلمانوں کی طرف ہوگی اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت باہمی سمجھوتہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہندو مہاسبھا صرف اپنے فیصلہ کا اعلان کرے گی کہ نئی ہندو ریاست میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے کیا فرائض اور حقوق ہونگے اور ان کی شدھی کی کیا شرائط ہونگی۔"[۲۶]

اسی طرح یہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"سوراج پارٹی کا اصول ہونا چاہئے کہ ہر ہندوستانی بچہ کو قومی رتن دیئے جائیں خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی۔ اگر کوئی فرقہ ان کے لینے سے انکار کرے اور ملک میں دورنگی پھیلائے تو اس کی قانونی طور پر ممانعت کر دی جائے۔ یا اس کو عرب کے ریگستان میں کھجوریں کھانے کے لئے بھیج دیا جائے۔ ہمارے ہندوستان کے آم کیلے اور نارنگیاں کھانے کا انہیں کوئی حق نہیں۔"[۲۷]

یہی لالہ ہردیال صاحب ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:۔

"میں کہتا ہوں کہ ہندو قوم اور ہندوستان اور پنجاب کا مستقبل ان چار آدرشوں (نصب العین) پر منحصر ہے۔ یعنی (۱) ہندو سنگھٹن (۲) ہندو راج (۳) اسلام اور عیسائیت کی شدھی (۴) افغانستان اور سرحد کی فتح اور شُدھی۔"

"اگر ہندوؤں کو اپنی رکھشا کرنی منظور ہے تو خود ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سردار ہری سنگھ نلوہ کی یادگار میں افغانستان اور سرحد کو فتح کر کے تمام پہاڑی قبیلوں کی شدھی کرنی ہوگی۔ اگر ہندو اس فرض سے غافل

رہیں گے تو پھر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم ہو جائے گی۔"۲۸؎

پھر یہی صاحب فرماتے ہیں:۔

"جب تک پنجاب اور ہندوستان بدیشی مذہبوں (یعنی عیسائیت اور اسلام) سے پاک نہ ہوگا تب تک ہمیں چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش (مقصد) کو نہیں مانتا وہ کپوت ہے' بے جان ہے' مُردہ دل ہے' بے سمجھ ہے' ہر سچے ہندو کی یہ خواہش ہونی چاہئے کہ اپنے دیش کو اسلام اور عیسائیت سے پاک کر دے۔"۲۹؎

مہاشہ کرشن ورنیکلر پریس (VERNACULAR PRESS) کے سب سے بڑے مالکوں میں سے ہیں۔ اور آریہ پرتی ندہبی سبھا کے اہم ترین ممبروں میں سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اب وقت دور نہیں سمجھنا چاہئے جب کہ یہ اسلام ہمیشہ کے لئے سرزمینِ ہند سے غائب ہو جائے گا اور جو شخص خواہ وہ مہاتما گاندھی بھی کیوں نہ ہو۔ ایسے اسلام کی اشاعت یا ڈیفنس (DEFENCE) میں بالواسطہ یا غیرواسطہ مدد دے گا وہ ملک اور سَوراجیہ کا دشمن سمجھا جائے گا اور کوئی سچا ہندو ایسے اشخاص کے ساتھ اپنا کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔"

"سب سے پہلے آپ کا یہ فرض ہوگا کہ ایسے اسلام کو ہمیشہ کے لئے گنگاجی کے سپرد کر دو......... جب تک مسلمان تبلیغ کو ہندوستان کے اندر سے بند نہیں کریں گے دونوں قوموں میں اتحاد نہیں ہوگا اور جو لوگ وید بھگوان اور رام کرشن کا نام مٹا کر عرب کے ریگستان کی تہذیب اور حضرت محمد کا نام سرزمین ورت میں پھیلانا چاہتے ہیں ان کے ساتھ ہندوؤں کا اتحاد کبھی نہیں ہو سکتا۔"۳۰؎

پروفیسر رام دیو جو آریہ سماج کے بڑے لیڈر اور ان کے مرکزی کالج کے پرنسپل رہے ہیں اور بعد میں سیاسی کاموں میں پڑ گئے لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔"۳۱؎

یہی صاحب آریہ سماج کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرما چکے ہیں:۔

"اسی طرح اب ایک زمانہ آنے والا ہے کہ تمام مسجدیں آریہ مندر بنائے

جائیں گے اور ان میں ہون ہوا کریں گے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ جب دہلی کی جامع مسجد آجائے گی۔ ہم کیا کریں گے۔ ہم تمام ہندوستان کے آریہ نہیں بلکہ تمام دنیا کے آریہ جمع ہو کر ایک کانفرنس کیا کریں گے۔"

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ ایم۔ایل۔سی لاہور ہائی کورٹ کی بار کے پریزیڈنٹ جو سائمن کمیشن کی پنجاب کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی شرم نہیں آتی کہ اگر آپ کے ایک ہندو بھائی کو مسلمان بنانے میں آپ کسی کو روکتے نہیں اور وہ باز نہیں آتا تو بہتر ہے کہ آپ وہاں کٹ کر مرجائیں۔"[۳۲]

یہ تو انگریزی علاقہ کے لوگوں کا حال ہے۔ اب ریاستوں کا حال دیکھیں۔ سر والٹر لارنس (SIR WALTER LAWRENCE) اپنی کتاب INDIA WHICH WE SERVED (انڈیا جس کی ہم نے خدمت کی) میں لکھتے ہیں کہ:۔

لارڈ کرزن (LORD CURZON) نے میری دعوت کا انتظام کیا تھا۔ جنرل سر پرتاب سنگھ بہادر برادر مہاراجہ صاحب جودھ پور میرے بڑے دوست تھے۔ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے کہ "میرا مقصد یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو ہندوستان میں فنا کردوں۔" میں نے ان کے اس تعصّب کی مذمت کی اور ان کے اور اپنے مسلمان دوستوں کا ذکر کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "ہاں میں بھی انہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے زیادہ اچھا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرجائیں۔"[۳۳]

ان حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حصہ ہندو لیڈروں کا خواہ انگریزی علاقہ کے ہوں یا ریاستوں کے (۱) مسلمانوں سے شدید تعصب رکھتے ہیں۔ (۲) وہ علی الاعلان یہ ارادہ ظاہر کر چکے ہیں کہ اگر ان کو طاقت حاصل ہوئی تو وہ مسلمانوں کو ہلاک کر دیں گے (۳) وہ ہندوستان میں صرف ہندو راج قائم کریں گے۔ (۴) عیسائیوں اور مسلمانوں سے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق ان کو ہندوستان میں رہنے کی اجازت دیں گے۔ اور اس اجازت کے ساتھ یہ شرط ہوگی کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو ہو جائیں۔ (۵) وہ مسلمانوں کی زبان کو مٹا دیں گے۔ (٦) وہ اقلیتوں کے تہواروں کو قانوناً ناجائز کر دیں

گے۔ (۷) ان کی عبادتوں کو بدلائیں گے۔ (۸) گائے کے ذبیحہ کو بزور شمشیر روک دیں گے۔ (۹) تبلیغ کو ناجائز کر دیں گے۔ (۱۰) اگر کوئی ہندو اقلیت کے مذہب کو قبول کرنے لگے گا تو ہندو اس سے روکیں گے لیکن اگر وہ باز نہ آیا تو ہندو کٹ کر مر جائیں گے۔ (۱۱) افغانستان اور سرحد کو فتح کر کے انہیں شدھ کر لیا جائے گا۔ (۱۲) مسلمانوں کی مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ (۱۳) مسلمانوں کے اسلامی نام تک بدل دیئے جائیں گے۔ (۱۴) جو لوگ ہندو زبان' ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اور ہندو تہوار اختیار کرنے کو تیار نہ ہوں گے انہیں ہندوستان سے نکال دیا جائے گا۔ (۱۵) اگر کوئی شخص خواہ مہاتما گاندھی ہی کیوں نہ ہوں اسلام اور مسلمانوں سے نرمی کی تعلیم دے گا تو اس کا بھی ہندو بائیکاٹ کر دیں گے۔

یہ ارادے ہیں جو سوراج کے قیام پر ہندو مسلمانوں کے متعلق خصوصاً اور دوسری اقلیتوں کے متعلق عموماً رکھتے ہیں۔ جو ان کا موجودہ سلوک ہے اس کا ذکر پہلے کر آیا ہوں۔ کیا ان کی موجودگی میں کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اقلیتوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے یا یہ کہ ایسا مطالبہ ڈیماکریسی (DEMOCRACY) کے اصول کے خلاف ہے۔ کیا اس قدر سخت سلوک اور اس قدر خطرناک ارادوں کی موجودگی میں دنیا کی کسی اور اقلیت نے بھی اس قدر نرم مطالبے کیے ہیں جس قدر کہ مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوتے ہیں؟

میں اس جگہ یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ہرگز یہ نہیں سمجھتا کہ سب کے سب ہندو مذکورہ بالا خیالات میں مبتلا ہیں۔ ان میں یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ان خیالات کو اسی طرح حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جس طرح اقلیتوں کے لوگ۔ چنانچہ بعض ہندو صاحبان نے ان خیالات کے خلاف اظہارِ نفرت کیا بھی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ طبقہ بہت تھوڑا اور دوسرے گروہ کے مقابلہ میں کم اثر رکھنے والا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا آجائے کہ ہندوؤں کے دل سے تعصّب اور کینہ نکل جائے اور وہ اپنے اس مرض سے صحت پا جائیں جس کی وجہ سے اپنی قوم کے سوا ہر قوم انہیں گردن زدنی نظر آتی ہے۔ لیکن جب تک وہ دن آئے اس وقت تک نہایت ضروری ہے کہ اقلیتوں کی حفاظت کا کوئی سامان ہو۔

باب ششم

اقلیتوں کی حفاظت کی تدابیر کے اصول

سائمن کمیشن نے اس اختلاف کو تسلیم کیا ہے جو اکثریت اور اقلیت میں ہے لیکن بوجہ غیر ملکی ہونے کے وہ لوگ اس کی پوری کیفیت کو معلوم نہیں کر سکے اور اسی وجہ سے وہ اس کا صحیح علاج تجویز کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انہوں نے اختصار کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو جھگڑے کا جو گائے اور باجہ کے متعلق ہوتا ہے ذکر کیا ہے لیکن وہ یہ معلوم نہیں کر سکے کہ یہاں صرف گائے کا سوال نہیں بلکہ اُس اقتصادی اور تمدنی بائیکاٹ کا سوال ہے جو عرصہ دراز سے ہندو مسلمانوں کا کرتے چلے آئے ہیں۔ کمیشن کو اس اختلاف کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی کیونکہ اس کے اہم فرائض میں سے ایک یہ فرض بھی تھا کہ وہ ایسے قوانین تجویز کرے جو اس اختلاف کے بُرے نتیجوں سے دونوں قوموں کو محفوظ رکھیں۔ لیکن جب تک اختلاف کی حقیقت اور اس کی گہرائی کو اہل کمیشن معلوم نہ کرتے وہ علاج کس طرح تجویز کر سکتے تھے۔ انہوں نے صرف گائے اور باجے کے سوال کو لے لیا اور اس پر غور نہیں کیا کہ گائے کا سوال ہندو سنگھٹن کی تدابیر میں سے ایک تدبیر ہے اور یہ کہ اس سوال نے موجودہ صورت صرف اسلامی حکومت کے آخری ایام میں اختیار کی ہے بلکہ اب تک بھی بعض ہندو اقوام ہندوستان میں ایسی موجود ہیں جو گائے کا گوشت کھالیتی ہیں گو اس سیاسی ایجی ٹیشن کی وجہ سے ان کی تعداد کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ کمیشن کو اس منظم بائیکاٹ کی حقیقت کو معلوم کرنا چاہئے تھا جو مسلمانوں کا ہر شُعبہ زندگی میں کیا جارہا ہے۔ کیا تجارت اور کیا تمدن اور کیا ملازمت اور کیا اقتصادیات ایک بھی تو شُعبہ ایسا نہیں جس میں مسلمانوں کو مذہب یا حفظانِ صحت یا اقتصاد کے نام سے نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔

پس اصل غرض سیاسی برتری کا حصول ہے۔ گائے کے سوال کو ہی لے لو۔ اگر تو صرف

جہلاء کا معاملہ ہوتا تو ہم کہتے کہ بوجہ گائے کو پوجنے کے انہیں جوش آجاتا ہے لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سوال میں ویسے ہی جوش سے حصہ لیتے ہیں جس طرح کہ جہلاء اور ایسے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس موقع پر جوش میں آجاتے ہیں جو گائے کے کھانے سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔

اس وقت سیاسی تحریک کی باگ ڈور زیادہ تر غیر ممالک میں تعلیم پانے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور یورپین لوگ اس امر کو خوب جانتے ہیں کہ جس وقت یہ لوگ یورپ میں آتے ہیں تو ان میں سے اکثر بلکہ نوے فیصدی سے زیادہ گائے کا گوشت خوب کھاتے ہیں۔ میں نے جب ۱۹۲۴ء میں ولایت کا سفر کیا تو میرے ایک سیکرٹری صاحب نے یہ دیکھ کر کہ ویٹر (WAITER) ہمیشہ سؤر کا گوشت ہی سامنے لاتا ہے اور واپس کرنے پر بہت حیران ہوتا ہے۔ اسے سمجھایا کہ ہم لوگ مسلمان ہیں ہمارے سامنے سؤر کا گوشت پیش ہی نہ کیا کرو۔ ان کے ساتھ ایک ہندو صاحب بیٹھا کرتے تھے اور ہندو مذہب کے متعلق خوب بحثیں کیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی کہہ دیا کہ یہ صاحب گائے کا گوشت نہیں کھاتے ان کے سامنے گائے کا گوشت نہ لایا کرو۔ وہ صاحب اس وقت تو خاموش ہو رہے لیکن ایک دو دن میں ہی اس محرومی کی تاب نہ لا سکے اور صاف کہہ دیا کہ میں اپنے کھانے کے متعلق خود ہدایت دے لوں گا آپ کو اس سے کچھ تعلق نہیں اور پھر بڑے شوق سے گائے کا گوشت منگوا کر کھانے لگ گئے۔ لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جس وقت یہ لوگ ہندوستان آتے ہیں تو گائے کے سوال پر سب سے زیادہ شور مچاتے ہیں۔ میں انسانی کمزوری کو تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ کیسی انسانی کمزوری ہے کہ جس فعل کا انسان خود مرتکب ہوتا ہے اس کے ارتکاب پر دوسرے انسان کا خون بہانا بھی جائز قرار دیتا ہے۔ اسی طرح آریہ سماج جو اپنے آپ کو موحّد قرار دیتی ہے وہ گائے کے معاملہ میں سب ہندوؤں سے بڑھ کر حصہ لیتی ہے اور جب اس پر اس فعل کی حماقت ظاہر کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتی ہے کہ یہ سوال اقتصادی سوال ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ پنجاب میں زمیندارہ تو زیادہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور ہندو شہری لوگ ہوں جن پر زمیندار کی مشکلات کا اثر سب سے کم پڑتا ہے لیکن سب سے زیادہ اس اقتصادی مسئلہ کے لئے جوش انہیں کو آتا ہے۔ اور پھر کون عقلمند اس امر کو تسلیم کرے گا کہ ایک گائے کا ذبح کرنا تو ملک کے اقتصادیات پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے لیکن اس کے بدلہ میں آدمیوں کو قتل کر دینا ملک کی اقتصادی حالت کو

کوئی نقصان نہیں پہنچاتا؟

غرض یہ عُذر بالکل نامعقول ہے اور اصل بات یہی ہے کہ گائے کے سوال کو قوم کے جمع کرنے کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس وجہ سے موحّد اور گائے خور بھی اس امر پر جمع ہو جاتے ہیں بلکہ گائے خور اور موحّد اس معاملہ میں دوسروں سے آگے رہتے ہیں اور گائے کی عبادت کرنے والوں کو بھڑکانے کا اصل موجب وہی ہوتے ہیں۔

اگر کمیشن اس حقیقت کو معلوم کرتا تو وہ کبھی ہندو مسلم سوال کو اس سرسری نگاہ سے نہ دیکھتا جس سے کہ اس نے دیکھا ہے اور کبھی ان حفاظتی تدابیر کو جو اس اختلاف کے خطرناک نتائج سے بچنے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے پیش ہو رہی ہیں۔ اس طرح بغیر کافی توجہ دینے کے چھوڑ نہ دیتا۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اقلیتوں اور اکثریت کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں ان اصول کو مدنظر رکھنا چاہئے جو حکومت کے قیام کا باعث ہوتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں حکومت کا اصل مقصد یہ ہے:۔

۱ افراد کو ایک دوسرے کے حقوق میں دخل اندازی سے روکنا۔

۲ افراد اور جماعت اور ملک کو حکومت سے باہر کے لوگوں کی دست اندازی سے بچانا اور ان پر دست اندازی کرنے سے روکنا۔

۳ ایسے ذرائع اختیار کرنا جو ملک کی مجموعی ترقی کا موجب ہوں۔

۴ ان ذرائع کی تکمیل کیلئے ملک سے **بحصّہ** رسدی بِلاواسطہ یا بالواسطہ ٹیکس وصول کرنا۔

۵ ایسا انتظام کرنا کہ افراد یا حکومت کے خلاف قانون توڑنے والوں کے جرم کی صحیح طور پر اور انصاف سے تشخیص اور تعیین کی جا سکے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ حکومت کی غرض یہ ہے کہ وہ افراد کے فائدے کیلئے (۱) قانون سازی کرے۔ (۲) قانون کا نفاذ کرے۔ (۳) قانون شکن کی ذمہ واری کی تعیین کر کے اسے سزا دے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ حکومت کی غرض عدل و انصاف سے کام کرنے والی (۱) لیجسلیٹو (۲) ایگزیکٹو (۳) اور قضاء کا قیام ہے۔

اس کے سِوا حقیقی حکومت کی غرض اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ حقیقی حکومت وہ ہے جو افراد کی مرضی سے قائم ہو اور کونسا فرد ہے جو یہ کہے گا کہ ایسی حکومت قائم کرو جو میرے

حقوق کو قانون سازی یا اطلاقِ قانون یا قضاء میں سے کسی شعبہ میں یا سب شعبوں میں تلف کر دے۔ پس ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے آئین اساسی بناتے وقت ہمیں ملحوظ رکھنا ہوگا کہ آئین ایسا ہو کہ جس میں ناواجب طور پر افراد یا جماعتوں کے حقوق تلف نہ ہو سکیں اور حکومت کا فائدہ سب ملک کو پہنچے نہ کہ کسی خاص جماعت کو خواہ وہ اقلیت ہو یا اکثریت۔

اگر مذکورہ بالا اصل صحیح ہے تو آئین اساسی مختلف ممالک کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوں گے کیونکہ اس ملک کے افراد کے خاص حالات کو ان میں مدنظر رکھا جائے گا۔ اگر فرض کرو کہ ایک ملک میں بعض افراد کو اپنی زبان کے متعلق خطرہ ہے تو اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ ان کی زبان کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ اگر مذہب کو خطرہ ہے تو مذہب کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اگر فرض کرو کہ نئی قائم ہونے والی حکومت کے افراد بحیثیت افراد نہیں بلکہ بحیثیت جماعت کے اس نظام میں شامل ہوئے ہیں اور انہیں اپنے اندرونی نظام کے متعلق خطرہ ہے تو ان کے اندرونی نظام کی حفاظت کا خیال رکھا جائے گا۔

غرض چونکہ جمہوری حکومت افراد یا جماعتوں کی مرضی سے قائم ہوتی ہے حکومت کے نظام میں اس ملک کی ضرورت کے لحاظ سے ایسی حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں گی کہ جن سے افراد یا جماعتوں کے حقیقی یا جائز خوف کا ازالہ ہو سکے تا کہ وہ بشاشت قلب کے ساتھ نظامِ حکومت کو چلانے کیلئے تیار ہوں جس کے بغیر کوئی حکومت بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اب اس اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ہندوستان کی حالت کو دیکھتے ہیں کہ آیا اس میں آئین حکومت کے قیام کے وقت حفاظتی تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کن کن تدابیر کی؟

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں بہت سی اقلیتیں ہیں جن میں سے سب سے زبردست مسلمان ہیں۔ اور دوسرے نمبر پر مسیحی اور قومی لحاظ سے انگریز۔ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ اکثریت اور اقلیت کا اختلاف اس قدر شدید ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اکثر اقلیتیں اسے نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پس اگر ہندوستان میں صحیح معنوں میں جمہوری حکومت قائم کرنی ہے تو افراد یا جماعتوں کی حفاظت ضروری ہے۔ اس امر کا فیصلہ کہ کس حد تک اور کن کن امور میں حفاظت ضروری ہے ان اصول پر ہونا چاہئے۔

۱ کیا افراد یا مجموعہ افراد کا خوف حقیقی ہے یا وہمی یا بناوٹی؟

۲ اس خطرہ کے پیدا ہونے کی ذمہ داری اقلیت پر ہے یا اکثریت پر؟
۳ جن امور کے متعلق اقلیت خوف کرتی ہے کیا وہ قومی یا انفرادی ترقی کیلئے ضروری ہیں؟
۴ جن امور کے متعلق اقلیت خوف کرتی ہے کیا انہیں قربان نہیں کیا جا سکتا؟
۵ جن امور کے متعلق اقلیت حفاظت چاہتی ہے کیا ان کے متعلق حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا نظام کو باطل اور حکومت کو تباہ تو نہیں کرتا؟
۶ اقلیت جن حفاظتی تدابیر کا مطالبہ کرتی ہے کیا ان سے اکثریت یا دوسری اقلیتوں کے حقوق کو تو نقصان نہیں پہنچتا؟

یہ چھ اصول ہیں جنہیں میرے نزدیک اقلیتوں اور اکثریت کے حقوق کے فیصلہ کے وقت مدنظر رکھنا چاہئے اور اب میں ان اصول کی روشنی میں اصولی طور پر ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال کو لیتا ہوں۔

پہلا اصل یہ ہے کہ کیا اقلیتوں کا خوف حقیقی یا وہمی یا بناوٹی تو نہیں؟ اس سوال کا حل اس لئے ضروری ہے کہ اگر خوف وہمی ہو تو اس وہم کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اگر ازالہ ہو جائے تو سب جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ازالہ نہ ہو تو پھر ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ چونکہ خوف وہمی ہے ہم حفاظتی تدابیر کو کم سے کم درجہ تک اختیار کریں تاکہ آئین اساسی بلاوجہ پیچیدہ نہ ہو۔ (یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت میرے مدنظر یہ امر ہے کہ ہندوستان کا فیصلہ کرتے وقت ایک تیسری قوم بطور جج یا مشیر کار کے شامل ہوگی اس لئے لازماً اس بحث میں اس فریق کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔) اگر خوف بناوٹی ہو تو اس کی حقیقت معلوم کر کے ہمیں نظر انداز کر دینا چاہئے۔ اگر حقیقی ہو تو ہمیں اس کے دور کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اقلیت کی تباہی جمہوریت کے اصول کے ویسے ہی خلاف ہے جیسے کہ اکثریت کی تباہی۔

ہندوؤں کے افعال اور ان کے ارادوں کو بالتفصیل لکھ کر میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ مسلمانوں اور مسیحیوں اور انگریزوں (میں ہر جگہ اینگلو انڈین کو اس لفظ میں شامل سمجھوں گا) کا خوف حقیقی ہے پس ان کے خوف کا علاج ضروری ہے۔ گو ہندوستانی مسیحیوں میں سے ایک معقول تعداد کسی حفاظتی تدبیر کی ضرورت نہیں سمجھتی لیکن ان کے متعلق بھی خوف حقیقی ہے۔ لیکن وہ خود حفاظت نہ چاہیں تو زبردستی ان کے لئے ایسی تدابیر کا اختیار کرنا عقل کے خلاف ہوگا۔

اب ایک اقلیت رہ گئی ہے جس کا میں نے اب تک ذکر نہیں کیا۔ اس اقلیت کے خوف میرے نزدیک بناوٹی ہیں اور صرف زائد حقوق لینے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں یہ اقلیت سکھوں کی ہے۔ سکھ تمدنی طور پر ہندوؤں کا ایک حصہ ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان میں آپس میں چھوت چھات نہیں' ان میں سے بعض آپس میں رشتہ داریاں بھی کر لیتے ہیں' بہت سے ہندو تہواروں میں شمولیت اختیار کرتے ہیں' بعض ان میں سے مقدس ہندو جگہوں کی زیارت کیلئے بھی جاتے ہیں۔ غرض تمدنی طور پر سکھ ہندوؤں کا حصہ ہیں گو مذہباً وہ بہ نسبت ہندوؤں کے مسلمانوں کے بہت زیادہ قریب ہیں۔

ان کے تمدنی طور پر ہندوؤں کا حصہ ہونے کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ جبکہ ہندو ملازمتوں وغیرہ میں مسلمانوں کو باہر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں سکھوں سے ان کا یہ سلوک نہیں ہے۔ ہندو انجنیئروں کی بدولت مسلمان ریلوے اور نہروں اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکوں سے قریباً محروم ہیں لیکن ان محکمہ جات میں ٹھیکہ داری کا کام سکھوں کو اسی طرح مل جاتا ہے جس طرح ہندوؤں کو اور اس کی بدولت سکھ اکثر بڑے بڑے مالدار ہیں۔ غرض اقتصادی اور تمدنی بائیکاٹ سے یہ لوگ مستثنٰی ہیں۔

پس ان کا ہندوؤں سے الگ ایک اقلیت کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنا درست نہیں۔ اول تو یہ لوگ تمدنی' سیاسی یا اقتصادی طور پر اقلیت کہلا نہیں سکتے کیونکہ ان تینوں امور میں یہ ہندوؤں کے ساتھ کامل یگانگت رکھتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ اگر یہ اقلیت ہوں بھی تو وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ کسی شعبہ زندگی میں ان سے بے انصافی ہوئی ہے اپنے حق سے زیادہ ہی ہر چیز ان کو مل رہی ہے۔ پنجاب کی آبادی میں یہ چودہ فیصدی ہیں لیکن بیس فیصدی حق لے رہے ہیں۔ ان حالات میں ان کا اپنی زیست کے متعلق خوف ظاہر کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ لیکن اگر یہ قوم بھی واقعات سے یا دوسری قوموں کے ارادوں سے یہ ثابت کر دے کہ ان کے ساتھ دشمنی کی جاتی ہے اور ان کے حقوق تلف کئے جاتے ہیں یا ان کے تلف کئے جانے کا حقیقی خوف ہے تو اپنے حق اور خوف کے مطابق حفاظت کے یہ بھی ویسے ہی حق دار ہیں جیسے کہ اور اقلیتیں ہیں اور کسی کا حق نہیں کہ انہیں ان کے جائز مطالبات سے محروم رکھنے کی کوشش کرے۔

دوسرا اصل جسے آئین اساسی کے تجویز کرتے وقت مدنظر رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ

اقلیتوں کو جو خطرہ پیدا ہوا ہے اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس امر کی تحقیق اس لئے ضروری ہوتی ہے تا اقلیتیں جان بوجھ کر کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے اکثریتیں ان کے خلاف بھڑک اٹھیں اور اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہیں کہ انہیں اکثریت سے صحیح طور پر خطرہ ہے اور اس وجہ سے وہ خاص حفاظت کی مستحق ہیں۔

اگر اس اصل کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کبھی بھی قومیت کی روح ملک میں پیدا نہ ہو سکے گی اور بعض خود غرض لوگ اقلیتوں کو بھڑکا بھڑکا کر ملک کے امن کو برباد کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ ٹرکی کی حکومت میں ہوتا رہا ہے کہ پہلے تو بعض حکومتیں ذاتی اغراض کے ماتحت مسیحی اقلیتوں کو جوش دلا کر کوئی شرارت کروا دیتی تھیں پھر جب ترک انہیں سزا دیتے تھے تو وہی حکومتیں بیچ میں آ کودتی تھیں کہ اقلیتوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے ان کی حفاظت ہونی چاہئے۔ اس طرح حفاظتی تدابیر کراتے کراتے ایک دن ان علاقوں کو آزاد کروا دیا گیا۔

میں گو مسلمانوں کی تائید میں لکھ رہا ہوں لیکن میں یہ کبھی پسند نہیں کروں گا کہ یہی صورت ہندوستان میں پیدا ہو اور کوئی اقلیت خواہ مسلمانوں کی ہی کیوں نہ ہو اپنے جائز حق سے متجاوز ہو کر اکثریت کو جوش دلا دے اور پھر اس امر کا مطالبہ کرنے لگے کہ ہمیں خاص حقوق ملنے چاہئیں تاکہ ہمارے حقوق کی حفاظت ہو۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک ہندوستان کی اقلیتوں کو جو خطرات ہیں وہ ان کے اپنے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کی ذمہ داری اکثریت پر ہے۔ مثلاً ملازمتوں کو لے لیا جائے اس بارہ میں کوئی امکان ہی نہیں ہو سکتا کہ مسلمان ہندوؤں کو بھڑکائیں یا تعلیمی درسگاہوں کو لے لیا جائے ان میں جو مسلمانوں کو پیچھے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یا بعض عدالتوں تک میں جو مسلمانوں کے حقوق کو تلف کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر بعض ججوں کے فیصلوں کو دیکھا جائے تو یہاں تک نظر آتا ہے کہ ایک ہی قانون اور ایک ہی قسم کے حالات کے ماتحت مسلمان مدعی ہے تو اور فیصلہ ہے اور ہندو مدعی ہے تو اور فیصلہ ہے۔ یا چھوت چھات کی جاتی ہے یا تجارتی بائیکاٹ جو کیا جاتا ہے باوجود اس کے کہ مسلمان سات سو سال تک ہندوؤں کے ہاتھ کا کھاتے رہے ہیں اور ان سے سودے خریدتے رہے ہیں۔ اس ایذا دہی کی کوئی وجہ مسلمانوں کی طرف سے پیدا نہیں ہوئی۔ ذبح گائے پر جو شور کیا جاتا ہے اسے بھی جائز نہیں کہا جا سکتا کیونکہ گائے کا ذبح کرنا یا کھانا مسلمانوں کا ذاتی فعل ہے۔ اس سے ہندوؤں کو کوئی تعلق نہیں

ہے۔ اگر مسلمان ہندوؤں کی گائیں پکڑ کر ذبح کرتے یا اُن کو اُن کا گوشت کھانے پر مجبور کرتے تو اس صورت میں اس فساد کے موجب مسلمان کہلاتے اور ہندو ہر طرح حق بجانب ہوتے۔ جب ایسا نہیں تو گائے کے ذبح کرنے پر فساد کرنا مسلمانوں کے حق میں دخل اندازی کرنا ہے۔ اگر مسلمان جن کے مذہب میں سود لینا اور دینا سخت منع ہے یا سؤر کھانا منع ہے بنکوں کو گرانے یا سؤر کھانے والوں پر حملہ کرنا شروع کر دیں تو اسے کون جائز قرار دے گا۔ اسی طرح اسلام کو اور بانیٔ اسلام کو جو گالیاں ہندو مذہبی مصنّفین کی طرف سے دی جاتی ہیں اور تبلیغ کو روکنے اور خالص ہندو راج کے قائم کرنے اور اسلامی زبانوں کو ہی نہیں بلکہ الفاظ کو بھی ملک سے نکال دینے کے جو منصوبے اکثر ہندو لیڈروں کی طرف سے ظاہر ہوئے ہیں ان کا باعث ہرگز مسلمان نہیں کہلا سکتے۔ غرض جو خطرات ہندوستان کی اقلیتوں کو ہیں وہ ان کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ اکثریت کے ہیں اس لئے اقلیتوں کی شکایت بجا ہے اور خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اگر اصولاً دیکھا جائے تو بھی ذمہ داری اکثریت پر عائد ہوتی ہے کیونکہ سائمن کمیشن نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ ہندو مسلم فسادات کی اصل وجہ پولیٹیکل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ”ہمارے نزدیک اصل سبب (ان فسادات کا) سیاسی طاقت کے حصول کی کوشش اور ان فوائد کو حاصل کرنا ہے جو سیاسی طاقت کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں۔“ [۳۴]

اور یہی امر صحیح ہے جیسا کہ میں بھی ثابت کر چکا ہوں اور اگر یہ امر صحیح ہے تو ہر ایک یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ فسادات کا فائدہ اقلیت کو نہیں بلکہ اکثریت کو حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ اکثریت کے سامنے آزادی کا خیال ہوتا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اقلیت کو کمزور کر کے اپنی طاقت اس قدر بڑھائے کہ اقلیتیں اس کی آزادانہ حکومت میں روک نہ بن سکیں اور وہ پورے طور پر اپنے منشاء کے مطابق حکومت کر سکے۔

تیسرا اصل مَیں نے یہ بتایا تھا کہ اقلیتوں اور اکثریت کا تصفیہ کرتے وقت اس امر کو دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اقلیت جن امور میں حفاظت کا مطالبہ کرتی ہے کیا وہ امور قومی یا انفرادی ترقی کیلئے ضروری ہیں کیونکہ اگر وہ غیر ضروری امور ہوں تو انہیں آئین اساسی میں لانا اسے بِلا وجہ پیچیدہ کر دیتا ہے۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اقلیت کو سمجھائیں کہ وہ خواہ مخواہ ان پر زور نہ دے اور ایسے چھوٹے امور جن میں تغیر سے نہ اقلیت کو

نقصان ہے اور نہ اکثریت کو کوئی فائدہ ہے ان کے متعلق یونہی یہ شبہ نہ کرے کہ اکثریت ان میں جبر سے کام لے گی اور اگر اکثریت ایسا کرے بھی تو چونکہ وہ غیر ضروری ہیں اقلیت کو ان میں صبر سے کام لے کر ملک کی فضاء کو درست بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اب میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کرتا ہوں تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کیا وہ امور قومی یا انفرادی ترقی کیلئے ضروری ہیں؟ مسلمانوں کے مطالبات یہ ہیں:-

۱۔ ہندوستان کی آئندہ حکومت اشتراکی اصول پر ہو۔ یعنی مرکزی حکومت کو صوبہ جات سے اختیار ملیں نہ کہ مرکزی حکومت سے صوبہ جات کو اور سوائے ان امور کے جو سارے ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا اختیار صوبہ جات مرکزی حکومت کو دیں باقی سب امور صوبہ جات کے قبضہ میں رہیں۔

۲۔ سرحدی صوبہ اور بلوچستان کو بھی دوسرے آزاد صوبوں کی طرح حکومت دی جائے اور سندھ کو بمبئی سے آزاد کر کے نیا صوبہ بنایا جائے اور اسے بھی آزاد صوبوں کے برابر حقوق دیئے جائیں۔

۳۔ اس امر کا انتظام کر لیا جائے کہ تمام اقوام کی نمائندگی ان کی تعداد کے مطابق ہو۔ سوائے اس کے کہ کوئی اقلیت بہت کمزور ہو اور اس کے ہر قسم کے مفاد کی نمائندگی کے لئے ضروری ہو کہ اسے کچھ زائد نشستیں دے دی جائیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اکثریت کی اکثریت نہ جاتی رہے یا بے اثر نہ ہو جائے۔

۴۔ مرکزی حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی اتنی ہو کہ ان کی مرضی کے خلاف قانونِ اَساسی کو تبدیل نہ کیا جاسکے۔

۵۔ قوم وار نمائندوں کا انتخاب جاری رکھا جائے جب تک کہ حقیقی یا عملی اقلیتیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع نہ حاصل کر لیں۔

۶۔ گورنمنٹ، مذہب، تبلیغ یا تبدیلی مذہب کو کسی حد بندی یا پابندی کے نیچے نہ لائے۔ نہ یہ اجازت ہو کہ وہ کوئی ایسا قانون بنائے جس کی غرض ہندوستان کی کسی خاص قوم کے افراد کے حقوق یا اس کی تمدنی یا اقتصادی یا ادبی آزادی کو محدود کرنا ہو۔ نہ وہ ایسا قانون بنائے جس کی غرض کسی خاص قوم کے افراد کو خاص اختیار دے کر کسی دوسری قوم یا اقوام سے ممتاز کرنا ہو۔

۷۔ گورنمنٹ کو کسی قوم کے اہلی قانون (PERSONAL LAWS) میں اس وقت تک دخل دینے کی اجازت نہ ہو جب تک کہ اس قوم کے اپنے منتخب نمائندوں کی اکثریت اس کی تائید میں نہ ہو اس مزید شرط کے ساتھ کہ وہ نمائندے اس خاص مسئلہ کی تائید کا اظہار انتخاب کے وقت کر چکے ہوں۔

۸۔ اس امر کی حفاظت کر لی جائے کہ اقلیتوں کو مخفی یا ظاہر تدابیر کے ذریعہ سے ملازمت کے مناسب حق سے اکثریت محروم نہیں کرے گی اور اقلیتوں کو ان کا واجبی حصہ ملتا رہے گا۔

۹۔ ہندوستان کے آئین اساسی کو ایسی شکل دی جائے کہ اقلیتوں کے منشاء یا صوبہ جات کے منشاء کے خلاف اس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔

۱۰۔ صوبہ جات کی حدود میں تبدیلی آئندہ بغیر صوبہ متعلقہ کی مرضی کے نہ ہو سکے۔

یہ وہ دس مطالبات ہیں جو مختلف شکلوں میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں اور چونکہ ان میں سب اقلیتوں کے حقوق آجاتے ہیں اس لئے جہاں تک میں سمجھتا ہوں قلیل تغیر کے ساتھ ان تمام اقلیتوں کے یہ مطالبات ہیں کہ جو اس وقت اکثریت سے خائف ہیں۔ چنانچہ کلکتہ میں پچھلے دنوں جو انگریزوں کی آل انڈیا کانفرنس ہوئی ہے اس میں بھی اوپر کے مطالبات میں سے اکثر کی تائید کی گئی ہے۔

ان مطالبات پر ایک سرسری نظر ڈال کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مطالبہ قومی یا انفرادی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ سوائے مذہبی یا تمدنی حصہ کے کہ شاید سیاسی نقطہ نگاہ سے اسے قومی یا فردی ترقی کا ذریعہ بعض لوگ تصور نہیں کرتے بلکہ اسے قومی ترقی میں روک سمجھتے ہیں لیکن اس حصہ کی حفاظت اگلے اصل میں آجاتی ہے۔

چوتھا اصل میں نے یہ بتایا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے وقت یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جن امور کی حفاظت کا وہ مطالبہ کرتی ہیں کیا انہیں ملک کے فائدہ کے لئے قربان نہیں کیا جا سکتا؟ اس اصل کو مدنظر رکھنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ جہاں بعض ایسے امور ہو سکتے ہیں کہ جنہیں قربان کیا جا سکتا ہے وہاں بعض ایسے امور بھی ہو سکتے ہیں کہ خواہ دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ قومی یا فردی ترقی کے لئے ضروری نہ ہوں لیکن جس قوم یا فرد سے وہ متعلق ہیں وہ اپنے عقیدہ کے مطابق انہیں کسی صورت میں قربان نہیں کر سکتا۔ مذہبی یا تمدنی مسائل بھی اس قسم کے ہیں کہ دوسرے لوگ انہیں ضروری نہ سمجھتے ہوں لیکن جن اقوام سے وہ تعلق رکھتے

ہیں وہ انہیں اپنی روحانی یا اہلی زندگی کے لئے مادی امور سے بھی زیادہ ضروری سمجھتی ہیں اور وہ کبھی کسی ایسے نظام حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتیں جو ان مسائل میں دخل اندازی کرتا ہو۔ پس جب کسی اقلیت کو اکثریت سے یہ خطرہ ہو کہ وہ ایسے امور میں دخل اندازی کرے گی تو وہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ ان امور میں اس کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ ہندوستان کے سوال کو حل کرتے ہوئے اس اصل کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا کیونکہ ہندوستان میں اقلیتوں کو ان امور میں بھی اکثریت کی دخل اندازی کا خطرہ ہے۔ وہ صاف طور پر آئندہ مذہبی تبلیغ یا تبدیلی مذہب میں دخل اندازی کی دھمکی دے چکی ہے اور بہت سی ہندو ریاستوں میں عملاً ایسا ہو رہا ہے جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں۔ اسی طرح گائے کی قربانی یا اس کے ذبیحہ کے متعلق بھی ریاستوں اور میونسپلٹیوں میں قواعد بن چکے ہیں اور آئندہ کیلئے دھمکی دی جا رہی ہے اور کل کو ممکن ہے کہ ورثہ' شادی وغیرہ کے متعلق بھی اکثریت قواعد تجویز کرنے لگے۔ پس ضروری ہے کہ ان امور کے متعلق بھی اقلیت کی حفاظت کا سامان کیا جائے۔

پانچواں اصل جسے اقلیتوں کی حفاظت کا فیصلہ کرتے ہوئے مد نظر رکھنا چاہئے یہ ہے کہ اقلیتیں جن امور میں حفاظت چاہتی ہیں کیا ان کے متعلق حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا کسی نظام کو باطل اور حکومت کو تباہ تو نہیں کر دیتا؟ اس اصل کو مد نظر رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر اقلیتوں کی تدابیر حکومت کو ہی برباد کرنے والی ہوں تو پھر انہیں اختیار نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس صورت میں آئین اساسی تیار کرنے کے سوال کو ہی ترک کر دیا جائے گا۔ یا پھر اقلیتوں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے دعویٰ کو حد سے آگے نہ بڑھائیں۔

چھٹا اصل یہ ہے کہ کوئی اقلیت اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایسے مطالبات نہ کرے جن سے کسی اور قوم کا کوئی ایسا حق جو بحیثیت قوم اسے حاصل تھا' تلف ہوتا ہو۔ اس اصل کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے۔ جس طرح اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اکثریت کے قومی حقوق کی بھی حفاظت کی جائے اور یہ کہ ایک اقلیت کے حق کی دوسری اقلیت کے حق کے مقابلہ میں حفاظت کی جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے کہ جس سے اکثریت یا دوسری اقلیتوں کے حقوق کو نقصان پہنچتا ہو۔ بلکہ وہ سب ایسے مطالبات ہیں کہ اکثریت کو ان سے کوئی نقصان نہیں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کی بھی ان میں برابر کی حفاظت مد نظر رکھی گئی ہے۔

باب ہفتم

ہندوستانی اقلیتوں کے مطالبات اصولِ آئینی کے خلاف نہیں

ان اصول کو بیان کرنے کے بعد جو اقلیتوں کے متعلق حفاظتی تدابیر کا فیصلہ کرتے ہوئے مدنظر رکھنے چاہئیں، میں اب یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے جو مطالبات ہیں وہ اصولی طور پر ان آئینی اصول کے خلاف نہیں ہیں جو مختلف مہذب ممالک میں تسلیم کئے جاچکے ہیں اس لئے بادی الرائے میں انہیں رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ مناسب طریق پر ان کا ہندوستان کے آئندہ آئین اساسی میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔ میں اس وقت تفصیلی بحث میں نہیں پڑوں گا کیونکہ وہ بحث اسی وقت مناسب ہوگی جب ان اصول کو عملی شکل دینے کے متعلق جو تجاویز پیش ہو چکی ہیں یا میں خود پیش کروں گا ان کی خوبی یا برائی زیر بحث آئے گی۔ فی الحال میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر ایک مطالبہ جو ہندوستان کی اقلیتیں کرتی ہیں ان کی مثال مختلف ممالک کے آئین اساسی میں ملتی ہے جس کی وجہ سے ہم ان مطالبات کو خلاف اصول نہیں کہہ سکتے۔ ذاتی طور پر تو میں اس امر کا قائل نہیں کہ جو امر کسی پہلے آئین اساسی میں نہ پایا جاتا ہو وہ ضرور خلاف اصول اور مُضِرّ ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو بات ہم سے پہلے لوگوں کو نہیں سُوجھی وہ ہمیں بھی نہ سوجھے۔ لیکن چونکہ لوگوں نے یہ عادت بنالی ہے کہ بجائے بات کی معقولیت دیکھنے کے یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے مسلّمہ معقول آدمیوں نے اسے قبول کیا ہے یا نہیں اس لئے میں دنیا کے مختلف آئینی مسودات سے یہ ثابت کرتا ہوں کہ یہ سب کے سب مطالبات معقول تسلیم کئے جاچکے ہیں اور حسب ضرورت مختلف ممالک کے آئین اساسی میں شامل ہیں۔

اول مطالبہ مکمل فیڈرل کانسٹیٹیوشن (FEDERAL CONSTITUTION) کا ہے۔ اس کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کی قریباً سب نئی حکومتیں یا نئے نظام فیڈرل اصول پر ہی طے ہو رہے ہیں پس اس مطالبے کو ملک و حکومت کے مفاد کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرے مطالبہ کا ایک حصہ سرحدی صوبہ اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مطابق حق دینے کا ہے۔ یہ مطالبہ بھی ملک و حکومت کے مفاد کے خلاف نہیں کیونکہ دنیا کی کوئی آئینی حکومت ایسی نہیں جس میں سب حصص ملک کو یکساں حقوق نہ دیئے گئے ہوں۔

دوسرا حصہ اس مطالبہ کا سندھ کی آزادی کا ہے۔ اس حصہ کو بھی نظام یا حکومت کی تباہی کا موجب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ دس گیارہ صوبوں میں ایک اور صوبہ کی زیادتی ہرگز نظامِ حکومت کو تباہ نہیں کر سکتی اور نہ قانون اساسی کے اصول میں نئے صوبوں کے قیام کے خلاف کوئی بات پائی جاتی ہے۔

تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے اس کی تعداد کے مطابق نمائندگی کا انتظام کیا جائے۔ یہ مطالبہ بھی کسی صورت میں حکومت کو کمزور کرنے کا موجب نہیں ہے کیونکہ اصولِ نیابت کی تکمیل ہی اس اصل پر مبنی ہے کہ ہر جماعت اپنی تعداد کے مطابق حقوق حاصل کر سکے۔ چنانچہ آئے دنِ انتخاب کے نئے سے نئے قواعد جو تیار ہوتے رہتے ہیں تو ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مختلف جماعتوں کی نیابت ان کی تعداد کے مطابق ہو سکے۔ چنانچہ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے پروپورشنل ریپریزنٹیشن (PROPORTIONAL REPRESENTATION) (یعنی نیابت مطابق تعداد) کا اصول ایجاد کیا گیا ہے اور اسے اس قدر ترقی دی گئی ہے کہ اس وقت تک کئی درجن طریق بلکہ ایک ماہر کے بیان کے مطابق قریباً تین سو طریق اس کے ایجاد ہو چکے ہیں۔

دوسرا حصہ اس مطالبہ کا یہ ہے کہ جہاں اکثریت کی کونسلوں کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچتا ہو وہاں قلیل التعداد جماعتوں کے ہر قسم کے مفاد کی نیابت کی خاطر ان کے اصل حق سے کچھ زائد دے دیا جائے۔ اس مطالبہ کی مثال مجھے اس وقت کوئی معلوم نہیں۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ زیکو سلویکا کی کونسل اور سینٹ میں غالباً روتھینیز (RUTHENIANS) کو ان کے اصل حق سے کچھ زائد حق ملا ہوا ہے۔

چوتھا مطالبہ یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی میں اقلیتوں کی نمائندگی اس قدر ہو کہ ان کی مرضی

کے خلاف کانسٹی ٹیوشن تبدیل نہ ہو سکے۔ یہ اصل بھی مسلّمہ ہے اور مختلف حکومتوں میں اس کے لئے مختلف قواعد بنائے گئے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی نئی حکومتوں میں جو جنگ کے بعد قائم ہوئی ہیں اقلیتوں کی حفاظت کے متعلق جو حفاظتی تدابیر آئین اساسی میں شامل کی گئی ہیں ان کے بدلنے کا حق اکثریت کو نہیں دیا گیا بلکہ انہیں ایک معاہدہ کی صورت دی گئی ہے یا ایک نہ بدل سکنے والے قانون کی صورت دی گئی ہے۔ پس یہ اصل مسلّم ہے گو اس کی عملی شکل میں اختلاف ہو۔

پانچواں مطالبہ یہ ہے کہ جب تک حقیقی یا عملی اقلیتیں (جس سے میری مراد وہ اکثریت ہے جو سیاسی حالات کے ماتحت عملاً اقلیت بنا دی گئی ہو۔ اس کی تفصیل میں تفصیلات سکیم پر ریویو کرتے ہوئے کروں گا۔) اپنے پاؤں پر نہ کھڑی ہو جائیں' اس وقت تک جُداگانہ انتخاب کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ مطالبہ بھی حکومت کو کمزور کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس کی مثال بھی دوسری اقوام کے قوانین اساسی میں ملتی ہے۔ چنانچہ زیکو سلویکا میں روتھینیا میں کیمونل (COMMUNAL) انتخاب ہوتا رہا ہے۔ ۳۵ے

چھٹے مطالبہ کا پہلا حصہ یہ ہے کہ گورنمنٹ' مذہب' تبلیغ یا تبدیلی مذہب کے بارہ میں پوری آزادی دے اور اقلیتوں یا افراد کی تمدنی' اقتصادی یا ادبی آزادی کو محدود نہ کرے۔ اس بارہ میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت تو یہ حق ڈیماکریسی کے مفہوم کے نیچے ہی آ جاتا ہے لیکن یہ اصل زیکوسلویکا کی حکومت اپنے آئین اساسی میں شامل کر چکی ہے۔ اسی طرح پولینڈ نے اپنے معاہدہ کے آرٹیکل نمبر ۱۰ میں یہودیوں کو نہ صرف اپنی زبان کے پڑھنے اور بولنے کی آزادی دی ہے بلکہ آرٹیکل نمبر ۹ میں اس کے لئے پبلک فنڈ سے روپیہ مہیا کرنے کا بھی وعدہ کیا ہے اور اس روپے کو خرچ کرنے کا حق یہودیوں کی مقرر کردہ کمیٹیوں کے سپرد کیا ہے۔ آرٹیکل نمبر ۱۱ میں سبت کی حفاظت کا اقرار کیا ہے بلکہ پولینڈ نے یہودی سپاہیوں کے لئے کوشر (KOSHER) گوشت تک کے مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

یوگوسلیویا میں مسلمانوں کی اقلیت ہے اور اس حکومت نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی ان کے اوقاف کی حفاظت کی جائے گی' اور مذہبی یا خیراتی سوسائٹیوں کے بنانے میں کوئی روک پیدا ہونے نہیں دی جائے گی۔

رومانیہ نے بھی اپنے معاہدہ کے آرٹیکل گیارہ میں وعدہ کیا ہے کہ سیکسنز اور

زیک نسل کے لوگوں کو علمی اور مذہبی معاملات میں خود مختاری حاصل ہو گی۔

غرض یہ امر مسلّمہ ہے کہ مذہبی، تمدنی اور تبلیغی امور میں حکومت کو دخل اندازی کی اجازت نہیں ہونی چاہئے اور مختلف حکومتوں میں رائج ہے اور بعض حکومتوں کے آئین اساسی میں شامل ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان جس کے حالات ان ملکوں سے زیادہ نازک ہیں اس میں ان امور کی حفاظت کا سامان نہ کیا جائے۔

ساتواں سوال پرسنل لاء (PERSONAL LAW) کا ہے۔ اس کی حفاظت کی ضرورت کو بھی دنیا تسلیم کر چکی ہے۔ چنانچہ یوگوسلیویا اپنے معاہدہ کے آرٹیکل دس میں اقرار کرتا ہے کہ:۔

"سرب، کروٹ اور سلیویا کی حکومت تسلیم کرتی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے اہلی قانون اور شخصی درجہ کے متعلق وہ ایسی سہولتیں دے گی کہ جن سے وہ مسلمانوں کے رواج کے مطابق اپنے ان معاملات کو طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔"

آٹھواں مطالبہ ملازمتوں میں مناسب حصہ کے متعلق ہے گو کسی دوسرے قانونِ اَساسی میں اس کی شمولیت نظر نہیں آتی لیکن پولینڈ کے یہودیوں اور وہاں کی گورنمنٹ میں جو صلح کا معاہدہ تجویز ہوا تھا اس میں یہ شرط بھی تھی کہ یہودیوں کو ان کی آبادی کی نسبت سے ملازمتوں میں حق ملے گا اور گو بوجہ سیاسی اسباب کے اس معاہدہ کی تکمیل نہیں ہو سکی لیکن اس سے اس قدر ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے باہر بھی اس احتیاط کی ضرورت اور معقولیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔

نواں مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کا آئینِ اَساسی اقلیتوں اور صوبہ جات کی مرضی کے بغیر تبدیل نہ ہو سکے یہ اصل بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ صوبہ جات کے متعلق اس کا اطلاق یونائیٹڈ سٹیٹس میں ہوتا ہے اور اقلیتوں کی مرضی کے بغیر اس میں تبدیلی کی بندش نئی یورپین حکومتوں میں ہے جہاں اسے معاہدہ کی صورت دے کر لیگ آف نیشنز کی مرضی کے بغیر ان امور میں جو اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، تبدیلی کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔

دسواں مطالبہ یہ ہے کہ صوبہ جات کی حدود میں تغیر بغیر صوبہ متعلقہ کی مرضی کے نہ ہو سکے یہ امر اصل میں فیڈریشن کا حصہ ہے اور یونائیٹڈ سٹیٹس وغیرہ سب جگہ اس پر عمل ہو رہا ہے۔

غرض جس قدر مطالبات ہندوستان کی اقلیتوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں وہ علاوہ معقول ہونے کے مختلف ممالک کے آئین دستوری میں پہلے شامل کئے جا چکے ہیں اس لئے وہ نہ صرف عقل کی تصدیق اپنے ساتھ رکھتے ہیں، بلکہ تجربہ کی تصدیق بھی انہیں حاصل ہے۔

باب ہشتم

سائمن کمیشن کی حفاظتی تدابیر

میں بتا چکا ہوں کہ اہل کمیشن نے اقلیتوں کے لئے حفاظتی تدابیر کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ اُس وقت تک کہ رواداری کی روح ہندوستان میں پیدا ہو جائے اور اس وقت تک کہ اقلیتیں اکثریت کے انصاف پر زیادہ اعتبار کرنے لگیں حفاظتی تدابیر کی ضرورت یقینی طور پر ثابت ہے۔"[۳۶]

لیکن انہوں نے اس کا جو علاج تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ گورنروں اور گورنر جنرل کے ہاتھ میں اختیارات دیئے جائیں تا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارا خیال ہے کہ کمزور یا تعداد میں کم جماعتوں کی حفاظت کا عملی ذریعہ صرف یہی ہے کہ ایک غیر جانبدارانہ دخل اندازی کی طاقت گورنر جنرل اور صوبہ جات کے گورنروں کے ہاتھ میں قائم رکھی جائے جسے وہ حسبِ موقع اسی غرض کے لئے استعمال کیا کریں۔"[۳۷]

اسی طرح وہ سنٹرل لیجسلیچر (CENTRAL LEGISLATURE) کے نیچے لکھتے ہیں کہ:۔

"اس (حفاظت) کو حاصل کرنے کا عملی طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک غیر جانبدارانہ دخل اندازی کا حق گورنر جنرل اور صوبہ جات کے گورنروں کے ہاتھ میں محفوظ رکھا جائے۔"[۳۸]

ممکن ہے کہ یہ ذریعہ حفاظت انگریزوں کے حقوق کی حفاظت کر سکے گو مجھے اس کے

متعلق بھی شبہ ہے۔ لیکن یہ تو یقینی امر ہے کہ دوسری اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اس طرح بالکل نہیں ہو سکتی اور مجھے یقین ہے کہ چند ہی سال میں خود انگریز بھی شکایت کرنے لگیں گے کہ اس طرح ان کے حقوق کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ کمیشن نے اس امر کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے کہ جن امور میں اقلیتوں کو حفاظت کی ضرورت ہے ان میں پہلے بھی ضرورت رہتی تھی اور یہ کہ برطانیہ کے نمائندوں نے کیا گورنر اور کیا دوسرے افسر بہت ہی کم ان امور میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ مثلاً ملازمتوں کے متعلق مسلمانوں کو شکوہ ہے لیکن اس بارہ میں موجودہ اختیارات کے باوجود حکومت بہت ہی کم علاج کر سکتی ہے۔ کئی سال ہوئے ریلوے کی ملازمتوں کے متعلق گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی کی جائے گی۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں تو آٹھ فیصدی مسلمان ملازمت میں آئے تھے۔ مگر ۱۹۲۹ء میں کُل دو فیصدی مسلمان ملازمت میں لئے گئے ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں وغیرہ میں نامزدگی کا حق اس لئے دیا گیا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ہو لیکن اگر گورنمنٹ کبھی ان نامزدگیوں کو دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ ہرگز اس امر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا بلکہ حُکّام ضلع خواہ انگریز ہوں خواہ ہندوستانی اس حق کو اپنے ساتھ ملنے والوں کے لئے بطور صلہ و انعام استعمال کرتے ہیں۔ میں کونسلوں کی نامزدگیوں کی نسبت یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ بطور انعام یا صلہ استعمال ہوتی ہیں لیکن یہ یقینی امر ہے کہ ان میں بھی توازن کا قیام ہرگز مدنظر نہیں رکھا جاتا اور بسا اوقات وہ اس طرح کی جاتی ہیں کہ جو اقوام پہلے ہی اپنے حق سے زائد لے رہی تھیں نامزدگیوں میں بھی وہ آکر شامل ہو جاتی ہیں۔ گائے کی قربانی کو گورنمنٹ حتّی الامکان روکنے کی کوشش کرتی ہے اور نئے مذبحے کھولنے کی نہایت مشکل سے اجازت دیتی ہے حالانکہ غذا انسانی ضرورتوں میں سے اہم چیز ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ کسی قوم کو اس کی غذا سے روکا جائے جب کہ وہ دوسرے کے احساسات کو صدمہ پہنچائے بغیر ایک الگ جگہ میں اپنی ضرورت کو پورا کرنے پر آمادہ ہو۔

زبان کی یہ حالت ہے کہ مختلف صوبہ جات میں اردو کی جگہ ہندی لے رہی ہے اور گورنمنٹ بالکل خاموش ہے۔

حقوق کی حفاظت کا یہ حال ہے کہ پنجاب کے ایک کالج میں ایک سرجن پروفیسر کا عہدہ ولایت کے پاس شُدہ ایک قابل مسلمان کی بجائے جو اسی شرط پر نائب پروفیسر ہوا تھا کہ اس جگہ

کے خالی ہونے پر اسے مقرر کر دیا جائے گا ایک ہندو اسسٹنٹ فزیشن کو دے دیا گیا اور باوجود اس کے کہ پرنسپل نے اعتراض بھی کیا کہ مجھے سرجن کی ضرورت ہے نہ کہ فزیشن کی غیر مسلم وزیر نے اپنے فیصلہ کو نہ بدلا۔

کالجوں میں مسلمان طالبعلموں کیلئے چالیس فیصدی کی حد بندی کر دی گئی ہے حالانکہ صوبہ میں ان کی آبادی نصف سے زیادہ ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی درسگاہوں کو ان کے حق کی نسبت بہت کم ایڈ (AID) دی جاتی ہے۔ زیادہ تنخواہ والی نئی جگہوں میں سے اکثر پر ہندوؤں کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہندو اور مسیحی اپنے مذہبی دن کی چھٹی مناتے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اجازت دی ہے پھر بھی اکثر محکموں میں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز کی چُھٹّی نہیں دی جاتی اور بعض دفاتر چُھٹّی دیتے ہیں تو بعد میں اُتنا وقت کام لے لیتے ہیں حالانکہ یورپ میں جہاں یہودی اقلیت کافی ہے ان کے لئے سبت کی چُھٹّی کا انتظام کیا گیا ہے۔ مسلمان اس پر راضی تھے کہ جمعہ کے دن انہیں دو گھنٹہ کی چُھٹّی ہی دے دی جائے لیکن اس کا کوئی انتظام نہیں حالانکہ وہ آبادی میں سے پچیس فیصدی ہیں۔

غرض یہ سب کچھ گورنروں کی نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بددیانت ہیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ کیریکٹر کے لوگ ہیں جن کے ذاتی چلن نے ہمارے دلوں میں گھر کیا ہوا ہے لیکن ان معاملات میں وہ کچھ نہیں کر سکتے اس لئے کہ ساتھ مل کر کام کرنے والوں پر اس قسم کی نکتہ چینی انسانی طبیعت کے خلاف ہے۔

یہ تو سلوک کے متعلق ہے۔ اب میں قانون کو لیتا ہوں۔ پنجاب میں زمینداروں کی حفاظت کے لئے زمیندارہ قانون بنا ہوا ہے۔ اس سے زمینداروں کو بہت کچھ نجات ساہوکاروں کے ظلموں سے حاصل ہوئی تھی لیکن پچھلے دنوں ہائی کورٹ کے چند فیصلوں کے ذریعہ سے اس قانون کا نفع قریباً باطل ہو گیا ہے۔ زمینداروں نے بہت زور دیا لیکن گورنمنٹ اپنے مصالح کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکی۔ زمینداروں نے خود مسودہ پیش کیا تو گورنمنٹ نے آفیشل بلاک (OFFICIAL BLOCK) کی مدد سے اسے مسترد کرا دیا۔ ساہوکار اس ملک میں بعض دفعہ سَو سَو فیصدی سود لیتے ہیں اور عدالتیں نہایت نامعقول سُود اُنہیں دلاتی ہیں۔ ایسے کیس موجود ہیں کہ بیس تیس روپیہ ایک شخص نے قرض لیا اور دس پندرہ سال میں

تین چار سو روپیہ وہ ادا کر چکا ہے لیکن ابھی تین چار سو کا قرض موجود ہے باوجود واویلا کرنے کے ایسے لوگوں کی مشکل اب تک حل نہیں ہوئی۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب امور اقلیتوں کی حفاظت کی تدابیر سے حل ہو جائیں گے کیونکہ ان میں سے بعض تو اس مد میں آ ہی نہیں سکتے۔ میرا صرف یہ مطلب ہے کہ باوجود اس وقت تک پورے اختیارات ہونے کے اور آفیشل بلاک ہونے کے گورنر ان مصائب کو بھی نہیں دور کر سکے جن کی حقیقت سے وہ خوب آگاہ ہیں اور جن کی شناعت کو وہ تسلیم کرتے ہیں تو آئندہ تھوڑے اختیارات کے ساتھ وہ کب حقیقی یا سیاسی اقلیتوں کی مدد کر سکیں گے۔ (سیاسی اقلیت سے میری مراد بنگال اور پنجاب کے مسلمان ہیں جو اکثریت کے باوجود قانوناً اقلیت میں بدل دیئے گئے ہیں اور آہستہ آہستہ انہیں اس قدر کمزور کر دیا گیا ہے کہ خاص تدابیر کے بغیر اب وہ اُبھر نہیں سکتے)۔

غرض گورنروں کے ذریعہ سے اقلیتوں کی حفاظت کا طریق بہت ناقص ہے۔ گورنروں کو بے شک باقی ملکوں کے آئینی گورنروں کی طرح خاص اختیارات ملنے چاہئیں لیکن وہ خاص حالات کے متعلق ہونے چاہئیں نہ کہ ان امور کیلئے جو ہندوستان کا روز مرہ کا شغل بن رہے ہیں۔ ایسے امور کی اصلاح تو قانونِ اَساسی ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئے۔ گورنروں کا ان امور کے متعلق بااختیار ہونا یوں بھی مصلحت کے خلاف ہے کیونکہ آئندہ گورنر آئینی گورنر ہونگے اور ان کا اصل کام غیر جانبدارانہ رویہ سے اخلاقی اثر ڈال کر لوگوں سے کام لینا ہو گا۔ پس ان کے سپرد اقلیتوں کے جھگڑوں کو چکانے کا کام کر دینا ان کی پوزیشن کو کمزور کر دے گا اور وہ کبھی بھی اس رسوخ کو حاصل نہ کر سکیں گے جس کے بغیر اپنے فرائض کی ادائیگی ان کے لئے مشکل ہو گی۔

علاوہ ازیں اقلیتیں اس بات سے بھی جائز طور پر خائف ہیں کہ گورنر یقیناً زبردست اقوام کے ساتھ ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر وہ حکومت کو صحیح طور پر چلا نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے اگر اختیارات ان کے سپرد ہوں گے تو اقلیتیں خواہ حقیقی ہوں خواہ سیاسی، سخت خطرہ میں رہیں گی۔

نیز سیاسی طور پر بھی اس علاج پر اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ گورنروں کے سپرد ان اختیارات کو کر دینے کے یہ معنی ہونگے کہ صوبہ جاتی آزادی کبھی مکمل ہی نہ ہو کیونکہ

جب تک گورنروں کو براہ راست دخل دینے کا اختیار رہے گا اس وقت تک صوبہ جات کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر اقلیتوں کی حفاظت کے لئے دخل دینے کی طاقت گورنروں کو دی گئی تو پھر وہ وقت نہ معلوم کب آئے گا جب کہ صوبہ جات پورے طور پر آزاد کہلا سکیں گے؟

کمیشن نے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کو کانسٹی ٹیوشن (CONSTITUTION) میں شامل کرنے کے خلاف مندرجہ ذیل دلائل دیئے ہیں۔

"مختلف اقلیتوں، مذاہب اور قوموں کے نمائندوں نے ہمارے سامنے زور دیا ہے کہ ہندوستانی مجلس قانون ساز کے اختیارات آئین اساسی میں اس طرح واضح کر دینے چاہئیں کہ وہ امتیازی قانون پاس نہ کر سکے اور اگر وہ ایسا کرے تو اس کا قانون ناجائز سمجھا جائے۔" "ہمیں یقین ہے کہ قانون کے ذریعہ سے حفاظت خاص خاص اقلیتوں کو نہیں دی جا سکے گی اور نہ ہی ایسا قانون پاس کیا جا سکتا ہے کہ جس سے صرف تجارت کے متعلق طرفداری والے قانون کی ممانعت کی جائے۔ اس وجہ سے اگر قانون میں حفاظتی تدابیر کا ذکر کیا گیا تو اس کے الفاظ ایسے وسیع بنانے ہوں گے کہ انسانی حقوق کے گنوانے سے زیادہ اس میں کچھ نہ ہو سکے گا اور ان الفاظ سے ان عدالتوں کو جنہیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا شکایت کنندہ گروہ اقلیت کہلا سکتا ہے؟ یا یہ کہ کیا وہ قانون جس کی شکایت کی گئی ہے واقعہ میں ناجائز طرفداری والا قانون ہے؟ کوئی امداد نہ ملے گی۔"

علاوہ ازیں یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان میں مقدمات جس طرح باریک در باریک باتیں نکال کر کئے جاتے ہیں اور انہیں خاص طور پر لمبا کیا جاتا ہے ہمیں اس امر کی امید رکھنی چاہئے کہ عدالتوں میں ایسے مقدمات لے جائے جایا کریں گے جن کا تصفیہ عدالتوں میں اچھی طرح نہیں ہو سکتا۔

"یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر عدالت کو ایسے مقدمات میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہو جن کی بناء حقیقی شکایات ہوں تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ ان مقدمات کو بھی وہ سنے جن کی بنیاد دور از قیاس امور پر رکھی گئی ہو اور جن کے چلانے کی کوئی بھی معقول وجہ موجود نہ ہو۔ پس ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ فیصلہ کرنے پر

مجبور ہیں کہ حفاظتی قانون کے ذریعہ سے ناجائز طرفداری والے قانونوں کا ازالہ نہ کریں۔"[۳۹]

ان اعتراضات کو بیان کر کے کمیشن کہتا ہے کہ :۔

"پس حفاظت کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ایک غیر جانبدارانہ دخل اندازی کا اختیار گورنر جنرل اور صوبہ جات کے گورنروں کے ہاتھ میں اس غرض کیلئے قائم رکھا جائے اور انہیں جو ہدایات اپنے کام کو صحیح طور پر چلانے کے لئے دی جائیں ان میں یہ واضح کر دیا جائے کہ تمام مناسب موقعوں پر وہ اسی طاقت کو استعمال کریں۔"

میں یہ تو ثابت کر چکا ہوں کہ یہ ذریعہ بھی کوئی ذریعہ نہیں۔ نہ تو اس سے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکتی ہے اور نہ ہی گورنر کی پوزیشن ہی آئینی طور پر مضبوط رہتی ہے اور علاوہ ازیں اس طریق کے اختیار کرنے سے صوبہ جات کی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ پس میں صرف ان اعتراضات کا جواب دیتا ہوں جو کمیشن نے حفاظتی تدابیر کو آئینِ اَساسی میں لانے کے متعلق کئے ہیں:۔

(۱) کمیشن کہتا ہے کہ چونکہ مختلف اقلیتوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا اس لئے ہندوستان میں مختلف اقلیتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے قانون بنانا پڑے گا اور وہ قانون لازماً بالکل مبہم الفاظ میں ہو گا۔

کمیشن کے ممبروں نے یہ نہیں سوچا کہ اقلیتیں خواہ کس قدر ہوں وجوہ اختلاف بہت تھوڑے ہیں اور مشترک ہیں۔ قریباً وہی قانون مسلمانوں کے حق کی حفاظت کرے گا۔ جو مسیحیوں کے حق کی حفاظت کرے گا اور وہی ہندوؤں کے حق کی بھی کرے گا اور وہی سکھوں کے حق کی بھی کرے گا۔ مثلاً اگر آئینِ اَساسی میں یہ دفعہ رکھ دی جائے کہ اپنی پرائیویٹ ملکیت کی جگہوں پر کسی قوم کو معبد بنانے سے نہیں روکا جائے گا تو اس کا فائدہ مسلمانوں کو ہی حاصل نہ ہو گا بلکہ مسیحیوں، انگریزوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں سب کو ہو گا۔ یا مثلاً یہ دفعہ اس میں ہو کہ کوئی امتیازی قانون نہیں بنایا جائے گا تو اس کا فائدہ بھی سب فرقوں کو یکساں پہنچے گا۔ اسی طرح اگر یہ قانون ہو کہ تبلیغ سے کسی صورت میں نہیں روکا جائے گا نہ تبدیلی مذہب کے لئے کوئی حد بندی کی جائے گی۔ جیسے مثلاً مجسٹریٹ کی اجازت یا ایسی ہی کوئی شرط تو اس کا فائدہ بھی سب ہی اٹھائیں گے۔ غرض اکثر قوانین ایسے ہی ہونگے کہ کسی خاص اقلیت کی

خاطر نہیں بنائے جائیں گے بلکہ سب اقلیتوں کے مفاد ان میں مشترک ہونگے۔ پس یہ کہنا کہ ہر ایک اقلیت کے حقوق کی حفاظت کا ذکر چونکہ تفصیلاً نہیں ہو سکتا اس لئے مبہم الفاظ میں قوانین بنانے پڑیں گے درست نہیں۔ لیکن اگر یہ صحیح بھی ہو کہ الگ الگ قوانین بنانے پڑیں گے تو لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے مذہب اور جان اور مال کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ چند دفعات کی زیادتی کے خوف سے اسے چھوڑ دیا جائے۔ میرا سب سے بڑا سوال اس کے متعلق یہ ہے کہ گورنر کو جو ہدایات دی جائیں گی وہ مُبہم ہونگی یا مفصّل؟ اگر مبہم ہونگی تو کیا کمیشن یہ یقین کرتا ہے کہ نو دس کروڑ افراد اقلیتوں کے ان مُبہم ہدایات کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں گے؟ اور اگر وہ ہدایات مفصّل ہونگی تو جن الفاظ میں گورنر کو ہدایت دی جا سکتی ہے انہیں الفاظ کو کیوں آئین اساسی میں شامل نہیں کیا جا سکتا؟ مُبہم الفاظ میں گورنر کو ہدایت دینی تو ایک ایسا فعل ہے جس سے کچھ بھی نفع نہیں پہنچ سکتا بلکہ مضرت کا احتمال ہے۔ غرض ابہام کا اعتراض ایسا نہیں جو صرف آئین اساسی پر وارد ہوتا ہو۔ یہ اعتراض اسی زور سے بلکہ اس سے زیادہ زور سے گورنر کو اختیارات دینے پر وارد ہوتا ہے۔ کل کو ممکن ہے کہ اقلیت پر ایک حملہ ہو اور گورنر کہہ دے کہ قانون اساسی میں اس کا ذکر نہیں۔ میرے نزدیک اکثریت کو حق ہے کہ اس بارے میں قانون بنائے تو اس صورت میں اقلیتیں کیا کر سکتی ہیں۔ گورنر کے اختیارات بھی تو تبھی نفع دے سکتے ہیں کہ جب قانون اساسی میں اقلیتوں کے حقوق کا تفصیلی ذکر ہو تاکہ ان کی بناء پر اقلیتیں مطالبہ کر سکیں اور ان کی روشنی میں گورنر فیصلہ کر سکے۔ پس گورنر کے ہاتھ میں اختیارات کا رکھنا ہمیں آئین اساسی کی تکمیل سے آزاد نہیں کر سکتا۔ گورنر کو زیادہ سے زیادہ سپریم کورٹ کا قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جس طرح سپریم کورٹ کا قیام آئین اساسی کے مکمل ہونے کی ضرورت ثابت کرتا ہے نہ کہ اس کے غیر ضروری ہونے کی اسی طرح گورنروں کو اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ہدایت دینا ان حقوق کے بالتفصیل بیان کرنے کا متقاضی ہے نہ کہ اسے بغیر بیان کئے چھوڑ دینے کا۔ جب حقوق ہی بیان نہ ہونگے تو گورنر فیصلہ کس امر کا کرے گا۔ غرض یہ دلیل کمیشن کی بالکل کمزور اور بودی ہے۔ فیصلہ گورنر کے ہاتھ میں ہو یا کسی اور کے ہاتھ میں' یہ لازم ہے کہ ان امور کو کہ جنہیں اقلیتوں کی حفاظت کیلئے ضروری سمجھا جائے آئین اساسی میں بیان کر دیا جائے۔

یہ امر بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ اگر آئین اساسی میں وہ امور بیان نہ ہونگے

جن میں دخل اندازی قانون ساز مجالس کیلئے جائز نہ ہوگی تو جو فیصلہ بھی وہ کرے گی وہ اصولاً آئینی ہوگا۔ اور اس صورت میں گورنر کا ان کے فیصلہ کو رد کرنا یا اسے تبدیل کرنا غیر آئینی ہوگا۔ اور اس کے دخل دینے کے معنی یہ ہونگے کہ قانون ساز مجلس تھی تو اپنے اختیارات کے دائرہ کے اندر لیکن گورنر نے بعض اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر اس کے بنائے ہوئے قانون کو رد کر دیا۔ لیکن کیا اس اصل پر کوئی آئینی حکومت چل سکتی ہے؟ اور کیا اس قسم کی غیر آئینی دخل اندازی دیر تک برداشت کی جاسکتی ہے؟ اس طرح اقلیتیں تو یہ محسوس کریں گی کہ وہ گورنر کے احسان پر زندہ ہیں اور صرف رحم کے طور پر ان سے سلوک کیا جارہا ہے اور اکثریت بھی اس وجہ سے انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھے گی اور ایک نیا آفیشل بلاک (OFFICIAL BLOCK) بن جائے گا جو ایسا ہی ملک کے لئے مُضِر ہوگا جیسا کہ پہلا آفیشل بلاک مُضِر ہو رہا ہے۔

لیکن اگر اس کے برخلاف آئین اساسی میں اقلیتوں کے حقوق کا ذکر آجائے تو بالفرض اگر گورنر کے ہاتھ میں بھی اختیار رکھا جائے تو بھی اس کا دخل دینا آئینی سمجھا جائے گا اور اقلیتوں کو بھی یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ کوئی احسان طلب کر رہی ہیں بلکہ وہ جب طلب کریں گی اپنا حق طلب کریں گی۔

(۲) دوسرا اعتراض کمیشن کا یہ ہے کہ اگر قانون اساسی میں اقلیتوں کے حقوق کی دفعات کو شامل کیا گیا تو مقدمہ بازی بڑھ جائے گی کیونکہ عدالتوں میں کمزور اور مضبوط ہر قسم کے مقدمات چلائے جاسکتے ہیں۔

اس کے متعلق میرا یہ سوال ہے کہ گورنر کا رویہ ایسے اوقات میں کیا ہوگا؟ کیا یہ ہوگا کہ وہ اپنی مرضی سے جس معاملہ کو چاہے گا رد کردے گا اور جسے چاہے گا زیر غور لے آئے گا یا ہر معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کرے گا۔ یا یہ کہ کسی دوسرے افسر سے رپورٹ لے کر اگر وہ سفارش کرے کہ درخواست قابلِ غور ہے تو وہ غور کرے گا ورنہ نہیں؟ اگر پہلی صورت ہوگی اور وہ بغیر درخواست پڑھنے کے صرف درخواست کنندوں کے نام دیکھ کر فیصلہ کر دیا کرے گا تو ایسے فیصلہ کی حقیقت کچھ بھی نہ ہوگی۔ اور اگر وہ کسی دوسرے افسر کی رپورٹ پر فیصلہ کرے گا کہ معاملہ قابل غور ہے یا نہیں تو اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کہ وزیر متعلقہ کی رپورٹ پر فیصلہ کرے۔ یہ صورت ظاہر ہے کہ ایسی ہی ہے کہ کسی ملزم سے رائے لی جائے کہ تمہارے

خلاف مقدمہ سنا جائے یا نہیں؟ اور اگر اس کے لئے کوئی اور محکمہ بنایا جائے گا تو ایسے آفیسر کہاں سے لائے جائیں گے جن کی رپورٹوں پر اطمینان کیا جا سکے کہ وہ گورنر کے آگے معاملہ کو صحیح طور پر رکھیں گے اور اسے دھوکا نہیں دیں گے۔ اور اگر یہ صورت اختیار کی جائے گی کہ گورنر خود ہر ایک ایسی درخواست کو جو حقوق کے اتلاف کے متعلق ہونے گا تو یہ صورت بھی دو حالتوں سے خالی نہیں ہوگی۔ اگر تو ایسی درخواستیں زیادہ تعداد میں ہونگی جیسا کہ کمیشن کو خوف ہے تو ایسا گورنر کہاں سے لایا جائے گا جو علاوہ تمام انتظامی کام کی نگرانی اور صوبہ کے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے اور قانون ساز مجالس کے کام کی نگہداشت اور محکمانہ خط و کتابت کے ان کثیر التعداد درخواستوں کو بھی پوری طرح سنے گا اور کافی غور کے بعد ان کے بارہ میں فیصلہ دے گا۔ اس صورت میں تو ایک نہیں کئی گورنر مقرر کرنے پڑیں گے۔ اور اگر غرض یہ ہے کہ صرف اشک شوئی کی جائے اور درخواستیں لیکر کوئی سیکرٹری پڑھ لے اور خود ہی یہ فیصلہ لکھ کر کہ ہمارے نزدیک معاملہ دخل اندازی کے قابل نہیں گورنر صاحب کے دستخطوں سے یا ان کی طرف سے دستخط کر کے درخواست کنندوں کو واپس بھیج دے تو کیوں کمیشن نے صاف طور پر یہی سفارش نہ کر دی کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ انہیں اکثریت کے رحم پر چھوڑ دیا جائے یا تو وہ ظلم سے تنگ آکر ملک سے نکل جائیں گی یا تباہ اور برباد ہو کر اکثریت کے لئے راستہ خالی کر دیں گی۔

ہندوستان کے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اس سکیم کی اصل غرض صرف یہ ہے کہ کمیشن نے جو حقوق ہندوستان کو بظاہر دیئے تھے وہ اس ترکیب سے انہیں واپس لینا چاہتا ہے۔ اور آفیشل بلاک کی جگہ ایک اقلیت کا بلاک بنانا چاہتا ہے جو گورنر کے رحم پر ہونے کے سبب موقع بے موقع اور جائز و ناجائز طور پر اکثریت کا مقابلہ گورنروں کے اشارہ پر کرتا رہے اور حکومت پھر بھی پہلے کی طرح ہندوستانیوں کے ہاتھ سے باہر ہی رہے۔ میں کمیشن کے ممبروں پر یہ الزام نہیں لگاتا لیکن یہ یقینی بات ہے کہ کوئی گورنر ہرگز اس طرح کام نہیں کر سکتا اور نتیجہ یہی ہو گا کہ جب کبھی کوئی اقلیت شور ڈال کر گورنر کو متوجہ کر سکے گی اس کی درخواست پر، تو اس صورت میں کہ اکثریت کو کافی شور مچانے کا موقع نہ ملا ہو یا گورنر کے نزدیک انہیں کسی قدر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہو کچھ توجہ ہو جائے گی' ورنہ گورنروں کو ایسی درخواستوں کی طرف بذات خاص توجہ کرنے کا نہ موقع ہو گا نہ وہ ایسا کر سکیں گے۔ کمیشن نے اس امر پر بھی غور

نہیں کیا کہ گورنر ایگزیکٹو (EXECUTIVE) افسر ہو گا۔ اور اس وجہ سے لازماً وہ ایگزیکٹو حالات سے متأثر ہو گا اور خالص قانونی نقطہ نگاہ کو مدنظر رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گا اور جو فیصلے وہ کرے گا وہ ایگزیکٹو حالات اور اس کی وزارت کے خیالات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کمیشن نے جس مشکل کی بناء پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئین اساسی میں اقلیتوں کے حقوق کی تفصیل نہیں ہونی چاہئے وہ مشکل گورنر کو ہدایت دینے کی صورت میں بھی اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شدت سے قائم رہتی ہے۔ اور جس مشکل سے بچنے کے لئے اس نے عدالتوں کی بجائے گورنر کے ذمہ اس کام کو لگایا ہے وہ مشکل گورنر کے راستہ میں اور بھی اہم صورت میں پیدا ہو جاتی ہے اور حقیقت حال پر غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ یا تو گورنر یہ کام کر ہی نہیں سکے گا اور طبعی طور پر اس کے لئے اس کام کو کرنا ناممکن ہو گا اور کام یونہی پڑا رہے گا۔ اور یا پھر گورنر کا صرف نام ہو گا اور کریں گے دوسرے لوگ اور انصاف کا حاصل کرنا بالکل محال ہو گا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کانسٹی ٹیوشن خود تو اپنے پر عمل کرا نہیں سکتی اور نہ انسان آئندہ کی ضرورتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ پھر کیا جائے تو کیا؟ میرا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان آئندہ کی سب ضرورتوں کو نہیں سمجھ سکتا لیکن اس وجہ سے کہ ہم آئندہ کی ضرورتوں کو نہیں سمجھ سکتے موجودہ ضرورتوں کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ وہ طریقے جو اس وقت تک دنیا کی تاریخ سے اقلیتوں کو نقصان پہنچانے کے معلوم ہو چکے ہیں اور وہ ارادے جو اکثریت آئندہ کے متعلق ظاہر کر چکی ہے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اقلیتوں کی حفاظت کی دفعات آئین اساسی میں رکھ دی جائیں۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک نہیں ہے کہ جس میں مختلف اقلیتیں پائی جاتی ہیں اور ممالک بھی ہیں اور انہوں نے یا معاہدات کے ذریعہ یا آئین اساسی کے ذریعہ سے مختلف اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی کوشش کی ہے اور یہ درست نہیں کہ سب کے سب اس میں ناکام رہے ہیں۔ بعض ممالک میں یہ حفاظتی طریق کامیاب ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ زیکو سلویکا میں بہت حد تک کانسٹی ٹیوشن کی وجہ سے اقلیتوں کو اپنے حقوق کی حفاظت میں کامیابی ہو رہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قانون خالی کافی نہیں ہوتا جب تک اس کے صحیح استعمال کی

روح بھی مجلس عاملہ میں موجود نہ ہو۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا قانون اور مجلس عاملہ دونوں کی مخالفت زیادہ آرام دہ صورت ہے یا کم سے کم ایک طرف سے اطمینان بہتر حالت ہے۔ اگر قانون ہو تو اقلیتوں کو شور مچانے کا موقع ہوتا ہے اور ظالم قوم کے شریف الطبع لوگوں سے اپیل کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ اگر قانون بھی نہ ہو پھر تو کوئی جگہ بھی سہارا لینے کے لئے باقی نہیں رہتی۔

ہندو نقطۂ نگاہ اقلیتوں کی حفاظت کی تدابیر کے متعلق

اس جگہ میں ہندو نقطۂ نگاہ کو بھی پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی بہت کچھ انگریزوں کی رائے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انگریز فطرتاً حفاظتی تدابیر کی ظاہری صورت کے مخالف ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر اس رائے کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جو ایسی تدابیر کی ضرورت کو اُڑا دے۔ وہ حفاظتی تدابیر کی ضرورت تسلیم کرنے میں اپنے قومی نظام کی شکست محسوس کرتا ہے۔ اور اسے یہ خیال نہیں آتا کہ ہر قوم کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ اس کا نظام اپنے ارتقاء کے دوران میں ان حالات سے گزر چکا ہے جن میں سے ہندوستان اب گزر رہا ہے۔ اس تمام تاریخ کو مد نظر رکھتے ہوئے جو گزر چکی ہے رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی ایک دوسرے کے خلاف تدابیر کو یاد کرتے ہوئے آج کوئی انگریز یہ پسند نہ کرے گا کہ وہی جذبات اور وہی حالات اگر دوبارہ پیدا ہو جائیں تو بجائے آئینی حفاظت کے اس کے ملک کو دوبارہ پہلے سے حالات میں سے گزارا جائے۔ مگر انگریزی قوم اس تاریخ کو بھول جاتی ہے اور حفاظتی تدابیر کا ذکر آتے ہی سمجھنے لگتی ہے کہ اس سے اس کے نظام کا نقص بیان کرنا مطلوب ہے اور وہ جھٹ اس طرح ہوشیار ہو جاتی ہے کہ جس طرح اس کی عزت پر کوئی حملہ ہونے لگا ہو۔ پس اندریں حالات بھی ضروری ہے کہ ہندو نقطۂ نگاہ کی حقیقت بھی بیان کر دی جائے تاکہ کم سے کم وہ جو دلیل کی قوت کو تسلیم کرتے ہیں دھوکے میں نہ رہیں۔

ہندو نقطۂ نگاہ (جس سے میری مراد ان ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ ہے جو مہاسبھائی ذہنیت کے ہیں اور جن کا غلبہ اس وقت اپنی قوم پر ہے۔ ورنہ ہندوؤں میں بہت شریف الطبع اور منصف مزاج لوگ بھی ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ سر سپرو جیسے اور بھی کئی آدمی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں موجود ہوں گے۔ جو اپنی قوم کے خاموش حصہ کی ترجمانی کرتے ہوئے ملک کی آزادی اور

اس کے امن کے قیام کی راہ کھول دیں گے) یہ ہے کہ اقلیتوں کو کوئی خطرہ ہی نہیں ہے اور اقلیتیں جو مطالبات کرتی ہیں وہ قومیت کو کمزور کرنے والے ہیں اور مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کے مترادف ہے۔

میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ اقلیتوں کے مطالبات پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے مطالبات دوسری اقوام کے حقوق کو تلف کرنے والے ہرگز نہیں ہیں اور نہ وہ ملکی مفاد کے مخالف ہیں لیکن میں اس جگہ اختصار سے پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس گروہ کے ہندوؤں کی یہ کوشش کہ اقلیتوں کے مطالبات آئین اساسی میں نہ آئیں اس لئے نہیں کہ یہ لوگ نیشنلسٹ (NATIONALIST) ہیں بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ کہیں اقلیتیں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنے حقوق میں سے کچھ حصہ نہ لے لیں۔ ورنہ ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ آئین اساسی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مختلف اقوام اس کے ذریعہ سے آپس میں ایک معاہدہ کرتی ہیں اور اقرار کرتی ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کی ہمیشہ کے لئے محافظ رہیں گی۔ یا تو ہندو یہ ثابت کریں کہ اقلیتیں جن امور کا مطالبہ کرتی ہیں ان میں ہندوؤں کے حقوق کا اتلاف ہے ورنہ ان کے انکار کرنے کے سوائے اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ اقلیتوں کو ان کا حق دینا پسند نہیں کرتے۔

مثلاً تبلیغی آزادی کو لے لو۔ اگر ہندو اقلیتوں کو تبلیغ سے روکنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو انہیں اس امر پر کیوں اعتراض ہے کہ قانون اساسی میں یہ شرط رکھی جائے کہ تبلیغ آزاد ہو گی؟ اور اگر ان کا یہ ارادہ نہیں تو وہ ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ کے ان الفاظ پر کہ:۔

"اگر آپ کے ایک ہندو بھائی کو مسلمان بنانے میں آپ کسی کو روکتے ہیں اور وہ باز نہیں آتا تو بہتر ہے کہ آپ وہاں کٹ کر مر جائیں"

عمل کریں تو ان کا کیا حرج ہے کہ ہندوستان کے قانون اساسی میں یہ بات آ جائے کہ تبدیلی مذہب پر کسی قسم کی کوئی پابندی مقرر نہیں کی جائے گی۔ یا اگر ہندوؤں کا یہ ارادہ نہیں ہے کہ انگریزوں کے خلاف خاص قواعد بنا کر ان کی ہندوستانی تجارت کو تباہ کریں تو ان کا کیا حرج ہے کہ آئین اساسی میں یہ بات آ جائے کہ ایسا کوئی قانون نہ بنایا جائے گا جس کا منشاء کسی خاص قوم کی تجارت کو جو ہندوستان کو وطن بنا چکی ہو تباہ کرنا ہو۔

غرض جب کہ اقلیتیں کسی اور کا حق نہیں مارتیں صرف اپنے جائز حقوق کی حفاظت

چاہتی ہیں تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مطالبات ملک کو کمزور کرنے والے اور ظالمانہ ہیں اور اکثریت کے لئے ایک دھمکی کے مترادف ہیں؟ جس چیز کے کرنے کا انسان ارادہ رکھتا ہے اس کا اقرار کرنے سے بھی وہ نہیں ڈرا کرتا اور کانسٹی ٹیوشن (CONSTITUTION) صرف دلی ارادہ کے اظہار کا نام ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

حصّہ دوم

باب اول

ہندوستان کا آئینِ اَساسی

اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ ہندوستان کے آئندہ دستورِ اَساسی کے متعلق اپنے خیالات کو ظاہر کرسکوں کیونکہ ابتدائی مراحل کو میں طے کرچکا ہوں اور اب مجھے صرف نتیجہ بیان کرنا ہے جو یہ ہے کہ ہندوستان کا آئندہ دستورِ اَساسی محفوظ (RIGID) ہو اور اقلیتوں اور صوبوں کے حقوق کی حفاظت اس میں مدّنظر رکھی جائے۔ اکثریت بے شک جو بات ملک کے لئے بہتر سمجھے اس کے مطابق عمل کرے لیکن جب تک اقلیتیں اس پر تسلی نہ پا جائیں اس وقت تک اکثریت کے اختیارات کو اس طرح محدود کردیا جائے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کو تلف نہ کرسکے اور اس حد بندی کو آئینِ اَساسی میں شامل کردیا جائے کیونکہ آئینِ اَساسی اپنے ساتھ مادی طاقت نہیں رکھتا لیکن اخلاقی طاقت بہت کچھ رکھتا ہے اور اکثریت کا ایک حصہ ضرور معاہدہ کی خلاف ورزی سے پرہیز کرنے پر اصرار کرتا ہے جس کی مدد کے ساتھ اقلیت اپنے حقوق کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

دنیا میں حکومتیں معاہدات کو توڑتی ہی رہتی ہیں لیکن باوجود اس کے کوئی نہیں کہتا کہ معاہدات کی کیا ضرورت ہے؟ جب کسی حکومت کی مرضی ہوگی وہ معاہدہ توڑ دے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرضی پر معاہدات ٹوٹ سکتے ہیں اور توڑے جاتے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ معاہدات کو توڑ کر جس قدر ظلم ہوتا ہے اس سے بہت زیادہ بغیر معاہدہ کے ہوتا

ہے۔ دنیا میں سب انسان یکساں نہیں ہوتے۔ بعض لوگ معاہدہ کا احترام کرتے ہیں اور اپنے دوسرے بھائیوں کو ان کے توڑنے سے روکتے ہیں اور اس طرح ظلم کا ایک حصہ مٹ جاتا ہے۔ پس کانسٹی ٹیوشن میں اقلیتوں کے جائز مطالبات کا آنا ضروری ہے تاکہ ملک کی بھی اور دنیا کی رائے عامہ بھی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی تائید میں استعمال کی جاسکے۔

مگر میں یہ نہیں کہتا کہ صرف کانسٹی ٹیوشن میں ان حقوق کا ذکر آ جائے کیونکہ گو پبلک رائے بھی بہت کچھ مدد کرتی ہے لیکن بعض دفعہ دیانتدارانہ طور پر معاہدات کے معنی کرنے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں کوئی اور نظام بھی ایسا ہونا چاہئے جو غیر جانبدار رہ کر اختلاف کا فیصلہ کر سکے۔ اس موقع پر کمیشن کی سفارش پھر سامنے آ جاتی ہے۔ کمیشن کا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ گورنر کے ہاتھ میں رکھا جائے لیکن میں ثابت کر چکا ہوں کہ یہ طریق درست نہیں اور اس میں گورنروں کی پوزیشن کو بھی نقصان پہنچے گا اور اقلیتوں کو بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

میرے نزدیک اس کا بہترین طریق وہی ہے جسے دنیا تجربہ سے معلوم کر چکی ہے۔ یعنی عدالت کے سپرد یہ فیصلہ کیا جائے۔ کانسٹی ٹیوشن ایک معاہدہ ہے اور اسے وہی بدل سکتا ہے جس نے یہ معاہدہ کیا تھا۔ جو شخص یا اشخاص معاہدہ کرنے والوں کی رضامندی کے بغیر اسے بدلتے ہیں وہ خلاف قانون کام کرتے ہیں۔ پس ایک ایسا محکمہ ہونا ضروری ہے جو یہ فیصلہ کرے کہ آیا واقعہ میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا نہیں اور یہ فیصلہ ہو بھی اس طرح کہ کسی کو معقول طور پر اعتراض کی گنجائش نہ رہے اور یہ غرض صرف عدالت سے حاصل ہوتی ہے۔ عدالت کے جج بھی انسان ہوتے ہیں۔ وہ بھی خاص میلان رکھتے ہیں لیکن ان میں ایک بات ایسی ہوتی ہے جو انصاف کی طرف انہیں مائل کرتی رہتی ہے اور وہ عادت ہے۔ بہت سے ججوں کی زندگی میں ایسے مقدمات ضرور آتے رہتے ہیں کہ جن میں وہ ایک شدید میلان ایک فریق کی طرف محسوس کرتے ہیں لیکن اگر وہ رشوت خور نہ ہوں تو اکثر مقدمات ان کے سامنے ایسے آتے ہیں جن سے انہیں ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی اور اس طرح ان کا دماغ اسی رنگ میں نشوونما پاتا رہتا ہے کہ انہیں انصاف کی عادت ہو جاتی ہے۔ عادت کے علاوہ کچھ احتیاطیں عدالت کے متعلق قانون نے بھی اختیار کی ہیں جو اسے ایک حد تک انصاف پر مجبور کر دیتی ہیں اور وہ یہ کہ اس کی سب کارروائی کھلے بندوں ہوتی ہے اور اس کے سامنے دونو فریق اپنے دلائل پیش کر

سکتے ہیں۔ اور وہ پہلے امور قابلِ تنقیح نکال کر قابل بحث امور کو ایک لحاظ سے واضح اور ایک لحاظ سے محدود کر دیتی ہے۔ پھر عدالت مجبور ہے کہ خود فیصلہ لکھے۔ اس طرح اس کے فیصلے اور اس کی سب کارروائی کی نقل لینے کا دونوں فریق کو حق ہے۔ یہ پانچوں امر بظاہر معمولی معلوم دیتے ہیں لیکن انصاف میں بہت مُمِدّ ہیں اور کم سے کم ایک بڑی حد تک فریقین کے لئے تسلی اور اطمینان کا موجب ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایگزیکٹو (EXECUTIVE) کی کارروائی پسِ پردہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے رعایت کا شبہ لوگوں کے دلوں میں رہتا ہے۔ اس میں فریقین کو ایک دوسرے کے بالمقابل جرح کرنے اور دلائل بیان کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا جس کی وجہ سے وہ امور جو ایگزیکٹو پر مشتبہ رہیں انہیں کھولنے کا موقع فریقین کو نہیں ملتا۔ وہ قابلِ تنقیح امور کو الگ نکال کر فریقین کو اس سے آگاہ نہیں کرتی کہ اسے معاملہ کی حقیقت سے واقف کرنے کے لئے کن کن امور پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ وہ فیصلہ خود لکھے یا لکھوائے بلکہ عام طور پر ایگزیکٹو محکموں میں فیصلے دوسرے لوگ لکھتے ہیں اور افسر صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ فیصلہ درست ہے۔ حالانکہ سب مِسل کو پڑھ کر خود فیصلہ لکھنا یا لکھوانا اور شَے ہے اور دوسرے کے فیصلہ پر نظرِ اصلاح ڈالنا اور شَے ہے اسی طرح ایگزیکٹو کی سب کارروائی ضروری نہیں کہ تحریر میں آئے اس کا ایک حصہ ضرور زبانی مشوروں پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا ریکارڈ نامکمل ہوتا ہے اور پھر اس نامکمل ریکارڈ کی نقل لینے کا فریقین کو اختیار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے فریقین کو اس کے فیصلے کے صحت کے پرکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان پانچوں اختلافوں کی وجہ سے حقوق کے تصفیہ کے لئے عدالت کے فیصلہ کو انتظامی حکام کے فیصلہ سے ممتاز کیا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس بارے میں ممتاز ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ عدالت خراب نہیں ہو سکتی۔ میں خود پہلے لکھ چکا ہوں کہ عدالتیں بھی خراب ہو سکتی ہیں لیکن جب دو چیزوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو دونوں کی اچھی یا دونوں کی بُری یا دونوں کی اوسط حالت کا مقابلہ کیا جاتا ہے' نہ کہ ایک کی اچھی اور ایک کی بُری حالت کا۔ اور اگر اس طرح ہم عدالت اور ایگزیکٹو کا مقابلہ کریں تو یقیناً ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ بُری عدالت بُری ایگزیکٹو سے کم نقصان پہنچا سکتی ہے اور اچھی ایگزیکٹو سے اچھی عدالت پر لوگ زیادہ اعتبار کرتے ہیں اور اس کی یہ وجہ نہیں کہ عدالت پر زیادہ قابل لوگ مقرر کئے جاتے ہیں بلکہ اس کی وجہ وہ قوانین ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں اور جن کی وجہ سے

لوگوں کے قلوب میں ایک اطمینان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ محبت کے جذبات ہمیشہ ایگزیکٹو سے تعلق رکھتے ہیں' عدالت سے نہیں۔ کیونکہ اس کی وجہ ایگزیکٹو کے فیصلوں کی خوبی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ عدالت کی بنیاد دلیل پر ہے اور ایگزیکٹو کی احساسات پر' اور محبت احساسات سے تعلق رکھتی ہے چنانچہ اس کے مقابل پر یہ امر بھی دیکھا جائے گا کہ نسبتی طور پر لوگ عدالت سے اس قدر نفرت بھی نہیں کرتے جس قدر ایگزیکٹو سے' اور اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ ایگزیکٹو کا احساسات سے زیادہ تعلق ہے۔

مجھے جن جن صاحب علم و تجربہ اور بارسوخ مسلمانوں سے اس بارہ میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملا ہے میں نے ان سب کو اس امر کے خلاف پایا ہے کہ اختلاف کی صورت میں عدالت پر آئین اساسی کی تشریح کو چھوڑا جائے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ وہ جج کہاں سے لائے جائیں گے جو منصفانہ طور پر فیصلہ کریں گے۔ اگر تو وہ ہندوستان کی حکومت کی طرف سے مقرر شدہ ہونگے اور ہندو یا مسلمان ہونگے تو بوجہ اس کے کہ آئینی سوالوں کے ساتھ خود ان کے مفاد وابستہ ہوں گے ان کی رائے تعصب کیا ذاتیات سے بھی آزاد نہ ہوگی اور اگر وہ جج برطانیہ کی طرف سے مقرر کر کے بھیجے گئے تو بھی یہ سوال رہے گا کہ برطانیہ ضرور اکثریت کے خیالات سے مرعوب ہوگا اور وہ ایسے جج مقرر نہیں کرے گا جو تمام تعصبات سے بالا ہوں۔

بے شک اس دلیل میں ایک حد تک وزن ہے۔ لیکن میرا سوال یہ ہے اور اس کا جواب اس وقت تک کوئی مجھے نہیں دے سکا کہ پھر فیصلہ کس طرح ہوگا؟ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ میجارٹی (MAJORITY) کبھی بھی آئین اساسی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ تب بے شک کسی تیسرے محکمہ کی ضرورت نہ ہوگی جو اختلاف کی صورت میں آئین اساسی کے معنی کرے۔ لیکن اگر میجارٹی پر اس قدر حسن ظن ہے تو پھر حفاظتی تدابیر کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن اگر یہ ممکن بلکہ قرین قیاس ہے کہ میجارٹی دانستہ یا نادانستہ ایسے فیصلے کرے گی جو آئین اساسی کے خلاف ہونگے۔ یا بعض حالات میں کوئی اقلیت یا کوئی صوبہ یا تمام صوبہ جاتی حکومتیں مرکزی حکومت کے کسی فیصلہ کو آئین اساسی کے خلاف قرار دیں گی تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس اختلاف کا فیصلہ کرنے والا بھی کوئی صیغہ ہو۔ اگر ایسا صیغہ کوئی نہ ہو تو آئین اساسی کا فائدہ کیا ہے۔ اس صورت میں وہ اقلیتوں کے لئے ایسا ہی غیر مفید ہے جیسا کہ عام قانون۔

اگر ان لوگوں کا یہ مطلب ہے کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ کی تجویز بہتر ہے یعنی ان امور کا گورنر یا گورنر جنرل فیصلہ کیا کرے تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ سپریم کورٹ کوئی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت میں صرف یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کوئی علیحدہ سپریم کورٹ نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ گورنروں اور گورنر جنرل کو ہی سپریم کورٹ کے اختیار دے دیئے جائیں لیکن اگر ان کا یہ مطلب ہو تو ان کا بیان متضاد ہے کیونکہ سپریم کورٹ کے خلاف ان کی دلیل یہی ہے کہ ایسے جج کہاں سے آئیں گے جو انصاف سے فیصلہ کریں گے اور وہ کونسی طاقت ہوگی جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہو کہ وہ غیر جانبدار جج مقرر کرے گی؟ جب گورنروں اور گورنر جنرل کو یہ اختیار دینا وہ پسند کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک وہ طاقت بھی موجود ہے جس پر انتخاب کے بارہ میں اعتبار کیا جا سکتا ہے اور وہ آدمی بھی موجود ہیں جو انصاف سے فیصلہ کریں گے۔ پس جس دلیل پر وہ سپریم کورٹ کی مخالفت کرتے ہیں وہ باطل ہو گئی۔ صرف یہ سوال رہ گیا کہ آئین اساسی کے معنوں یا اس کے استعمال کے متعلق اگر اختلاف پیدا ہو تو اس کا فیصلہ کوئی مستقل عدالت کرے۔ یا گورنروں اور گورنر جنرل کو ہی اس غرض کے لئے عدالت فرض کر لیا جائے اور اگر یہی ان کا منشاء ہو تو میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ یہ علاج درست نہیں۔ اس سے نہ تو اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی اور نہ گورنروں کا وقار ہی قائم رہے گا۔ اور بہتر سے بہتر گورنر اپنی کسی ذاتی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس آئینی نقص کی وجہ سے بدنام ہو کر ملک سے نکل جائے گا۔

میرا یہ خیال ہے کہ وہ لوگ جو سپریم کورٹ کے مخالف ہیں وہ گورنروں کو بھی یہ اختیار دینا پسند نہیں کرتے کیونکہ ان لوگوں سے میں نے یہ خیالات بھی سنے ہیں کہ اقلیتوں کے حقوق گورنروں کے سپرد کر کے سائمن کمیشن نے ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو غلام بنانے کی تجویز کر دی ہے۔ پس میں سمجھتا ہوں کہ سپریم کورٹ کی مخالفت وہ لوگ صرف ان مشکلات کو مد نظر رکھ کر کرتے ہیں جو اس کے متعلق نظر آتی ہیں۔ لیکن اس پر انہوں نے غور ہی نہیں کیا کہ مستقل آئین حکومت رجڈ کانسٹی ٹیوشن (RIGID CONSTITUTION) جس کا وہ مطالبہ کرتے ہیں، لازمی طور پر کسی نہ کسی ایسے محکمہ کی محتاج ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ اس کی صحیح تشریح اور اس کا صحیح استعمال ہو رہا ہے۔ اور وہ لوگ آئین اساسی کے اصول کو اسی طرح نظر انداز کر رہے ہیں جس طرح کہ سائمن کمیشن نے انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ سائمن کمیشن تو یہ کہتا ہے کہ

صوبہ جات کا آئین اساسی لچکدار (FLEXIBLE CONSTITUTION) ہو۔ ہاں گورنر یہ خیال رکھے کہ اقلیتوں کے حقوق تلف تو نہیں کئے جاتے اور سپریم کورٹ کے ہندوستانی مخالف یہ کہتے ہیں کہ آئین اساسی تو مستقل ہو لیکن اس کی خلاف ورزی کی صورت میں کسی عدالت کے سپرد اس کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ گویا ایک اس کو لچکدار قرار دے کر اس کی لچک کو دور کر دیتا ہے اور دوسرا اسے مستقل قرار دے کر اس کے استقلال کو نظر انداز کر دیتا ہے اور یہ دونوں حالتیں بالکل غیر آئینی اور خلاف عقل ہیں اور مجھے تعجب ہے کہ وہ لوگ جو رات دن سیاسیات میں مشغول رہتے ہیں' اس قسم کی غلطی کے مرتکب کس طرح ہو سکتے ہیں۔

چونکہ میری غرض یہ ہے کہ میں نہ صرف ان لوگوں سے اپیل کروں کہ جو سیاسیات حاضرہ کے ماہر ہیں بلکہ ان سے بھی جو عقل میں تو ان سے کم نہیں لیکن ان کی خود ساختہ اصطلاحات سے واقف نہیں ہیں اس لئے ایسے لوگوں کے سمجھانے کے لئے میں مذکورہ بالا عبارت کی مزید تشریح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس وقت تک سیاسیات کی جس قدر باریکیوں تک انسان کا دماغ پہنچ سکا ہے اس سے ماہرین سیاسیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آئینی حکومتوں میں یعنی ان حکومتوں میں جو کسی ایک شخص کی غیر محدود مرضی پر منحصر نہیں ہیں دو قسم کے قوانین ہوتے ہیں۔ ایک اساسی یعنی وہ قانون جو یہ بتاتے ہیں کہ حکومت خواہ شخصی ہو یا جماعتی' پھر جماعتی کا خواہ قانون ساز حصہ ہو' خواہ انتظامی' خواہ عدالتی' اپنے اختیارات کو کس رنگ میں اور کس حد کے اندر استعمال کرے گا اور دوسرا عام قانون جو حکومت کے عمل کی حد بندی یا تشریح نہیں کرتا بلکہ حکومت کے علاوہ جو افراد یا جماعتیں ہوں' ان کے اعمال کے متعلق قانون تجویز کرتا ہے۔

دوسرے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ڈیما کریٹک (DEMOCRATIC) یعنی جمہوری حکومتیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا قانون کُلّی طور پر اکثریت کی مرضی کے مطابق بنتا ہے۔ یعنی سب کے سب قوانین خواہ اساسی ہوں یا عام ایک ہی قاعدہ کے مطابق ملک کے منتخب کردہ نمائندوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق بنائے جاتے ہیں چونکہ اس حکومت کے قوانین بلا استثناء منتخب کردہ نمائندوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق بنتے ہیں اور جب کوئی دوسری اکثریت انہیں منسوخ کر دے یا اس میں تبدیلی کر دے تو وہ منسوخ ہو جاتے ہیں یا بدل جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اس حکومت کے آئین اساسی کو لچکدار کہتے ہیں۔ یعنی اکثریت جب

چاہے عام قانونوں کی طرح اپنے آئین اساسی کو بھی بدل سکتی ہے اور دوسرے قوانین کے مقابلہ میں انہیں کوئی خاص حفاظت حاصل نہیں ہوتی۔ اس حکومت کی مجلس یا مجالس واضع قوانین پوری طرح آزاد ہوتی ہے۔

دوسری قسم جمہوری حکومت کی وہ ہوتی ہے کہ جس کے آئین اساسی عام قانونوں سے مختلف قرار دیئے جاتے ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس ملک کے باشندے افراد یا جماعتوں یا صوبوں یا ریاستوں کی صورت میں ایک معاہدہ کر کے اس حکومت کو قائم کرتے ہیں اور حکومت پر حد بندی لگاتے ہیں کہ تم کو ملک کے انتظام کیلئے یوں تو پورے اختیارات حاصل ہونگے لیکن فلاں فلاں معاملات میں جب تک معاہدہ کرنے والے افراد یا جماعتیں یا صوبے یا ریاستیں تم کو دوبارہ اختیار نہ دیں تم کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ گویا اس ملک کی حکومت کو اس ملک کے باشندے پورے اختیار نہیں دیتے بلکہ بعض اختیارات کو سب ملک یا صوبے یا افراد یا جماعتیں اپنے ہاتھ میں رکھتی ہیں تاکہ حکومت ان کے حق کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور ان کے مشورہ کے بغیر کام نہ کر سکے لیکن ان مخصوص امور کے علاوہ دوسرے امور کے متعلق حکومت کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ اکثریت کی مرضی کے مطابق جو قانون چاہے بنا دے۔ کسی فرد یا کسی جماعت یا کسی صوبہ یا کسی ریاست کو اس پر اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا اس قسم کی حکومت کے آئین اساسی کو مستقل کہتے ہیں۔ یعنی ان کے بدلنے کا حکومت کو خود اختیار نہیں ہوتا بلکہ وہ افراد یا جماعتیں یا صوبے یا ریاستیں جن کی مرضی کے مطابق وہ قانون بنا تھا' جب مقررہ اصول کے مطابق اپنی مرضی کا اظہار کریں' تبھی انہیں بدلا جا سکتا ہے۔ وہ طریق جن سے معاہدہ کرنے والی جماعتوں یا افراد یا صوبوں یا ریاستوں کی مرضی کا پتہ لیا جاتا ہے مختلف ہیں لیکن اس جگہ ان کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

حکومت اور قانون کی ان دونوں قسموں کے سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جن حکومتوں کا آئین اساسی لچکدار ہے انہیں کسی ایسے محکمہ کی ضرورت نہیں جو یہ فیصلہ کرے کہ ان کی حکومت کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط کیونکہ ایسی حکومت کو ہر امر میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اور جسے پورا اختیار حاصل ہو اس کے فیصلہ کو کون غلط کہہ سکتا ہے لیکن اس کے برخلاف جن حکومتوں کا آئین اساسی مستقل یا غیر لچکدار ہو ان کے اختیارات چونکہ محدود ہوتے ہیں اس لئے ان کے لئے کسی ایسے محکمہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو یہ فیصلہ

کرے کہ انہوں نے اپنے حق سے باہر تو کوئی قانون نہیں بنا دیا۔ اس وجہ سے جس قدر آئین اساسی کے اصول کے چوٹی کے ماہر ہیں ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جس حکومت کا آئین اساسی مستقل یا غیر لچک دار ہو یعنی ملک نے اسے یہ آزادی نہ دی ہو کہ وہ جو چاہے کرے اس کے لئے ایک ایسے محکمہ کا ہونا ضروری ہے کہ جو کسی طرف سے اپیل دائر ہونے پر یہ فیصلہ کرے کہ حکومت نے قانون اساسی کی خلاف ورزی تو نہیں کی۔ چنانچہ لارڈ برائس کینیڈا کی کانسٹی ٹیوشن کا بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"جیسا کہ ان حکومتوں کے متعلق کہ جو کسی آئینِ اساسی کے ماتحت محدود اختیار رکھتی ہوں عقل کا تقاضا ہے (کینیڈا کی) عدالتوں کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ آیا کوئی قانون حکومت کا غیر آئینی تو نہیں۔"[۴۰]

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ لارڈ برائس کے نزدیک اس حکومت کے لئے جس کے آئینِ اَساسی مستقل ہیں یا دوسرے لفظوں میں جس کی مجلس واضع قوانین محدود اختیارات رکھتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک ایسا محکمہ ہو جو بصورت اپیل فیصلہ کرسکے کہ مجلس نے اپنے حقوق سے تجاوز تو نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لارڈ برائس کے بیان کے مطابق امریکن مصنفوں کے بر خلاف یورپ کے بہت سے قانون دان اس اصل کے مخالف ہیں اور ضروری نہیں سمجھتے کہ آئین اساسی کے متعلق اختلاف کی صورت میں مجلس قانون ساز کے سوا کوئی اور محکمہ فیصلہ کرے کہ کونسا فریق حق پر ہے۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"یہ رائے یورپ کے براعظم میں صحیح تسلیم نہیں کی جاتی۔ وہاں سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی جمہوریتوں اور جرمن بادشاہت کے قانون دان اب تک مصر ہیں کہ مجلس عاملہ اور عدالت، قانون ساز مجلس کے ماتحت ہونی چاہئے۔ چنانچہ دو نہایت ہی اعلیٰ پایہ کے سوئٹزرلینڈ کے قانون دانوں نے میرے سامنے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ امریکن طریق زیادہ معقول ہے بیان کیا کہ (فیصلہ کرنے والی عدالت کے بغیر) سوئٹزرلینڈ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور یہ بھی بیان کیا کہ افراد ملک کو اس طرح کوئی سخت نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ ان کے سامنے معاملہ کو پیش کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا جاسکتا ہے۔"[۴۱]

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اختلاف جو سوئٹزرلینڈ کے قانون دانوں نے کیا ہے حقیقی

نہیں ہے اور سوئٹزر لینڈ کے قانون اساسی سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سوئٹزر لینڈ میں کوئی سپریم کورٹ نہیں ہے بلکہ خود انہی دو ماہرین قانون کے بیان سے جو لارڈ برائس نے نقل کیا ہے ثابت ہے کہ وہاں بھی سپریم کورٹ ہے۔ کیونکہ وہ بیان کرتے ہیں کہ سپریم کورٹ کی سوئٹزر لینڈ میں اس لئے ضرورت نہیں کہ اگر آئین اساسی کے خلاف کوئی بات اسمبلی کرے تو ملک کے باشندے اپنے حق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور اس حفاظت سے ان کی مراد ریفرنڈم (REFERENDUM) ہے۔ یعنی ملک سے ووٹ لے کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک زیر اعتراض قانون کو آئین اساسی کے خلاف سمجھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ لارڈ برائس ان کے قول کی مزید تشریح مذکورہ بالا فقرہ سے اگلے فقرہ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:۔

"اگر قومی مجلس کے کسی قانون کے متعلق خیال کیا جائے کہ وہ قانون اساسی کے خلاف ہے تو اسی وقت یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے باشندوں کی اس کے متعلق رائے لی جائے۔ پھر ملک خود فیصلہ کر دے گا کہ قانون آئین اساسی کے خلاف ہے یا نہیں۔"[۴۲]

اس طرح پروفیسر ڈبلیو۔ بی۔ منرو (W.B.MUNROE) پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایل۔ ایل۔ بی لکھتے ہیں کہ:۔

"اس کے برخلاف اگر کسی معاملہ کے خلاف درخواست دی جائے کہ وہ قانون اساسی کے خلاف ہے اور ملک کی عام رائے اس کے بارہ میں حاصل کی جائے تو اگر اکثر رائے دہندگان اس کے خلاف ہوں تو وہ قانون منسوخ ہو جائے گا۔"[۴۳]

ان دونوں حوالوں سے ثابت ہے کہ سوئٹزر لینڈ میں بھی آئین اساسی کے ٹوٹنے کی صورت میں ایک ایسا محکمہ مقرر ہے جس کے سامنے اپیل کی جا سکے گو چند آدمیوں کی جماعت پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ملک کے سب افراد پر مشتمل ہے اور ملک کے سب باشندوں کا کورٹ بھی ویسا ہی سپریم کورٹ کہلا سکتا ہے جیسے کہ چند افراد کا کورٹ سپریم کورٹ کہلا سکتا ہے۔ غرض اصل بات یہ ہے کہ یورپ کے قانون دانوں نے اس امر کو سمجھا ہی نہیں کہ امریکن اور دوسرے ماہرین قانون کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ غیر لچک دار آئین اساسی کے لئے کسی خاص شکل کے سپریم کورٹ کا ہونا ضروری ہے۔ جو کچھ ان کا دعویٰ ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کسی حکومت کا آئین اساسی غیر لچک دار ہو یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا محکمہ بنایا جائے کہ جو اختلاف

کے وقت اس امر کا فیصلہ کرے کہ آیا حکومت نے اپنے اختیارات سے باہر ہو کر تو کوئی قانون نہیں بنایا۔ کیونکہ اس امر کا فیصلہ مجلس واضع قوانین پر چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی ایک فریق مقدمہ کو خود اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے جج مقرر کر دیا جائے اور سوئٹزرلینڈ نے جو صورت فیصلہ کی تجویز کی ہے یعنی سب ملک کی ریفرنڈم وہ اس ملک کے لحاظ سے بالکل معقول ہے اور یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ سوئٹزرلینڈ میں کوئی سپریم کورٹ نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کا سپریم کورٹ یونائیٹڈ سٹیٹس کے سپریم کورٹ سے مختلف ہے۔

چونکہ بحث کے وقت یہ سوال بھی آ سکتا ہے کہ اگر ریفرنڈم بھی ایک قسم کا سپریم کورٹ ہے تو کیوں ہندوستان میں بھی ویسا ہی سپریم کورٹ نہ جاری کر دیا جائے۔ یعنی اگر کسی جماعت کو فیڈرل گورنمنٹ کے کسی فیصلہ یا قانون پر اعتراض ہو تو ملک کی عام رائے دریافت کر کے جو کثرت کی رائے ہو اس کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے اس لئے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ اختلاف جو یورپ اور امریکہ کے ماہرین قانون میں ہوا ہے کہ آیا غیر لچک دار قانون اساسی کے لئے کسی سپریم کورٹ کا ہونا لازمی ہے یا نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے الگ قسم کے سپریم کورٹ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہ موقع نہیں کہ میں تفصیلی طور پر بتاؤں کہ کس طرح مختلف ممالک کی مختلف حالتوں کے مطابق مختلف شکلوں کے سپریم کورٹ کی ضرورت ہوا کرتی ہے لیکن ہندوستان کے معاملہ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ غیر لچک دار قانون اساسی کی دو بڑی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو شخصی حکومت یا آلیگارکی (OLIGARCHY) یعنی باا‌ثر لوگوں کی حکومت کے حملہ سے بچنا اور دوسرے اکثریت کی حکومت کے حملہ سے بچنا۔ پہلی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آئین اساسی کے بنانے والوں کے سامنے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کسی وقت کوئی خاص علمی یا مذہبی یا سرمایہ دار یا زمیندار جماعت ملک کی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی جمہوریت کی شکل کو توڑ کر ایسے چند باا‌ثر لوگوں کی حکومت (آلیگارکی) میں تبدیل نہ کر دے تب وہ لوگ اس خطرہ سے بچنے کیلئے ایک غیر لچک دار قانون اساسی بناتے ہیں اور اس کی تبدیلی کے متعلق ایسی شرطیں مقرر کرتے ہیں کہ جب تک اکثر افراد کی رائے اس کی تائید میں نہ ہو اس وقت تک اسے تبدیل نہ کیا جا سکے اور اس آئین کے توڑے جانے کے احتمال کے موقع پر بھی فیصلہ ملک کی اکثر آبادی پر چھوڑتے ہیں تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ کوئی اقلیت غفلت میں ملک پر

حکمران تو نہیں ہو گئی۔

دوسری صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آئین اساسی بنانے والوں کے سامنے یہ سوال ہوتا ہے کہ اکثریت ہی کہیں اقلیت کو نہ کھا جائے۔ اور بعض ایسی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ان کے مدنظر ہوتی ہے کہ جو اسی شرط پر اس نظام حکومت میں شامل ہونے کے لئے تیار ہوتی ہیں کہ ان کی جُداگانہ ہستی معرضِ خطر میں نہ آئے۔ اس صورت میں آئینِ اَساسی کے بنانے والے صرف یہ امر مدنظر نہیں رکھتے کہ اکثریت کے حقوق تلف نہ ہو جائیں بلکہ ایسے قواعد بناتے ہیں جن کی مدد سے اقلیتیں اکثریت کے حملہ سے محفوظ رہیں اور اس صورت میں قانون اساسی کے توڑے جانے کے احتمال کے وقت بھی فیصلہ اکثریت کے سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ کسی اور محکمہ کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ جس ملک کے قواعد کی غرض چند بااثر افراد کی حکومت سے اپنے ملک کو بچانا ہو ان کے لئے بہترین سپریم کورٹ ملک کی اکثریت کی رائے ہی ہو سکتی ہے کیونکہ چند اشخاص کے فیصلہ سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ملک کا اکثر حصہ اس کا موید ہے لیکن ملک کے اکثر حصہ کا فیصلہ اگر حاصل ہو جائے تو پوری طرح تسلی ہو جاتی ہے کہ اکثریت کی حکومت کا مدعا پورا ہو رہا ہے۔ برخلاف اس کے جس ملک کا اساس اس اصل پر ہو کہ بعض جماعتوں یا صوبوں کی منفردانہ شخصیت کو نقصان سے بچایا جائے۔ اس میں اگر سپریم کورٹ ملک کی اکثریت کی رائے کو قرار دیا جائے تو یہ گویا اس غرض کو ہی باطل کرنا ہو گا جس کے لئے قانونِ اَساسی بنایا گیا تھا۔ جس اکثریت کی دست اندازی سے بچنا مقصود تھا اسی کو جج بنا لینا ایک فریق مقدمہ کے اختیار میں فیصلہ کا اختیار دے دینے کے مترادف ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان دونوں صورتوں میں الگ الگ قسم کے سپریم کورٹ کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی صورت میں ملک کی اکثریت کا فیصلہ ہی قانونِ اَساسی کی حفاظت کر سکتا ہے اور دوسری صورت میں اکثریت کے فیصلہ پر چھوڑ دینا قانونِ اَساسی کی غرض کو باطل کر دیتا ہے۔ پس انہی مختلف حالات کے ماتحت سوئٹزرلینڈ جس کے آئینِ اَساسی بنانے والوں کے سامنے چند بااثر افراد کی حکومت کا خطرہ تھا انہوں نے اپنے ملک کے آئینِ اَساسی کا مفہوم بتانے کا اختیار ایسے سپریم کورٹ کو دیا جس میں سب افرادِ ملک شامل تھے اور یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ جسے یہ خطرہ نہیں تھا بلکہ جس کے اجزائے ترکیبی یعنی مختلف ریاستوں کے اوپر ایک ہی خیال حکومت کر رہا تھا کہ یہ نیا نظام کہیں ہماری مستقل حیثیت کو نہ

مٹا دے اور ہر ریاست ڈر رہی تھی کہ کہیں دوسری ریاستیں مل کر میری ہستی کو معدوم نہ کر دیں یا میری آواز کو کمزور نہ کر دیں اس نے اپنے لئے ایسا نظام تجویز کیا جس میں بعض خاص امور کو تو اکثریت کے فیصلہ سے بالکل باہر نکال لیا اور ایسی شرطیں لگا دیں کہ کسی صورت میں بھی اکثریت اقلیتوں کو قربان نہ کر سکے اور بعض امور کے فیصلہ کے لئے ایسی پابندیاں لگا دیں کہ صرف منتخب نمائندوں کی اکثریت فیصلہ نہ کر سکے بلکہ اقلیتیں جو یونائیٹڈ سٹیٹس کی صورت میں ریاستیں تھیں جب تک بحیثیت ریاستوں کے ایک بہت بڑی کثرت سے اس کی تائید نہ کریں ان امور کے متعلق فیصلہ نہ سمجھا جائے اور اپنے مخصوص حالات کے ماتحت ان لوگوں نے سپریم کورٹ بھی ملک کی تمام آبادی کو قرار نہ دیا کیونکہ اکثریت کے فیصلہ سے بچنے کے لئے ہی وہ تدبیریں کر رہے تھے بلکہ ایک آزاد کورٹ الگ تجویز کیا جس کے سامنے آئین اساسی کے سوال پیش ہوا کریں۔ چنانچہ اس کورٹ کے ججوں کے انتخاب کا انہوں نے یہ طریق مقرر کیا کہ پریذیڈنٹ ان کا انتخاب کیا کرے لیکن سینٹ کا اتفاق رائے ضروری ہو۔ سینٹ کے اتفاق رائے میں پھر وہی روح کام کر رہی ہے کہ ریاستوں کو بحیثیت ریاست اس امر کی نگرانی کا موقع مل جائے کہ ایسے جج مقرر نہ ہوں جو اقلیتوں یعنی ریاستوں کے حقوق کو نظرانداز کر دینے والے ہوں۔ غرض سوئٹزرلینڈ اور یونائیٹڈ سٹیٹس دونوں ملکوں نے اپنے خاص حالات کے مطابق سپریم کورٹ تجویز کئے ہیں خواہ ایک نے اس کا نام سپریم کورٹ نہ رکھا ہو مگر آئین اساسی کی حفاظت اور ترجمانی کرنے والا محکمہ ضرور موجود ہے اور اس مناسب شکل میں موجود ہے جس شکل میں کہ اس کی ضرورت تھی۔

یہ جو میں نے کہا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں چند باا ثر افراد کی حکومت کے خوف کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آئین اساسی تجویز کیا گیا ہے اور یونائیٹڈ سٹیٹس میں اکثریت کے غلبہ کے خوف کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آئین اساسی تجویز کیا گیا ہے' یہ بے دلیل بات نہیں بلکہ تاریخ اور خود ان ممالک کے آئین اساسی سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کے متعلق تو ہر تاریخ کے پڑھنے والے کو یہ بات معلوم ہے کہ اس کے آئین اساسی کے بناتے وقت سب سے بڑی دِقّت یہی تھی کہ ہر ایک ریاست ڈرتی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ بعض دوسری ریاستوں کا جتھا مل کر مجھے تباہ کر دے اور اس وقت یونائیٹڈ سٹیٹس کا قانون اساسی بنانے والوں کے سامنے اصل سوال یہی تھا کہ اکثریت' اقلیت کو کچل نہ دے۔ چنانچہ اس وقت ان لوگوں کی جو کیفیت تھی وہ

الگزنڈر ہملٹن (ALEXANDER HAMILTON) کے خیالات سے جو اس قانونِ اَساسی کے بنانے والوں میں سے ایک نمایاں شخصیت ہے ظاہر ہے۔ انہوں نے قانون ساز مجلس کے سامنے بیان کیا کہ :۔

"سب اختیارات اکثریت کو دے دو تو وہ اقلیت کو کچل دے گی اور سب اختیارات اقلیت کو دے دو تو وہ اکثریت کو کچل دے گی اس لئے دونوں کو اس قسم کے اختیارات ہونے چاہئیں کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل پر اپنی حفاظت کر سکیں۔" ۴۴

مصنف کتاب کا بیان ہے کہ یہ روح سب مجلس پر غالب تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس وقت کی بحثوں میں کثرت سے ایسے بیانات موجود ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔" ۴۵

اگر تاریخ کو نہ بھی دیکھا جائے تو خود سینٹ کی بناوٹ اس امر کو خوب واضح کر دیتی ہے کیونکہ سینٹ کے لئے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ ہر ریاست کے برابر نمائندے اس میں لئے جائیں خواہ اس کی آبادی زیادہ ہو یا کم اور اس امر پر بھی ریاستوں کو بہ مشکل راضی کیا گیا تھا ورنہ وہ تو کانگریس میں بھی برابر نمائندگی کی طالب تھیں۔ غرض یونائیٹڈ سٹیٹس کے کانسٹی ٹیوشن اور تاریخ دونوں سے ثابت ہے کہ اس کے آئین میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کسی صوبہ کو مرکزی حکومت یا دوسرے صوبوں سے نقصان نہ پہنچے۔

سوئٹزرلینڈ کی حکومت کی تاریخ سے گو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا آئین خاص افراد یا جماعت کی دَست بُرد سے بچنے کے لئے بنایا گیا تھا کیونکہ اس کا آئین درحقیقت ایک لمبے عرصہ میں تیار ہوا ہے۔ لیکن اس ملک کے حالات اور گردو پیش کے حالات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حکومتوں کے سامنے مقصد وحید یہ ہوتا تھا کہ چرچ کسی طرح حکومت پر قبضہ نہ کرلے۔ ہاں اس ملک کے آئین اساسی سے اس امر کا پتہ ضرور لگتا ہے کہ بعض خاص افراد کی حکومت سے بچنے کے لئے ایسی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس ملک میں بعض مسیحی فرقوں کی قانوناً بندش کر دی گئی ہے اور پادریوں پر پادری ہونے کی صورت میں بعض قیود لگائی گئی ہیں اور اسی قسم کے خوف کے ماتحت ودار تھرگ کے علاقہ کو سوئٹزرلینڈ نے اپنے ساتھ ملانے سے انکار کر دیا ہے۔ ۴۶

غرض ملک کا آئین اساسی جس خطرہ کو مدنظر رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ اسی کے مطابق سپریم کورٹ بھی تجویز کیا جاتا ہے۔ پس ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہندوستان میں جو مستقل آئین اساسی پر زور دیا جاتا ہے تو کیوں دیا جاتا ہے۔ آیا اقلیتوں کو خطرہ سے بچانے کے لئے یا کسی خاص باا ثر جماعت کے ہاتھ سے اکثریت کو بچانے کے لئے۔ اگر اول الذکر صورت ہے جیسا کہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہی صورت ہے۔ تو پھر یونائیٹڈ سٹیٹس کی طرح کا سپریم کورٹ ہی کام دے سکتا ہے اور اگر دوسری قسم کے خطرات ہیں جیسا کہ ہر اک جانتا ہے کہ نہیں ہیں تو پھر بے شک سوئٹزر لینڈ جیسا سپریم کورٹ یعنی ریفرنڈم تجویز کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا آئینِ اساسی غیر لچک دار ہونا چاہئے اور اقلیتوں کی حفاظت کے لئے جن امور کو ضروری سمجھا جائے وہ اس میں بالتفصیل بیان کئے جائیں اور کوئی ایسا محکمہ ضرور تجویز ہونا چاہئے کہ جو فیصلہ کر سکے کہ قانون اساسی کی خلاف ورزی تو نہیں ہوئی۔ قانونِ اساسی کی دفعات کیا ہوں اس کی تبدیلی کی کیا صورت ہو سپریم کورٹ کس صورت میں عمل کرے میں اس وقت اس پر بحث نہیں کرتا۔ اس کا موقع میرے نزدیک فیڈریشن کی بحث کے بعد آئے گا۔ پس اب میں فیڈرل سسٹم (FEDERAL SYSTEM) پر بحث کرتا ہوں۔

باب دوم

ہندوستان میں اتحادی (فیڈرل) حکومت

سائمن کمیشن نے مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کی اتباع میں ہندوستان کے لئے فیڈرل حکومت کی سفارش کی ہے اور میرے نزدیک یہ سفارش اس کی سب سے اہم سفارشوں میں سے ہے اور اسے مانٹیگو چیمسفورڈ پر یہ نضیلت حاصل ہے کہ گو ثانی الذکر نے بطور تنزل کے تو اتحادی طرزِ حکومت کی سفارش کی تھی لیکن اپنی سفارشات کا ڈھانچہ ایسا تیار نہیں کیا تھا جو اتحادی طرزِ حکومت کے بالکل مطابق ہو۔ لیکن سائمن رپورٹ نے اپنی سکیم فیڈرل اصول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور آئندہ منازل کُلّی طور پر اس کے اصول کے مطابق مقرر کی ہیں۔

ہندوستان کے حالات کو سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی درحقیقت اس کے سوا کوئی سفارش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ممالک کا مجموعہ ہے جس کے باشندوں میں آہستہ آہستہ اب جا کر قومیت کا احساس پیدا ہوا ہے۔ لیکن وہ احساس اس قدر مضبوط نہیں کہ اس پر توحیدی (UNITARY) حکومت کی بنیاد رکھی جا سکے۔ دوسرے اس کی زبان ایک نہیں۔ ہر صوبہ کی زبان دوسرے صوبہ سے مختلف ہے بلکہ بعض صوبوں کی بھی ایک زبان نہیں۔ ایک ہی صوبہ کے مختلف حصوں میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور اسی قدر تعداد میں تقسیم ہیں کہ اس اختلاف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اقوام کا اختلاف بھی ہے۔ شمالی ہند کے ہندو جنوبی ہند کے ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں۔ جنوبی ہند کے باشندے اپنے آپ کو ویدک تہذیب سے پہلے کا مانتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ویدوں نے ان کے منتروں سے اپنی تعلیم اخذ کی ہے۔ اس کے برخلاف شمالی ہند کے باشندے ویدوں کو نہ صرف مذہب کے لحاظ سے سب کتب پر مقدم کرتے ہیں بلکہ انہیں ابتدائے عالم میں قرار دے کر اپنی تہذیب کی بنیاد ہی ان پر رکھتے ہیں۔ پھر مذاہب کا اختلاف ہے۔ شمالی صوبہ جات میں ہندو مذہب کا زور

ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب کا بھی گہرا اثر ان علاقوں پر ہے۔ اس کے برخلاف وسطی ہند میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اپنے پورے زور پر نظر آتے ہیں۔ جنوبی ہند میں جاکر ہندو مذہب تو رہ جاتا ہے لیکن تہذیب ڈریویڈین (DRAVIDIAN)☆[۴۶] قوم کی آ جاتی ہے۔ جس نے باوجود براہمنوں کے کچل دینے والے اثر کے اپنی شخصیت کو ترک نہیں کیا اور ایک ادنیٰ اشارہ پر ابھرنے کے لئے تیار ہے۔ پھر قومی اخلاق کا اختلاف ہے۔ شمال مغربی ہند کے پٹھان اور شمال مشرقی ہند کے بنگالی میں کوئی جوڑ ہی نہیں۔ ان دونوں کے اخلاق میں اس قدر فرق ہے جس قدر کہ ایک مانٹی نیگرو کے باشندہ اور ایک شمالی فرانس کے باشندے میں فرق ہے۔ سندھی کو یو۔ پی کے باشندوں سے کوئی بھی مناسبت نہیں اور ایک پنجابی اور بہاری کے اخلاق آپس میں کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ اختلاف ہر ملک میں ہوتا ہے مگر یہ اختلاف انتہائی درجہ کا ہے۔ ایسا اختلاف کہ وہ ایک دوسرے کی مقامی ضرورتوں کے لئے کسی صورت میں بھی مناسب قانون نہیں بنا سکتے۔ نہ ایک قانون ان سب صوبوں کے لوگوں کے لئے موجب امن و برکت ہو سکتا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر ہندوستان کی ریاستوں کا سوال ہے۔ وہ ابھی تک کم سے کم ظاہری طور پر مختار فردی حکومت کے ماتحت ہیں۔ اگر ہندوستان ترقی کرنا چاہتا ہے تو ان سے کسی نہ کسی رنگ میں اس کا تعلق ضروری ہوگا۔ لیکن بغیر اس کے کہ وہ اپنی خود مختارانہ حیثیت کو قائم رکھ سکیں وہ کبھی بھی آزاد ہندوستان سے اتحاد کرنا پسند نہیں کریں گی۔ پس ان حالات کے ماتحت ہندوستان میں اگر کوئی طریق حکومت کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ اتحادی یعنی فیڈرل طرز حکومت ہے اور اس وجہ سے کمیشن کی سفارش اس بارہ میں بہت وقعت اور اہمیت رکھتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائمن رپورٹ کس قسم کی فیڈرل حکومت ہندوستان کو دینا چاہتی ہے۔ اس بارہ میں اس کی سفارشات اس قدر مُبہم ہیں کہ ہر شخص جس نے رپورٹ پڑھی ہے اس کا خیال دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک طرف تو سائمن رپورٹ کہتی ہے کہ:۔

"ایسے علاقوں کا اتحاد جیسے کہ ریاستیں اور صوبہ جات ہند ہیں کہ پہلے (یعنی ریاستیں) تو فردی حکومت کے ماتحت ہیں اور دوسرے جمہوری اصول کے ماتحت ہیں، مجبور کرتا ہے کہ اس کی بنیاد اس اصل پر رکھی جائے کہ ممکن سے ممکن اندرونی آزادی ان علاقوں کو دی جائے جو حکومت ہند کا حصہ بنیں گے۔"[۴۷]

لیکن دوسری طرف وہ لکھتے ہیں:۔

''معمولی قانون ساز اختیارات نئی کونسلوں کے بہت وسیع ہونگے کیونکہ انہیں صوبہ کے امن اور اچھی طرح حکومت چلانے کے لئے قانون بنانے کے موجودہ وقت کی طرح پورے اختیارات حاصل ہونگے اور صرف ان امور کے متعلق حد بندی ہوگی (جو حد بندی اس طرح عمل میں لائی جائے گی کہ ہر قانون کے پاس کرنے سے پہلے گورنر جنرل سے اجازت لینی پڑے گی) کہ جو مرکزی اسمبلی سے تعلق رکھتے ہونگے۔ ہم پورے زور سے اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ موجودہ ایکٹ کی دفعات کو اس بارہ میں قائم رکھا جائے کیونکہ اس سے مرکزی اور صوبہ جات کے اختیارات کی اچھی تقسیم ہوگئی ہے۔ ان دفعات میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کسی قانون کو جو پاس ہو چکا ہو اور گورنر جنرل کی منظوری حاصل کر چکا ہو غلط قرار نہ دیا جا سکے اور اس طرح مقدمہ بازی کے دروازہ کو بند کر دیا گیا ہے جس کا اس صورت میں کہ مرکز اور صوبہ جات کے اختیارات کو زیادہ وضاحت سے تقسیم کر دیا جائے کُھل جانا لازمی تھا۔''[۴۸]

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ آئندہ بھی کونسلوں کے وہی اختیارات رہیں گے جو اَب ہیں اور وہ اختیارات نہایت ہی قلیل ہیں اور درحقیقت ان کی موجودگی میں صوبہ جات کی کونسلیں صوبہ جات کی کونسلیں کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہیں اور چونکہ گذشتہ اختیارات میں یہ شرط بھی لگی ہوئی ہے کہ صوبہ جات کے متعلق قوانین گورنر جنرل کی مرضی سے مرکزی اسمبلی بنا سکتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ سائمن رپورٹ کی سفارش کے مطابق آئندہ بھی مرکزی اسمبلی گورنر جنرل کی اجازت سے صوبہ جات کے متعلق قانون بنا سکے گی۔ گویا وہ اختیارات جو صوبہ جات کو دیئے گئے تھے اس طرح وہ بھی عملاً چھینے گئے اور صرف گورنر جنرل کی مرضی کی حد بندی کے ماتحت صوبہ جات کے تمام اختیارات مرکزی اسمبلی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ غرض جو اختیارات اس پیرا میں صوبہ جات کی کونسلوں کو دیئے گئے ہیں وہ بالکل محدود ہیں اور عملاً سب اختیارات مرکز ہی میں رہے ہیں اور صوبہ جات کے نام نہاد اختیارات کو بھی ایک طرح کا مرکزی بنا دیا گیا ہے۔ یہ شکل کسی صورت میں اٹانومی (AUTONOMY) کہلانے کی مستحق نہیں۔ اور اسے اٹانومی کہنا اٹانومی کے دعویداروں کو بے وقوف بنانے کے مترادف ہے۔

ان دو متضاد بیانوں کی وجہ سے مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ پہلا حوالہ بطور اصول کے ہے اور دوسرا حوالہ صرف درمیانی وقت کے لئے عارضی احتیاط کا کام دیتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دوسرا حوالہ کمیشن کے اصل خیالات کو ظاہر کرتا ہے اور اس نے صرف ہندوستانیوں کو یہ تسلی دلانے کے لئے کہ اگر مرکز میں ہم کو اختیار نہیں ملے تو صوبہ جات میں تو اٹانومی مل گئی ہے۔ فیڈرل سسٹم اور اٹانومی کے الفاظ اختیار کئے ہیں ورنہ ان کی تجویز کردہ سکیم فیڈرل سسٹم کہلانے کی مستحق ہرگز نہیں کیونکہ صوبہ جات کو بالکل ایک بے معنی سی کانسٹی ٹیوشن دی گئی ہے جس کی آئندہ ترقی کیلئے بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دوسرے حوالہ کو ہم بطور اصل کے تسلیم کریں تو ہمیں ایسی ہی مایوسانہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کمیشن نے دیدہ دانستہ ایسا نہیں کیا۔ جس زور سے انہوں نے فیڈریشن اصول کو پیش کیا ہے اور جس طرح انہوں نے زور سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت مرکزی حکومت کو طاقتیں دینی مناسب نہیں کیونکہ یہ کام اتحادی اصول کے ماتحت صوبہ جات کا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہی تھا کہ صوبہ جات کو حقیقی خود اختیاری حکومت ملے جیسے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ریاستوں کو حاصل ہے۔ مگر بہرحال خواہ ان کا مطلب کچھ بھی ہو اب جب کہ شبہ پیدا ہو گیا ہے یہ امر آئندہ آئین اساسی میں بوضاحت بیان ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی حکومت کامل اتحادی ہوگی اور مرکزی حکومت کو صرف وہ اختیارات حاصل ہوں گے جو صوبہ جات اسے دیں یا جن اختیارات کو کہ وہ اپنی آزادی کے مکمل ہونے پر اس کے پاس رہنے دینے پر رضامندی ظاہر کریں اور تمام باقی اختیارات صوبہ جات کے قبضہ میں سمجھے جائیں گے اور ان کی مرضی کے بغیر مرکز ان میں کسی صورت میں دخل دینے کا مجاز نہ ہوگا۔

فیڈرل سسٹم پر اعتراضات اور ان کے جواب

بعض ہندو صاحبان کی طرف سے فیڈرل سسٹم پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح ہندوستان کی قومیت کمزور ہو جائے گی اور کبھی بھی ہندوستان ایک قوم نہیں بن سکے گا اور بعض ان میں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ فیڈرل طریق کو جاری کر کے انگریزوں کا یہ منشاء ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں رقابت پیدا کر دیں اور اس طرح ہمیشہ کے لئے ہندوستان پر قبضہ رکھیں۔ یہ اعتراض معمولی لوگوں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مسٹر شاستری

جیسے پرانے خادم ملک کی طرف بھی یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے انگلستان میں ایک موقع پر فیڈرل سسٹم کے خلاف یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے ہندوستان میں کبھی بھی قومیت پیدا نہیں ہوگی۔ گو مجھے کبھی بھی مسٹر شاستری سے ملنے کا موقع نہیں ملا لیکن میرے دل میں ان کی بہت عزت ہے کیونکہ میرا ہمیشہ ان کی نسبت یہ خیال رہا ہے کہ وہ ان چند ہندوستانیوں میں سے ہیں کہ جو بات کرنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں اور جانچ تول کر بات کرتے ہیں اور نسلی اور مذہبی جھگڑوں کی آگ کے بھڑکانے کے مرتکب نہیں ہوتے ایسے آدمی کی بات ضرور قابل غور ہوتی ہے اس وجہ سے میں نے نہایت غور سے اس سوال کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں اس دلیل کے اندر کوئی بھی حقیقت پانے سے محروم رہا ہوں۔ میں تاریخِ عالَم پر ایک گہری نظر ڈالنے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جس طرح انسان آپس میں ایک دوسرے سے بحیثیت افراد کے اور بحیثیت اقوام کے مختلف ہیں اسی طرح وہ آپس میں بحیثیت زمانہ کے بھی اور بحیثیت جگہ کے بھی مختلف ہیں۔ یعنی انسانوں میں یہی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ ایک فرد دوسرے فرد سے اور ایک قوم دوسری قوم سے مختلف ہے بلکہ جس زمانہ میں کوئی شخص یا قوم ہے اگر اسے دوسرے زمانہ میں لے جایا جائے تو اس کے حالات بھی اپنے پہلے حالات سے مختلف ہو جائیں گے۔ اسی طرح ایک قوم کو اس کے موجودہ ملک سے نکال کر دوسرے ملک میں لے جاؤ تو اس کے حالات بھی وہاں جاکر مختلف ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر انگلستان کی نو آبادیوں کو دیکھ لو۔ وہاں کے قوانین انگلستان سے جُدا ہیں حالانکہ وہ انگلستان سے جاکر وہاں بسے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ملک کے تغیر کے ساتھ ان کی ضرورتیں بھی بدلتی گئی ہیں۔ پھر ان میں آپس میں بھی اتحاد نہیں۔ کینیڈا کی انگریزی نَو آبادیوں نے اپنے لئے اور قوانین تجویز کئے ہیں تو آسٹریا نے اور نیوزی لینڈ نے اور۔ اور یہ اختلاف عام قوانین میں ہی نہیں ہے بلکہ قانون اساسی میں بھی ہے۔ اب اگر اس اختلاف کو دیکھ کر کوئی شخص یہ مقابلہ کرنے بیٹھے کہ ان قوانین میں سے کونسا بہتر ہے تو گو بعض غلطیاں وہ نکال لے گا لیکن ایسے مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ حق سے دور جا پڑے گا کیونکہ بہت سی باتیں جنہیں وہ دوسری باتوں پر ترجیح دے گا درحقیقت ترجیح کے قابل نہیں ہونگی جو جس ملک میں رائج ہے وہاں کے لئے وہی بہتر اور مفید ہوگی۔ غرض ملکوں کے حالات پر غور کئے بغیر اور قوموں کے حالات پر غور کئے بغیر ایک قاعدہ کُلّیہ بنا لینا کہ فلاں اصول حکومت فلاں سے بہتر ہے ایک نادانی کا فعل ہے اور

اس کا مرتکب آپ بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف طرز کی حکومتیں بلاوجہ نہیں ہیں بلکہ دانستہ یا قلبی شعور کے ماتحت نادانستہ طور پر ملک کی خاص ضرورتوں کے مطابق لوگوں نے قوانین بنائے ہیں اور ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ یونیٹری یعنی اتّصالی حکومت بہتر ہوتی ہے یا فیڈرل یعنی اتحادی۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اتّصالی حکومتوں میں سے شخصی یا حکومت خواص یا جمہوری حکومت اچھی ہوتی ہے۔ یا یہ کہ اتحادی حکومتوں میں سے مرکز کو مضبوط کرنے والی یا مرکز کو کمزور کرنے والی حکومت اچھی ہوتی ہے۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ فلاں ملک کے لحاظ سے یا فلاں قوم کے لحاظ سے یا فلاں مذہب کے لحاظ سے فلاں حکومت اچھی ہو سکتی ہے اسی طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں قسم کی حکومت سے قومیت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ملک یا فلاں قوم یا مذہب کے لوگوں میں فلاں قسم کی حکومت سے قومیت پیدا ہو سکتی ہے۔ پس یہ کہنا کہ فیڈرل اصول حکومت سے قومیت کمزور ہو جاتی ہے بالکل طفلانہ خیال ہے۔ نہ فیڈرل طرز حکومت قومیت پیدا کرتا ہے اور نہ یونیٹری طرز حکومت قومیت پیدا کرتا ہے۔ قومیت تو اس خیال سے پیدا ہوتی ہے کہ فلاں نظام حکومت ہمارا ہے اس کا قائم رکھنا اور اس کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔ جو نظام بھی یہ جذبات اپنے ملک کی آبادی میں پیدا کر سکتا ہے وہ قومیت پیدا کر دے گا خواہ کسی قسم کا ہو۔ اور جو نظام حکومت یہ جذبہ پیدا نہیں کر سکے گا وہ اس عمل میں ناکام رہے گا خواہ کوئی ہی کیوں نہ ہو۔ پس قومیت صرف اس نظام سے پیدا ہو سکے گی جو اس ملک کے باشندوں کے دلوں کو اپنے قابو میں لا سکے۔ تاریخ سے بیسیوں مثالیں اس کی بھی مل سکتی ہیں کہ جب جمہوریت قومیت پیدا کرنے سے محروم رہی تو شخصی حکومت نے قومیت پیدا کر دی۔ تازہ مثال اٹلی ہی کی موجود ہے۔ اسی طرح اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ فیڈرل حکومت نے اعلیٰ درجہ کی قومیت پیدا کر دی جیسے کہ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ میں ہوا یا آئرلینڈ میں ہوا کہ برطانوی طرز حکومت بھی ایک قسم کی فیڈریشن ہے۔ جب تک آئرلینڈ کو انگلستان نے اپنے ساتھ ملائے رکھا آئرلینڈ نے برطانوی قومیت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب اس کی تکالیف کو دور کر کے آزاد کر دیا تو آج آئرلینڈ انگلستان کے ساتھ ہے۔ پس اگر ہم ہندوستان کے خیر خواہ ہیں اور ہندوستان میں قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ مختلف اقوام اور مختلف صوبوں کو جن میں بے چینی پیدا ہو چکی ہے مطمئن کریں۔ اور ہندوستان کے معاملہ میں اس کا علاج صرف ایک

کامل فیڈریشن ہے۔ جب تک فیڈریشن کے ذریعہ سے ان مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں اور مختلف تہذیب کے لوگوں کو اس خوف سے آزاد نہیں کیا جائے گا کہ ہندوستان کی قومی حکومت انہیں تباہ کر دے گی اس وقت تک اقلیتوں کے دل کبھی بھی ہندوستانی حکومت کو اپنا نہیں سمجھیں گے۔ اور جب تک وہ نظام حکومت کو اپنا نہیں سمجھیں گے وہ کبھی بھی قومیت کے جذبات سے متأثر نہیں ہونگے خواہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں کتنا ہی اتّصال کیوں پیدا نہ کر دو۔ ہر ایک شخص جس نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہو سمجھ سکتا ہے کہ جب اختلاف شدید ہو اور ایک دوسرے سے خوف حد سے بڑھا ہوا ہو تو بہترین علاج یہی ہوتا ہے کہ کسی قدر علیحدہ رکھ کر سوچنے کا موقع دیا جائے ورنہ ایسے دو شخص اگر اکٹھے رکھے جائیں تو کوئی تعجب نہیں کہ ایک دوسرے کو محض اس خوف سے قتل کر دے کہ یہ مجھے قتل کرنے لگا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کے لوگوں نے دانائی سے اس حکمت کو سمجھا اور وہ ایک قوم بن گئے۔ ہم اگر اس کو سمجھ لیں گے تو ایک قوم بن جائیں گے اور اگر بغیر مختلف نظاموں کی حقیقت اور ان کے معنی سمجھنے کے طوطوں کی طرح اصطلاحات رٹتے رہے تو خدا جانے بدنصیب ہندوستان کا انجام کیا ہو گا۔

اتحادی یعنی فیڈرل طرز حکومت پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں چونکہ ثنائی یعنی ڈویل (DUAL) طرز حکومت ہوتی ہے یعنی ایک ہی شخص دو حکومتوں کی رعایا ہوتا ہے اس لئے اختلاف کے مواقع زیادہ پیدا ہوتے رہتے ہیں اور دونوں حکومتیں اپنے اپنے حلقہ اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں اس سوال کی تفصیلات میں پڑ کر مضمون کو لمبا کرنا نہیں چاہتا لیکن میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب ڈویل حکومت ایسی ہو کہ ایک کا حکم دوسری کے حکم کے متضاد ہو تب یہ فساد پیدا ہوتے ہیں لیکن جب دونوں حکومتوں کے اختیارات الگ الگ ہوں' حکومت کا دائرہ الگ الگ ہو' تو پھر اختلاف کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ جن امور کے متعلق حکومت مقامی نے قانون بنانا ہے ان میں حکومت مرکزی نے نہیں بنانا اور جن میں اُس نے بنانا ہے اِس نے نہیں بنانا پھر اختلاف اور جھگڑے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں اس صورت میں اختلاف دو طرح پیدا ہو سکتا ہے یا شرارت سے یا غلطی سے۔ غلطی کا علاج سپریم کورٹ کرے گا۔ باقی رہا شرارت کا سوال۔ سو اگر ایک دوسرے کے خلاف بغض کا موجود ہونا تسلیم کیا جائے تو ساتھ ہی فیڈریشن کی ضرورت ثابت ہو جاتی ہے۔ پس یہ صورت حالات فیڈریشن کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تائید میں ایک دلیل ہو گی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یونائیٹڈ سٹیٹس کے قانون اساسی میں بیرونی اور ریاستوں کی باہمی تجارت فیڈرل گورنمنٹ کے سپرد تھی اور اندرونی تجارت ریاستوں کے سپرد تھی۔ مگر ریلوں کی ایجاد نے اس فرق کو اُڑا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سپریم کورٹ کو بہت بڑی ہوشیاری سے اس قانون کو توڑ مروڑ کر صورت حالات کے مطابق کرنا پڑا۔ اگر فیڈرل طریق حکومت ہوا تو اسی قسم کی مشکلات ہندوستان کو بھی پیش آئیں گی۔ میرا جواب یہ ہے کہ ضرورت نے ساتھ ہی یہ عقل بھی تو سکھا دی کہ موجودہ زمانہ میں ہم کانسٹی ٹیوشن کو کیا رنگ دے سکتے ہیں پھر ڈر کس بات کا؟ دوسرے یہ اعتراض درحقیقت اعتراض ہی نہیں کیونکہ قانونِ اَساسی بدلا بھی تو جا سکتا ہے۔ جب فیڈرل حکومت کے تمام حصوں کو نئے حالات کے ماتحت کوئی نقص معلوم ہو گا تو وہ خود خواہش کریں گے کہ قانونِ اَساسی کو بدل دیا جائے اور صوبوں کو اپنی خواہش کے بعد اس قانون کے بدلنے میں کوئی روک نہیں ہو سکتی۔

غرض فیڈرل طرز حکومت پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ نظام بھی جب اُس ملک میں جاری کیا جائے جس میں ملک کے مختلف حصے یا اُس کی مختلف اقوام آپس میں ایک دوسرے پر اعتبار نہ رکھتی ہوں اور ایک دوسرے سے خائف ہوں تو بجائے اختلاف کی خلیج بڑھانے کے اتحاد قلبی کے پیدا کرنے کے لئے راستہ صاف کر دیتا ہے اور دلوں کو اس امر کے لئے آمادہ کر دیتا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو کسی وقت زیادہ اتّصالی کیفیت گورنمنٹ پیدا کر لی جائے اور جس ملک کے مناسب حال یہ طریق حکومت ہو اس میں اس کو جاری نہ کرنا بلکہ یونیٹری (UNITARY) طریق حکومت جاری کرنا اتحاد نہیں بلکہ فساد پیدا کرتا ہے۔ مسٹر جیمز بیک (MR. JAMES BECK) یونائیٹڈ سٹیٹس کے سالٹر جنرل نے یونائیٹڈ سٹیٹس کے متعلق جو مندرجہ ذیل فقرہ کہا ہے اس سے ہم ہندوستان کے آئندہ نظام کے متعلق فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک ایسے ملک میں جو اٹلانٹک سے پیسفک تک اور (شمالی امریکہ کی) جھیلوں سے لے کر (میکسیکو کی) خلیج تک پھیلا ہوا ہے۔ جس کا شمالی کونہ قطب شمالی کے سمندر سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور جس کا جنوبی حصہ خط استواء سے کچھ زیادہ بعید نہیں ہے۔ عادات، رسوم اور طبائع کے لحاظ سے لوگوں میں اس قدر اختلافات ہیں کہ اگر ثنائیت (ڈویل DUAL) کی قسم کی حکومت نہ ہوتی تو نظام حکومت کبھی کا تباہ

اور برباد ہو چکا ہوتا۔"۹۰؎

ہندوستان کے اختلافات یونائیٹڈ سٹیٹس سے بہت زیادہ ہیں۔ پس اگر اس ملک میں یونیٹری حکومت اتحاد نہیں بلکہ فساد پیدا کر سکتی تھی تو یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں اس سے قومیت پیدا ہوگی۔ اگر اس طریق کو اختیار کیا گیا تو قومیت پیدا نہیں ہوگی بلکہ خرابی ہوگی۔

ہندوستان کے لئے فیڈرل سسٹم کے فوائد

علاوہ زبان و رسوم وغیرہ کے اختلاف کے یہ امر بھی غور کے قابل ہے کہ ہندوستان میں حقیقی اتحاد کے لئے فیڈرل اصول حکومت کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس ملک کا ایک تہائی حصہ ریاستوں کے ماتحت ہے اور جب تک وہ حصہ ہندوستان سے ان امور میں مشترک ہو کر کام نہ کرے جو آل انڈیا حیثیت کے ہیں اُس وقت تک ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا اور اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ فیڈریشن کے اصول پر کام کیا جائے۔ ورنہ نیم آزاد ریاستیں کبھی بھی برطانوی ہند سے مل کر کام کرنے پر تیار نہ ہونگی۔

دوسرا فائدہ فیڈرل سسٹم کا یہ ہے کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور اس کے مختلف صوبوں کے باشندوں کے مزاج بوجہ مختلف آب و ہوا کے مختلف ہیں۔ پس یہ لازمی بات ہے کہ فیڈرل سسٹم کے اجراء پر ہر صوبہ اپنی ضرورت کے مطابق حکومت کے قواعد بنائے گا اور اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان میں متفرق قسم کے سیاسی تجربات ہونے لگ جائیں گے جن تجربات سے مرکزی حکومت فائدہ اٹھائے گی اور اسے آئینی اصول کے مطابق ایک ایسی مکمل صورت اختیار کرنے کا موقع ہوگا جو شاید دنیا کے کسی اور ملک کو حاصل نہیں ہے۔

فیڈرل انڈیا کے حصے

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ ملک کے کونسے حصے اور کس اصل پر فیڈرل انڈیا کا جزو بنیں گے۔ میں اس وقت ریاستہائے ہند کے سوال کو چھوڑتا ہوں کیونکہ وہ مستقل بحث کا محتاج ہے اور صرف برطانوی ہند کو لیتا ہوں۔ اس وقت ہندوستان نو آئینی صوبوں اور چند غیر آئینی علاقوں میں منقسم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس موجودہ حالت میں اس کی فیڈریشن کس طرح بن سکتی ہے۔ کیونکہ فیڈریشن کے اصول کے یہ امر منافی ہے کہ اس کے بعض حصے مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو فیڈریشن ناقص ہو جائے گی۔ کیونکہ اس میں یونیٹری یعنی اتصالی اور فیڈرل یعنی اتحادی دونوں قسم کی

حکومتیں ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں گی۔ ان علاقوں کے لحاظ سے جن میں مقامی حکومت نہ ہوگی' فیڈرل اسمبلی مقامی حکومت کا رنگ رکھے گی اور ان علاقوں کے لحاظ سے جن میں مقامی حکومت ہوگی' وہ فیڈرل اسمبلی کی حیثیت رکھے گی پھر اس کے ممبروں کے انتخاب کے بھی سائمن رپورٹ کے مطابق مختلف طریق ہونگے۔ صوبہ جاتی حکومتوں میں تو مقامی کونسلیں اس کے ممبر منتخب کریں گی اور غیر آئینی علاقہ کے لوگ براہ راست انتخاب کریں گے اور (غیر ترقی یافتہ) علاقوں کے نمائندے خود گورنر جنرل منتخب کیا کریں گے یہ صورت بالکل غیر آئینی ہوگی اور اس سے فساد پیدا ہوگا۔ فیڈرل حکومت کا کوئی حصہ فیڈریشن سے آزاد نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ خاص ضرورتوں کے ماتحت کوئی حکومت نیا شہر بسا لے جس کے باشندے یہ جانتے ہوئے وہاں بسیں کہ ہمیں لوکل حکومت میں کوئی حق نہیں ملے گا۔ یا یہ کہ جو حصہ مقامی آزادی سے محروم ہو وہ فیڈرل حکومت کا حصہ ہی نہ ہو بلکہ اس کا ایک ماتحت علاقہ ہو جیسے کہ یونائیٹڈ سٹیٹس میں فلپائن ہے۔ ان دونوں صورتوں کے سوا کوئی حصہ ملک کا حقیقی فیڈرل حکومت میں مقامی آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اس لئے نہیں کہ یہ اس پر ظلم ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ امر فیڈرل اسمبلی کو ایک جہت سے مقامی کونسل کی شکل دے دیتا ہے۔ جو فیڈرل اصول کے بالکل بر خلاف اور یونیٹری اصول کے مطابق ہے۔ فیڈرل حکومت تبھی صحیح اصول پر چل سکتی ہے جب اس کے سب حصے برابر کی آزادی رکھتے ہوں۔ پس جب تک ہندوستان کی موجودہ تقسیم کو نہ بدلا جائے اس وقت تک فیڈرل نظام حکومت اس ملک میں صحیح طور پر جاری نہیں ہو سکتا اور صوبہ جات کا تغیر و تبدل صرف ایک سہولت کا ہی سوال نہیں بلکہ ایک اصولی سوال ہے اور اس وجہ سے اس سے زیادہ قابل توجہ ہے جس قدر توجہ کہ سائمن کمیشن نے اسے دی ہے۔

سائمن کمیشن کی رپورٹ یہ ہے کہ گورنروں کے صوبوں کے سوا باقی سب صوبوں کی باستثناء شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وہی حالت رہے جو پہلے تھی اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو بھی وہ ایک نیم آزاد سی حکومت دینا چاہتے ہیں لیکن اگر ان کی اس سفارش کو تسلیم کر لیا جائے تو کبھی بھی ہندوستان صحیح طور پر فیڈرل سسٹم کے اصول پر نشوونما نہیں پا سکتا۔ تعجب ہے کہ وہ ایک طرف ان صوبوں کے موجودہ نظام کو خود ہی ناقص قرار دیتے ہیں پھر اس کے قیام کی بھی سفارش کرتے ہیں۔ قریباً ہر گورنر کے صوبہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی غیر ترقی یافتہ

(BACK WARD) علاقہ لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے گورنروں کو دہرے اختیار دینے پڑیں گے۔ پھر چھوٹے صوبے ہیں ان میں کوئی خاص نظام حکومت ہے ہی نہیں وہ براہ راست گورنمنٹ آف انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہندوستان کو مجموعی حیثیت سے کوئی آئینی شکل نہیں دی جاسکتی۔ پس میرے نزدیک اس سوال کو ایک ہی دفعہ حل کر دینا چاہئے۔

پہلے میں بیک ورڈ (BACK WARD) علاقوں کو لیتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیم میں پیچھے ہونے کے سبب سے وہاں کے باشندے اب تک عام سیاسیات میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ نے اب تک ان کے لئے کوشش کیا کی ہے۔ خواہ وہ کس قدر بھی وحشی ہوں پھر بھی وہ سو سال سے زائد عرصہ سے حکومت برطانیہ کے ماتحت ہیں۔ پس کون تسلیم کر سکتا ہے کہ اس قدر لمبے عرصہ میں ان کے اندر کوئی مفید تبدیلی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ وہ سینکڑوں سال کی مہذب دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے مگر ان میں کچھ تو قابلیت آتی لیکن وہ اب تک ویسے کے ویسے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ مہذب دنیا کی دلکشیوں نے مقامی حکام کو ادھر توجہ نہیں کرنے دی اور نہ ہی حکّام بالا نے ان سے وقتاً فوقتاً یہ رپورٹ طلب کی کہ ان کی تعلیمی اور تمدنی ترقی کی طرف تم نے گذشتہ سالوں میں کیا توجہ کی ہے۔ پھر حکومت کی خواہش بھی انسان پر سوار رہتی ہے اس لئے حکّام کو یہ بھی خیال رہا ہو گا کہ ان کے ترقی کرنے پر ہمارے وہ اختیار نہیں رہیں گے جو اَب ہیں۔ ورنہ ایک اس قدر زبردست حکومت سے جب کہ وہ لوگ پوری طرح اس کے ماتحت تھے اس کی اصلاح نہ ہو سکنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ میں اب اس امر کا ذمہ لینے کے لئے تیار ہوں کہ گورنمنٹ پندرہ بیس سال تک ان علاقوں میں سے ایک علاقہ ہمارے سپرد کر کے دیکھ لے کہ ان کی اس قدر اصلاح ہو جاتی ہے یا نہیں کہ وہ باقی لوگوں کے ساتھ مل کر گزارہ چلانے کے قابل ہو جائیں۔ غرض میرے نزدیک ان لوگوں کی پچھلی کمزوری صرف اور صرف ان کو غیر ترقی یافتہ (BACK WARD) قرار دینے کی وجہ سے ہے۔ جب تک پنجاب کو آئینی صوبہ قرار نہ دیا گیا تھا وہ بھی پچاس سالہ انتظام کے باوجود سب صوبوں سے پیچھے تھا لیکن جونہی اسے آئینی حکومت ملی دس بارہ سال کے عرصہ میں پنجاب کی حالت ہی بدل گئی ہے اور وہ اب کسی صورت میں دوسرے صوبوں سے کم نہیں۔ تعلیم میں وہ کئی صوبوں سے آگے نکل چکا ہے۔ مادی ترقی میں بھی وہ چھلانگیں مارتا ہوا دوسرے صوبوں کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ پس

غیر ترقی یافتہ علاقوں کی آفت سے ہندوستان کو بچانے کا یہی واحد ذریعہ ہے کہ وہ علاقے جو غیر ترقی یافتہ کہلاتے ہیں انہیں بقیہ صوبوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ اگر ان کے رقبے بڑے ہوتے تو میں سمجھتا کہ خواہ کسی سبب سے بھی ان کی حالت خراب ہو، لیکن جب حالت خراب ہو چکی ہے تو کیوں دوسرے صوبوں سے ملا کر انہیں بھی ان کی وجہ سے خراب کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف چھوٹے چھوٹے رقبے ہیں اور انہیں دوسری آبادی کے ساتھ باقاعدہ مدد دینے سے کوئی نقص پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ دوسرے لوگوں کو ترقی سے نہیں روکیں گے بلکہ ان سے مل کر خود ترقی کر جائیں گے اس لئے انہیں باقاعدہ طور پر آئینی حکومتوں کا جزو بنا دینا چاہئے۔ ہر صوبہ کی آئینی حکومتیں خود ہی اپنے قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی ترقی کا سامان پیدا کر لیں گی۔ زیادہ سے زیادہ اس امر کا انتظام کر دیا جائے کہ ان کی تعلیمی یا صنعتی ترقی کے لئے خاص افسر مقرر ہو جائیں اور خاص رقوم ان کے لئے صوبہ کے فنڈ سے الگ کر دی جایا کریں اس طرح دس پندرہ سال میں ان کی اصلاح ہو جائے گی۔ بہرحال ہندوستان کا حصہ ہوتے ہوئے انہیں الگ رکھنا ہندوستان کے نظام کو کمزور کرنا ہے۔

انہی غیر ترقی یافتہ علاقوں میں سے جزائر انڈمان کو بھی پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان میں چونکہ عمر قید کے سزا یافتہ رہتے ہیں اس وجہ سے ان جزائر کی بھی اصلاح نہیں ہو سکی۔ اب اس قانون کو موقوف کر دیا گیا ہے لیکن یہ دلیل بھی معقول نہیں۔ باوجود قیدیوں کے وہاں رہنے کے اس علاقہ کی اصلاح ہو سکتی تھی اور ہونی چاہئے تھی۔ قیدی صرف ایک محدود علاقہ میں رہتے تھے باقی علاقہ اسی طرح آزاد ہے۔ پس درحقیقت اس علاقہ کے غیر ترقی یافتہ رہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ مدراس گورنمنٹ جس کے ماتحت یہ علاقہ ہے اسے اپنے قریب کے زیادہ تعلیم یافتہ علاقوں کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں ہوئی اور یہ خدا کی مخلوق ڈیڑھ سو سال تک جہالت کے گڑھے میں گری رہی ہے۔ اب وقت ہے کہ انہیں دوسرے لوگوں کی طرح حقوق دے دیئے جائیں۔ اگر وہ آج ان حقوق کو پوری طرح استعمال نہ کر سکیں گے تو کل کریں گے۔ وہ کونسا ملک ہے جس کے سب حصوں نے ایک ہی وقت میں یکساں طور پر آئینی حقوق سے فائدہ اٹھایا ہے۔ پس راستہ کھولنا ہمارا کام ہے فائدہ ہر ایک شخص اپنے ظرف کے مطابق حاصل کرے گا۔ اور راستہ کھلنے پر ہی دل میں نشوونما کی بھی خواہش پیدا ہوگی۔ ہاں اگر کوئی خاص خطرہ ہو تو بعض حفاظتی تدابیر سے اس کا علاج تجویز کر لیا جائے۔

اب میں ان چھوٹے صوبوں کو لیتا ہوں جنہیں پراونشل گورنمنٹ (PROVINCIAL GOVERNMENT) نہیں ملی۔ اول دہلی ہے اس کے متعلق کسی دلیل کے بغیر کمیشن نے رپورٹ کی ہے کہ اس کا سابق انتظام ہی قائم رہے اور وہ یہ ہے کہ پنجاب کونسل جو قانون پاس کرتی ہے گورنر جنرل خاص اعلان کے ذریعہ سے اسے اس صوبہ میں نافذ کر دیتے ہیں۔ دوسرا صوبہ کورگ کا ہے۔ اس کی آبادی ایک لاکھ چھتیس ہزار اور رقبہ ایک ہزار پانچ سو اسی مربع میل ہے۔ ریاست میسور کا ریذیڈنٹ (RESIDENT) بحیثیت عہدہ اس کا چیف کمشنر ہوتا ہے۔ اور ایک کونسل اس صوبہ کو ملی ہے جس کا پریذیڈنٹ خود چیف کمشنر ہے۔ اس وقت تک اس کونسل نے دو قانون پاس کئے ہیں۔ اور سال میں اوسطاً چھ دن اس کے اجلاس ہوتے ہیں۔ کمیشن کی رائے میں اس علاقہ کے نظام میں بھی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ تیسرا علاقہ بلوچستان کا ہے اس میں چیف کمشنر حاکم ہے جو جرگہ کی مدد سے وہاں حکومت کرتا ہے اور اس علاقہ کی ریاستوں کے لئے ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل (AGENT TO THE GOVERNOR GENERAL) کا عہدہ بھی اسی کے پاس ہوتا ہے۔ کمیشن وہاں کے لوگوں کی عادات کی وجہ سے اس ملک کے انتظام میں بھی تبدیلی کی سفارش نہیں کرتا۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ چونتیس ہزار تین سو اڑتیس مربع میل ہے اور آبادی ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن اکثر رقبہ ریاستوں کے ماتحت ہے اور نصف کے قریب آبادی بھی ان میں بستی ہے۔ انگریزی علاقہ قریباً دس ہزار مربع میل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دائمی ٹھیکہ کا علاقہ قریباً چوالیس ہزار میل ہے۔ چوتھا صوبہ اجمیر مارواڑ ہے۔ یہ علاقہ ریاستوں میں گھرا ہوا ہے اور بوجہ دوسرے صوبوں سے دور ہونے کے کمیشن اس کی نئی تشکیل کی بھی سفارش نہیں کرتا۔ اس صوبہ کی آبادی پانچ لاکھ سے کچھ اوپر ہے اور رقبہ دو ہزار سات سَو گیارہ مربع میل ہے۔ موجودہ نظام حکومت یہ ہے کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کے لئے گورنر جنرل کا جو ایجنٹ مقرر ہوتا ہے وہی اس کا چیف کمشنر ہوتا ہے۔ پانچواں صوبہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے جس کی آبادی قریباً چالیس لاکھ ہے۔ اور رقبہ تقریباً چالیس ہزار مربع میل ہے۔ اس کا موجودہ انتظام یہ ہے کہ ایک چیف کمشنر وہاں مقرر ہوتا ہے جو فارن آفس کی معرفت گورنر جنرل کے ماتحت ہے۔ اس صوبہ کے لئے خاص قوانین گورنر جنرل کی طرف سے مقرر ہیں۔ وہ یہ پانچ صوبے ہیں جو علاوہ ان علاقوں کے جو بیک ورڈ (BACK WARD) کہلاتے ہیں اس

وقت تک اصلاحات سے محروم ہیں لیکن کوئی معقول وجہ نہیں کہ انہیں اصلاحات سے محروم رکھا جائے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کورگ کو بڑی آسانی سے مدراس سے ملایا جا سکتا ہے۔ کمیشن کا یہ بیان کہ اس علاقہ کا مذہب اور اس کی قومیت مختلف ہے کوئی دلیل نہیں کیونکہ مذہب اور قومیت کا اختلاف دوسرے علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اصل بات جو دیکھنے والی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ علاقہ جغرافیہ اور تاریخی حیثیت سے الگ حیثیت رکھتا ہو اور دوسرے علاقہ سے مل کر اس کی ترقی میں روک پیدا ہونے کا احتمال ہو اور اس میں الگ صوبہ بننے کی قابلیت ہو اور یہ باتیں کورگ میں نہیں پائی جاتیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اسے مدراس کے ساتھ شامل کر کے اس دو عملی کو جو ملک میں پیدا ہے دور نہ کیا جائے۔ زبان اور مذہب کے متعلق اس قسم کی حفاظتی تدابیر اختیار کرلی جائیں جو دوسری اقلیتوں کو حاصل ہیں۔ جیسے کہ اس علاقہ میں ابتدائی تعلیم مقامی زبان میں ہوگی۔ یا یہ کہ اس علاقہ کے لوگوں کو تناسب آبادی کے لحاظ سے ملازمتیں وغیرہ ملتی رہیں گے۔ غرض ان کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کر کے مدراس کے ساتھ ملا دینا چاہئے۔

اسی طرح اجمیر مارواڑہ کے علاقہ کو باوجود اس کے کہ وہ یو۔پی سے کسی قدر فاصلہ پر ہے یو۔پی میں ملا دینا چاہئے کیونکہ دونوں علاقوں کی زبان اور رسم و رواج بالکل ایک سے ہیں اور ان کے ملانے میں کوئی روک نہیں ہے۔ باقی رہا یہ کہ درمیان میں ریاستوں کا علاقہ ہے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کئی اور علاقے یو۔پی کے ہیں جو مرکز سے قریباً اسی قدر فاصلہ پر ہیں۔ جس قدر کہ اجمیر مارواڑ کا علاقہ ہے۔ اور بعض مقامی ضرورتوں کے لئے الگ انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جیسے مثلاً ایک جوڈیشنل کمشنر کی اسامی مقرر کر دی جائے۔

تیسرا علاقہ بلوچستان کا ہے یہ علاقہ بھی آبادی اور آمدن کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے گو رقبہ کے لحاظ سے کافی ہے۔ کیونکہ خالص انگریزی علاقہ بھی قریباً سَو میل لمبا اور سَو میل چوڑا ہے لیکن اگر ایجنسی کا علاقہ جو براہ راست انگریزی افسروں کے انتظام کے ماتحت ہے شامل کر دیا جائے تو ترپین ہزار مربع میل کا رقبہ ہو جاتا ہے جو بہار اور اڑیسہ کے دو تہائی کے برابر ہے اور آسام سے تھوڑا ہی کم بنتا ہے۔ پس اس وجہ سے یہ علاقہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کو ایک نیا صوبہ بنا دیا جائے۔ تو امید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں اس علاقہ کی آبادی اور آمدن دونوں ترقی کر جائیں گی کیونکہ اس وقت تک بوجہ غیر آئینی صوبہ ہونے کے اس علاقہ میں بسنے سے

لوگ گھبراتے ہیں۔ اور جس قسم کا سلوک نو واردوں سے اس علاقہ میں ہوتا ہے وہ لوگوں کو جرأت نہیں دلاتا کہ اسے اپنا وطن بنائیں۔ لیکن جونہی کہ اس صوبہ کو آئینی شکل دے دی گئی تو پنجاب اور سندھ کی آبادی کا کچھ حصہ شوق سے اس میں اپنے لئے ترقی کے نئے راستے نکالنے کی کوشش کرنے کے واسطے تیار ہو جائے گا۔ یہ خیال کہ اس صوبہ کی آمدن کم ہے اس تجویز کے راستہ میں روک نہیں بننا چاہئے کیونکہ اب بھی اس صوبہ پر امپیریل گورنمنٹ (IMPERIAL GOVERNMENT) ہی روپیہ خرچ کرتی ہے۔ اگر چند سال تک امپیریل گورنمنٹ اور خرچ کرے گی تو اس ملک کی آمدن خود بخود ترقی کرے گی اور وہ ملک کی عظمت اور ترقی کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر کسی طرح اس تجویز پر عمل نہ کیا جاسکے تو پھر میری رائے میں بہتر ہوگا کہ یا تو اسے صوبہ سرحدی کے ساتھ ملا دیا جائے کہ ساری سرحد ایک نظام کے ماتحت آجائے۔ یا پھر سندھ کے ساتھ ملا دیا جائے کہ اس ملک کے ساتھ باقی علاقوں کی نسبت بلوچستان کو زیادہ مشابہت ہے اور ریل کی وجہ سے آمد و رفت میں بھی سہولت ہے۔ باقی جو علاقہ ریاستوں کا ہے وہ دوسری ریاستوں کی طرح پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ (POLITICAL DEPARTMENT) سے تعلق رکھے گا۔

دہلی کی نسبت بھی میں تو یہی کہوں گا کہ اگر اسے الگ رکھنا ہے تو اس کو بھی ایک صوبہ کی شکل دے دی جائے اور اس کا بہتر طریق یہ ہے کہ ایک دو تحصیلیں پنجاب اور ایک دو تحصیلیں یو۔پی کے صوبہ سے لے کر اس کا علاقہ ذرا بڑا کر لیا جائے۔ چونکہ دہلی بوجہ صدر مقام ہونے کے جلد ترقی کر رہا ہے اور امید ہے کہ اپنے صوبہ کے اخراجات برداشت کرنے اس کے لئے مشکل نہ ہونگے نیز چونکہ اس کا بہت سا خرچ بوجہ صدر مقام ہونے کے ہوگا امپیریل گورنمنٹ کو اس کے اخراجات ادا کرنے میں کوئی دریغ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اگر یہ تجویز کسی وجہ سے ناقابل عمل ہو تب بھی میں یہ کہوں گا کہ اسے صوبہ جاتی حکومت دینی چاہئے۔ اگر سوئٹزرلینڈ کی کنٹنز (CANTONS) کو جو دہلی سے بہت چھوٹی ہے لوکل سیلف گورنمنٹ (LOCAL SELF GOVERNMENT) کے اختیارات حاصل ہیں تو کیوں دہلی کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں۔

اب صرف صوبہ سرحدی رہ جاتا ہے۔ میرے نزدیک وہ بھی اسی طرح آزادی کا مستحق ہے جس طرح اور صوبے۔ کمیشن نے ایک عجیب مثال دے کر اس صوبہ کو اس کے جائز حق

سے محروم کرنا چاہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک پاؤڈر میگزین (POWDER MAGAZINE) میں کھڑا ہونے والا شخص اپنے لئے عمل کی آزادی کا مطالبہ کر کے سگریٹ نوشی کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اس سرحد کے مقام کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے وہاں کے باشندے بھی دوسرے صوبوں کی طرح اختیارات نہیں مانگ سکتے۔ اول تو یہ مثال ہی غلط ہے۔ گن پاؤڈر میگزین میں جانے والا تو خود اس جگہ جاتا ہے لیکن یہاں تو آپ خود دوسرے کے گھر میں گن پاؤڈر کی میگزین بنا دیتے ہیں۔ آپ کو یہ اجازت کہاں سے حاصل ہوئی کہ کسی کے گھر میں جا کر بارود رکھ دیں اور پھر اس سے مطالبہ کریں کہ اب تم آگ نہ جلاؤ کہ ہمارے پاؤڈر کو آگ لگ جائے گی۔ صوبہ سرحد والے تو جواب دیں گے کہ یہ حالت تو آپ لوگوں کی اپنی پیدا کی ہوئی ہے ہمیں آزاد کر دو پھر دیکھو ہم اپنے وطن کا انتظام کر لیتے ہیں یا نہیں۔

دوسرے یہ امر دیکھنا چاہئے کہ صوبہ سرحدی کے فساد کا اصل باعث ہی اس صوبہ کو حقوق کا نہ ملنا ہے۔ سرحد کا پٹھان دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی ڈیورنڈلائن سے پرے ایک پوری آزاد حکومت چلا رہا ہے اور اس سے ورے بھی ایک اندرونی طور پر آزاد حکومت حاصل ہے لیکن یہ اس کا رشتہ دار اور اس سے زیادہ تعلیم یافتہ اپنے گھر کا انتظام کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ اپنے آزاد علاقہ کے بھائیوں کو شورش پر آمادہ کرتا رہتا ہے اور وہ لوگ بھی اس کی ہمدردی میں حکام سرحد کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب ان لوگوں کے دلوں میں بھی آزادی کا ولولہ اٹھنے لگے جو آزاد حکومتوں سے نہ مکانی قرب رکھتے ہیں اور نہ نسلی تو وہ لوگ جو آزاد حکومتوں کے ہمسایہ ہیں اور نسلاً ان سے متحد ہیں حتیٰ کہ ان کی آپس میں کثرت سے شادیاں بھی ہوتی رہتی ہیں وہ آزادی کے جذبات سے خالی رہیں۔ اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ انہیں آزادی سے محروم کر کے امید کی جائے کہ وہ گن پاؤڈر کے خیال سے دیا سلائی نہ جلائیں۔ وہ تو ضرور دیا سلائی جلائیں گے تاکہ گن پاؤڈر اُڑ جائے اور شاید اس طرح ان کے لئے آزادی کا راستہ کھل جائے۔

کمیشن جس نتیجہ پر صوبہ سرحدی کے متعلق پہنچا ہے وہ بالکل نرالا ہے۔ دنیا کی دوسری اقوام اپنے سرحدی قبائل کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ وہ ملک کے لئے بطور سپر کے کام دیں۔ لیکن کمیشن یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ انہیں دوسروں کی طرح حقوق نہ دیئے جائیں کیونکہ یہ سرحد پر ہیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ وہ کبھی مطمئن نہ ہوں اور

ہمیشہ سرحدی قبائل کو اُکساتے رہیں۔ انگلستان اگر جزیرہ ہے تو کیا دنیا کی اور حکومتیں ایسی ہیں یا نہیں جن کی حدود دوسرے ممالک سے ملتی ہیں۔ پھر کیا وہ اپنے ان علاقوں کو آزادی سے محروم کر دیا کرتی ہیں؟

یہ بات کہ سرحد تبھی مضبوط ہو سکتی ہے جب کہ سرحدی صوبہ کے لوگ یہ محسوس کریں کہ یہ ہمارا ملک ہے اور جو شخص حملہ کرتا ہے وہ ہماری آزادی میں دخل اندازی کرتا ہے ایسی موٹی بات ہے کہ ایک بچہ بھی اسے سمجھ سکتا ہے۔ سرحدیوں کو یہ یقین دلا دو کہ تم کو دوسرے صوبوں کی طرح حقوق نہیں مل سکتے تو دیکھو کہ وہ کس طرح آئے دن کوشش کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت سے آزاد ہو کر اپنی ہمسایہ اقوام اور اپنے ہم قوم لوگوں سے مل جائیں۔ لیکن اس کے برخلاف ان کو اپنے صوبہ میں آزاد حکومت دو پھر دیکھو کہ وہ کس طرح سرحد کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ اسی دن سے آزاد قبائل بھی دخل اندازی سے باز آ جائیں گے جس دن کہ سرحدی صوبہ کو اختیارات مل گئے کیونکہ وہ انگریزی علاقہ کے پٹھانوں سے گہرے تعلق پیدا کر چکے ہیں اور اگر وہ ان پر حملہ آور ہوں گے تو انہیں ان تعلقات کو خیر باد کہنا پڑے گا اور پشاور کوہاٹ اور بنوں کے لوگوں سے ان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے اس لئے وہ ان حملوں سے باز رہیں گے۔ اور جب حملوں سے باز رہیں گے تو لازماً اپنے گزارہ کے لئے انہیں اور کوئی ذریعہ معاش کا تلاش کرنا پڑے گا اور اس طرح باہستگی وہ متمدن ہوتے چلے جائیں گے۔

آخر میں مَیں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ کمیشن بھی اس امر کو تو تسلیم کرتا ہے کہ موجودہ انتظام چھوٹے صوبوں کا عارضی ہے لیکن اس نے یہ غور نہیں کیا کہ کم سے کم کورگ اور اجمیر مارواڑہ کے متعلق جو مشکلات ہیں وہ عارضی نہیں ہیں۔ نہ کورگ والوں کا مذہب اور زبان تبدیل ہونے کا کوئی سیاسی احتمال ہے اور نہ اجمیر مارواڑہ کا علاقہ کسی وقت کسی دوسرے صوبہ کے قریب ہو سکتا ہے پھر اس وقت ان کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کرنے سے کونسا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آئندہ پر تو ان امور کا فیصلہ ڈالا جاتا ہے جن کے متعلق احتمال ہوتا ہے کہ شاید کل کو حالات تبدیل ہو جائیں۔ جب حالات سیاستاً وہی رہیں گے جو آج ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کا فیصلہ بعد میں کیا جائے۔ پس یا تو یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ ان چھوٹے چھوٹے چند صوبوں کی وجہ سے ہندوستان کی فیڈریشن کبھی مضبوط نہ کی جائے گی اور یا پھر انہیں کسی نہ کسی صوبہ کے ساتھ ملا دیا جائے۔

اسی طرح وہ صوبے جنہیں مستقل شکل میں رکھنا ہے ان کے متعلق بھی ابھی فیصلہ ہونا چاہئے کہ انہیں بھی آزاد حکومت ملے گی کیونکہ بغیر اس کے فیڈریشن مضبوط نہیں ہو سکتی۔ ہاں آزاد حکومت سے مراد یہ نہیں کہ تمام صوبوں کو ایک ہی شکل کی حکومت ملے۔ میں اسے بالکل غیر معقول بات سمجھتا ہوں کہ ہمارے وزراء کی تنخواہیں بھی انگلستان مقرر کرے۔ اگر تنخواہوں تک کا سوال انگلستان نے حل کرنا ہے تو پھر آزادی کا کیا مطلب ہوا۔ اصل طریق فیصلہ کا تو یہ ہے کہ وہ آزادی کی مقدار جو اس وقت ہندوستان اور ہندوستانیوں کو ملتی ہے اس کا فیصلہ اب ہو جائے۔ اور پھر ہر صوبہ کی کونسل اپنا نظام حکومت خود تجویز کرے۔ یہی اتحادی حکومت کی غرض ہوتی ہے اور اگر یہ غرض پوری نہ ہو تو اتحادیت کی بنیاد یقیناً کمزور ہو گی۔ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کی ریاستوں کے نظام آپس میں مختلف ہیں لیکن ان کی فیڈریشن میں کوئی نقص نہیں اسی طرح ہندوستان میں ہونا چاہئے۔ اگر پنجاب اپنے وزراء کو تین ہزار تنخواہ دینا چاہتا ہے اور بنگال چھ ہزار تو اس پر انگلستان کے باشندوں کو کیا اور کیوں اعتراض ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر انتخاب کے طریقوں میں وہ فرق کرنا چاہتے ہیں بغیر اس کے کہ کسی قوم یا کسی جماعت کے حق کو نقصان پہنچے تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وزارت کے متعلق مختلف صوبے آپس میں اختلاف کریں۔ کوئی صوبہ وزارت کا انتخاب کونسلوں کے سپرد کرے۔ لیکن کونسلوں کی عمر تک انہیں مستقل عہدہ دے دے۔ دوسرا ان کا عہدہ پر قائم رہنا کونسلوں کی مرضی کے تابع رکھے تو اس سے نہ تو حکومت ہی کمزور ہوتی ہے نہ فیڈریشن میں کوئی نقص آتا ہے۔ غرض بیسیوں طریق حکومت کے جو مختلف ملکوں کے تجربہ میں آچکے ہیں، انہیں مدنظر رکھتے ہوئے صوبہ جات اگر اپنی ضرورتوں کے مطابق کوئی نظام قائم کریں تو اس پر انگلستان کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ جس بات کی حد بندی کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ بادشاہِ معظّم نے جو حقوق محفوظ رکھے ہوں یا جو حقوق مرکزی گورنمنٹ کو دیئے گئے ہوں یا جو حقوق اقلیتوں کے لئے محفوظ رکھے گئے ہوں انہیں تلف نہ کیا جائے۔ ان تینوں شرطوں کو پورا کرنے کے بعد ہر صوبہ کو اجازت ہو کہ اپنی ضرورت کے مطابق انتظام کرے اور اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو چھوٹے صوبوں کو اپنے صوبوں کا انتظام کرنے میں کوئی دقت نہ ہو گی۔ سوئٹزرلینڈ اگر اپنے وزراء کو نہایت قلیل معاوضہ دیتا ہے اور اس کے نظام میں کوئی نقص نہیں آجاتا تو اگر بلوچستان اور صوبہ سرحد بھی ایسا ہی کریں تو اس میں کیا نقص ہے۔ آخر صوبہ سرحدی کا ہمسایہ

افغانستان اپنے وزراء کو بہت کم تنخواہیں دیتا ہے اور اس بناء پر اس کے انتظام کو ناقص نہیں کہا جاسکتا۔ اگر کوئی نقص ہے تو اس کی وجوہ اور ہیں۔ اسی طرح موجودہ شکل گورنمنٹ کی جو سب صوبوں میں یکساں طور پر جاری ہے اس کے اندر بھی حسب ضرورت تبدیلی کر کے کام کو ہلکا اور اخراجات کو بہت کم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک کی مثال ہے کہ جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ۔

غرض میرے نزدیک فیڈریشن کے اصل کو صحیح طور پر چلانے کیلئے ہندوستان کے تمام برطانوی علاقہ کا اسی وقت ایک مکمل فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ ورنہ حکومت میں ثنائیت (دوشاخی) قائم رہے گی اور ہر ایک حکومت خواہ صوبہ جاتی ہو خواہ مرکزی اس میں یہ دُہری صورت پائی جائے گی کہ ایک حصہ ملک کے لحاظ سے وہ آئینی اور ایک حصہ ملک کے لحاظ سے غیر آئینی حکومت رہے گی۔ بلکہ مرکزی حکومت میں تو یہ تین شاخیں پیدا ہو جائیں گی۔ آئینی مرکزی اور غیر آئینی مرکزی اور صوبہ جاتی۔ کیونکہ چھوٹے صوبوں کے لئے وہ صوبہ جاتی حکومت کی قائم مقام رہے گی۔ کانفرنس اگر اس امر کا فیصلہ کئے بغیر اٹھے گی تو وہ یقیناً ایک سخت غلطی کی مرتکب ہوگی اور دونوں فریق کچھ عرصہ کے بعد ان علاقوں کے ذریعہ سے نئے فتنے اٹھتے ہوئے دیکھیں گے۔

اب میں اُن صوبہ جات کو لیتا ہوں جنہیں صوبہ جاتی آزادی کی پہلی قسط مل چکی ہے۔ ان صوبہ جات کی دو حالتیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ جیسے برما اور بعض پھٹ کر دو صوبے بنا چاہتے ہیں۔ جیسے سندھ، اُڑیسہ اور کرناٹک وغیرہ۔ الگ ہونے کا مطالبہ صرف برما کا ہے اور میرے نزدیک یہ مطالبہ بالکل معقول ہے۔ برما کبھی بھی صحیح طور پر ہندوستان کا حصہ نہیں بنا بلکہ تاریخی اور جغرافیائی اور نسلی اور زبانی اور اقتصادی اور تمدنی طور پر وہ بالکل ہندوستان سے الگ ہے اور عملاً بھی اب تک الگ رہا ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ آف انڈیا کے دفاتر میں تمام صوبہ جات کے افراد ملتے ہیں لیکن برمی نہیں ملتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ہندوستان سے اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہوئے اس کو ایک دوسرا ملک خیال کرتے ہیں اور اس کے مرکز میں آ کر اپنے حقوق لینے کو بھی ایک قسم کی جلاوطنی خیال کرتے ہیں۔ پس جو صوبہ اس طرح علیحدہ رہا ہے اور جو ہر شعبہ زندگی میں ہندوستان سے مختلف ہے اسے ہندوستان سے ملائے رکھنا اسے غلام بنانے کے مترادف ہے۔ برما کا اختلاف ہندوستان

سے سیلون کی نسبت بھی زیادہ ہے۔ اور اگر سیلون کو اس سے الگ رکھا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ برما کو الگ نہ رکھا جائے۔ پس اس صوبہ کو تو الگ اور آزاد حکومت ملنی چاہئے۔ اور جب ہم یہ فیصلہ کر دیں تو برما کے سوال کے متعلق ہمیں کسی مزید توجہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

نئے صوبہ جات

دوسرا سوال صوبہ جات کی تقسیم کا ہے۔ جب سے بعض صوبہ جات کو ایک حد تک آزادی حاصل ہوئی ہے ملک کے کئی حصوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں بھی مستقل صوبہ قرار دیا جائے۔ یہ علاقے مندرجہ ذیل ہیں۔ سندھ ' اڑیسہ ' کرناٹک ' کیرالا اور آندھرا۔ نہرو رپورٹ نے کرناٹک اور سندھ کے دعویٰ کی تائید کی ہے اور سائمن رپورٹ نے اڑیسہ اور سندھ کے علاقہ کی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ تینوں صوبے الگ حکومت دیئے جانے کے قابل ہیں اور ایسا کر دینا چاہئے تاکہ ہندوستان کے صوبوں کی تقسیم کا ایک دفعہ ہی فیصلہ ہو جائے۔ بقیہ علاقے چھوٹے اور غیر اہم ہیں۔ ان تین نئے صوبوں کو بنانے سے بمبئی ' مدراس اور بنگال اور بہار کے علاقے کاٹنے پڑیں گے۔ لیکن مؤخر الذکر علاقے کافی آباد ہیں اور کم سے کم آبادی کے لحاظ سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور بوجہ آبادی کی زیادتی کے ان میں مالی طور پر جلد مضبوط ہونے کی طاقت تسلیم کرنی چاہئے۔ باقی رہا مدراس ' سو اس کا رقبہ تو پہلے ہی بہت زیادہ ہے اور آبادی بھی کافی ہے۔ دوسرے کرناٹک کو الگ کر کے کورگ کو اس میں شامل کر دیا جائے تو کسی قدر اس علاقہ کی تلافی ہو جائے گی۔ بمبئی میں سے ایک بہت بڑا حصہ یعنی سندھ نکل جاتا ہے لیکن پھر بھی ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل کے قریب اس کا رقبہ باقی رہ جاتا ہے اور دو کروڑ تیس لاکھ کے قریب آبادی جس سے اس صوبہ کی آبادی اور رقبہ دونوں پنجاب کے رقبہ اور آبادی کے قریب آ جاتے ہیں اور یہ حالت اس صوبہ کے لوگوں کے لئے ہرگز پریشان کن نہیں ہونی چاہئے۔

ان سب صوبوں میں سے سندھ کا مطالبہ سب سے زبردست ہے۔ سندھ تاریخ کے لحاظ سے ' جغرافیہ کے لحاظ سے ' زبان کے لحاظ سے ' عادات اور رسوم کے لحاظ سے ' آب و ہوا کے لحاظ سے ' لباس کے لحاظ سے غرض کسی لحاظ سے بمبئی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ کبھی بھی تاریخی زمانہ میں یہ علاقہ بمبئی سے متحد نہیں ہوا بلکہ پرانے زمانہ میں تو اسے ہندوستان سے بھی الگ سمجھتے تھے اور اسلامی حملہ سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس ملک پر ہندوستانی راجوں نے حکومت کی ہے۔ پس جو علاقہ کہ بمبئی سے ہر رنگ میں جُدا ہے اسے اس کے اکثر باشندوں کی خواہش

کے خلاف بمبئی سے ملحق رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس ملک کی مالی حالت اچھی نہیں اور اس وجہ سے یہ اپنا بوجھ خود نہیں اٹھا سکے گا۔ نہرو رپورٹ اور سائمن رپورٹ دونوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے مگر میرے نزدیک یہ اعتراض ان کا درست نہیں۔ اگر آسام اپنا بوجھ آپ اٹھا سکتا ہے تو کیوں سندھ جو پنجاب کے دریاؤں کے دہانے پر ہے اور جو کراچی جیسی بندرگاہ رکھتا ہے ترقی نہیں کر سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ سندھ کی مالی حالت بمبئی سے ملحق ہونے کی وجہ سے کمزور ہے ورنہ جیسا کہ کئی تجربہ کار انگریزوں اور ہندوستانیوں نے جو اس صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنی تحقیق بتائی ہے یہ صوبہ اب تک بہت ترقی کر چکا ہوتا۔ بمبئی اور کراچی میں رقابت ہے اور اس کی وجہ سے کراچی کی ترقی کے راستہ میں ہمیشہ روک پیدا کی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح اس کی زمینوں کے آباد کرنے اور اس میں سڑکوں اور ریلوں کے جاری کرنے کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ اسی طرح ملک میں تعلیم پھیلانے کی طرف بھی بہت کم توجہ ہوئی ہے اور جب کسی صوبہ کو ترقی کے سامان نہ دیئے جائیں گے تو وہ ترقی کس طرح کرے گا۔ بمبئی سے الگ ہوتے ہی خصوصاً اس کی نئی نہروں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ صوبہ جلد ترقی کر جائے گا اور اپنا بوجھ خود اٹھا سکے گا۔ اس وقت تک مرکزی حکومت سے اسے اپنے اخراجات کو چلانے کے لئے کچھ قرض دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کا نظام حکومت ایسا تیار کیا جا سکتا ہے کہ باوجود پوری آزادی کے اس کا خرچ زیادہ نہ ہو۔ گورنر اور وزراء کی تنخواہیں کم ہوں' وزراء کی تعداد کم ہو' کونسل کے ممبروں کی تعداد کم ہو' شروع میں اسے الگ ہائی کورٹ نہ دیا جائے بلکہ بمبئی یا پنجاب سے عدالتوں کا الحاق رہے' یونیورسٹی چند سال تک نہ بنے' غرض کئی طرح کفایت کر کے اس صوبہ کو جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ باقی رہا وہ قرض جو نہروں کی وجہ سے بمبئی نے اس کیلئے لیا ہے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نہروں کے اجراء پر زمینوں کی فروخت سے ادا کیا جا سکے گا۔

میرے نزدیک سب سے اہم بات جسے مدنظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں عام احساس ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان زیادہ ہیں انہیں یا تو دوسرے علاقوں سے ملحق کر دیا جاتا ہے یا پھر حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحدی اور بلوچستان کی مثال ظاہر ہے۔ پنجاب بہت قریب زمانہ سے حقوق حاصل کر سکا ہے۔ بنگال کو بھی ناجائز تدابیر سے دیر

تک ہندو صوبہ بنائے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۳۳ء میں آگرہ کا صوبہ بنانے کی اجازت لے چکی تھی اور یہ فیصلہ تھا کہ بہار کا علاقہ اس کے ساتھ ملا دیا جائے گا لیکن اس پر عمل نہ ہوا اور آخر لارڈ کرزن (LORD CURZON) نے جن کا حسن سلوک وہ مسلمان جو تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں کسی صورت میں نہیں بھلا سکتے۔ ۱۹۰۵ء میں مشرقی بنگال کو جُدا کر کے مسلمانوں کی ترقی کا راستہ کھولا۔ مگر ان پر وہ لے دے ہوئی کہ آخر ملک معظّم کو دربار دہلی میں اس تقسیم کو منسوخ کرنا پڑا۔ لیکن وہی غرض جو لارڈ کرزن کے ذہن میں تھی کہ مسلمانوں کو کسی طرح ترقی کا موقع ملے اس طرح پوری کی گئی کہ بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس طرح مسلمانوں کا عنصر بنگال میں زیادہ ہو گیا۔ غرض مسلمانوں کو یہ شکایت ہے اور مجموعی حیثیت میں نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بجا شکایت ہے کہ کسی نہ کسی بہانے سے اسلامی صوبوں کو حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ پس صحیح طریق کار یہی ہے کہ ان کی اس دیرینہ اور جائز شکایت کو دور کر کے فتنہ و فساد کے سامانوں کو جس قدر ہو سکے کم کیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ جس قدر حصے ہندوستان کے آئینی نظام سے باہر ہیں ان کو کسی نہ کسی طرح نظام میں شامل کر دیا جائے اور کسی حصہ ملک کو دوسرے سے زائد آزادی نہ دی جائے تاکہ فیڈریشن اصولی طور پر مکمل ہو جائے اور صوبہ سرحدی اور بلوچستان کو آزادی میں برابر گو شکل کے لحاظ سے مختلف حکومت جس کی تدریجی ترقی کے سامان پورے طور پر خود ان صوبوں کے قانون اساسی میں موجود ہوں دی جائے۔ سندھ کو فوراً بمبئی سے الگ کر کے آزاد آئینی صوبہ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے اور اڑیسہ اور کرناٹک کو بھی الگ الگ صوبے بنا دیا جائے۔ اسی طرح اگر دہلی کو الگ صوبہ بنایا گیا تو چودہ صوبے ہو جائیں گے اور اگر اسے کسی اور علاقہ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تو تیرہ صوبے ہندوستان کے ہو جائیں گے جن میں سے پانچ اسلامی صوبے ہونگے اور ۸ ہندو صوبے۔

باب سوم

صوبہ جات کی حکومت

سائمن رپورٹ نے چونکہ موجودہ طریق حکومت کو قائم رکھنے کی سفارش کی ہے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں دو علیحدہ علیحدہ باب باندھے ہیں۔ ایک میں گورنروں کے صوبوں پر بحث کی ہے۔ اور دوسرے میں چیف کمشنروں کے صوبوں کے متعلق بحث کی ہے۔ لیکن چونکہ میرے نزدیک یہ اصول ہی غلط ہے کہ ایک فیڈریشن کے مختلف حصے مختلف قسم کے اختیارات رکھتے ہوں کیونکہ فیڈریشن کے معنی ہی یہ ہیں کہ عملاً یا ذہناً ہر ایک حصہ پورا آزاد ہو اور اپنی طرف سے مرکز کو بعض اختیارات اتحاد ملکی کی خاطر دے اس لئے میں نے پہلے باب میں یہ بتایا ہے کہ سب حصص ملک کو ایک ہی سطح پر لے آنا چاہئے اور جو حصے ملک کے گورنروں کے صوبوں سے باہر ہیں، انہیں یا تو کسی دوسرے صوبہ سے ملا دینا چاہئے یا پھر ان کو مستقل صوبہ کی شکل میں تبدیل کر دینا چاہئے۔ پس ان حالات میں مَیں نے اس باب کا عنوان ''گورنروں کے صوبے'' نہیں بلکہ ''صوبہ جات کی حکومت'' رکھا ہے۔ اس حکومت کے مختلف حصوں میں سے سب سے پہلے میں ایگزیکٹو (EXECUTIVE) کو لیتا ہوں۔

ا۔ صوبہ جات کی ایگزیکٹو

دو شاخی حکومت

سائمن رپورٹ نے مختلف تجاویز پر بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دوشاخی (DAIRCHY) حکومت کا طریق ہندوستان سے اب بالکل مٹا دیا جائے۔ عام حالات کے مطابق میرے نزدیک بھی اب وقت آگیا ہے کہ ایسا ہی کیا جائے۔ گو میرے نزدیک دوشاخی حکومت کے خلاف جو الزامات ہیں وہ اس قدر اس طریق حکومت پر وارد نہیں ہوتے جس قدر کہ اس تشکیل پر جو اس طریق حکومت کو ہندوستان میں دی گئی تھی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے پہلا شخص میں تھا جس نے اس طریق حکومت کی احمدیہ جماعت کے میموریل میں سفارش کی تھی لیکن میری سکیم مندرجہ ذیل اصل پر مبنی تھی کہ جو حصہ اختیارات کا ملک کے سپرد کیا جائے وہ پورے طور پر اس کے سپرد رہے اور جو حصہ سپرد نہ ہو وہ پورے طور پر سپرد نہ ہو۔ اُس وقت مسٹر مانٹیگو (MR. MONTANGUE) اس سے متأثر معلوم ہوتے تھے لیکن دھلی کے بعد جہاں احمدیہ جماعت کا وفد پیش ہوا تھا کلکتہ میں یہی سکیم دوسری شکل میں مسٹر کرٹس کی مدد سے ان کے سامنے پیش کی گئی اور چونکہ وہ زیادہ مکمل صورت میں تھی مسٹر مانٹیگو اس کی طرف راغب ہو گئے۔ جب ان کی رپورٹ آئی تو پنجاب گورنمنٹ نے جس کے رئیس اس وقت سراوڈوائر (SIR O'DWYER) تھے ایک کاپی اس کی میرے پاس بھی بھجوائی اور میری رائے اس کے متعلق دریافت کی۔ میں نے اس پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھا اور بتایا کہ یہ طریق فساد پیدا کرے گا۔ بہتر یہ تھا کہ جو اختیارات انہوں نے دینے تجویز کئے ہیں ان سے تھوڑے اختیارات ہندوستانیوں کو دیئے جاتے لیکن مکمل طور پر دیئے جاتے اور جن امور میں اختیار نہیں دیا گیا ان میں خواہ اظہار رائے کی اجازت دی جاتی یا نہ لیکن کونسل یا اسمبلی کو متفقہ طور پر اس بارہ میں کوئی ریزولیشن پاس کرنے کی اجازت نہ دی جاتی کیونکہ انسانی فطرت کے یہ خلاف ہے کہ وہ ایک حد تک چل کر درمیان میں کھڑا رہ سکے۔ اس وقت میری اس رائے کی طرف توجہ نہیں دی گئی غالباً اس وجہ سے کہ وہ ایک مذہبی امام کی طرف سے تھی نہ کہ کسی سیاسی لیڈر کی طرف سے' مجھے خوشی نہیں بلکہ افسوس ہے کہ وہی خطرات جن کو میں نے تفصیلاً بیان کیا تھا ظاہر ہوئے اور ملک میں فساد کی ایک رَو چل گئی۔ پس میرے نزدیک دو شاخی حکومت کی وہ شکل جو ہندوستان میں جاری کی گئی ناقص تھی۔ دوسری صورت میں وہی دو شاخی حکومت کامیاب ہو سکتی تھی۔ مگر بہرحال اب جب کہ اس طریق حکومت کا تجربہ کیا گیا ہے اب واپس لوٹ کر پھر نئے سرے سے تجربہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف پچھلے بارہ سال میں ملک کے حالات بھی بدل گئے ہیں اور اب ضرورت ہے کہ قدم آگے بڑھایا جائے اس لئے میں کمیشن کی رپورٹ کی تائید کرنے پر مجبور ہوں۔ گو میرا خیال ہے کہ کمیشن کی رپورٹ کی پوری طرح تصدیق کرنا اب بھی ملک کو فسادات کا آماجگاہ بنا دے گا۔ مگر میری اپنی رائے جو کچھ بھی اس بارے میں ہے خواہ اسے میرے انگریز دوست ناپسند کریں یا ہندوستانی دوست اس پر ناراض ہوں میں آگے چل کر تفصیلات میں بیان کردوں گا گو بعض امور کے متعلق چونکہ

دونوں فریق پہلے سے فیصلہ کر چکے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری آواز صدا بہ صحرانہ ثابت ہو۔

گورنرز

ہر صوبہ جو ہندوستان میں پہلے سے موجود ہے یا نیا بنایا جائے گا اس کی حکومت کا سردار ایک گورنر ہو لیکن گورنروں کے موجودہ طریق انتخاب میں تبدیلی کی جائے۔ اس وقت یہ قاعدہ ہے کہ پریذیڈنسی گورنروں کے سوا سب گورنر سول سروس میں سے منتخب کئے جاتے ہیں اور اس طرح جب کہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے گورنر انگلستان سے براہ راست آتے ہیں بہار، آسام، یو۔پی، پنجاب اور سنٹرل پراونسز (CENTRAL PROVINCES) کے گورنر ہندوستان کی سول سروس میں سے ہی منتخب کئے جاتے ہیں۔ دونوں طرح کے انتخاب میں بعض نقائص بھی ہیں اور بعض خوبیاں بھی لیکن یہ امر کہ فلاں فلاں صوبہ کے گورنر براہ راست آئیں اور فلاں فلاں کے وہیں سے منتخب ہوں بالکل غیر طبعی اور غیر معقول ہے۔ اس کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ بنگال میں تو براہ راست آنے والا گورنر مفید ہو سکتا ہے اور بہار و اڑیسہ میں ہندوستان کی سول سروس سے چُنا ہوا گورنر مفید ہو سکتا ہے۔ سب صوبوں میں ایک ہی اصل برتنا چاہئے تھا یا سب جگہ سول سروس سے گورنر چنا جاتا یا سب جگہ براہ راست آتا۔ یا سب جگہ کے لئے دروازہ کھلا رکھا جاتا جیسا مناسب ہوتا کر لیا جاتا۔ جب سول سروس میں قابل آدمی موجود ہوتا وہاں سے چُن لیا جاتا جب وہاں سے خاص قابلیت کا آدمی نہ ملتا تو براہ راست انگلستان سے آدمی بھجوا دیا جاتا۔ مگر جو طریق اختیار کیا گیا ہے وہ کسی اصل پر بھی مبنی نہیں مگر جو کچھ پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ اب نئے تغیرات جن کی سفارش کمیشن نے کی ہے ان کے ماتحت لازماً اس طریق میں تغیر کرنا ہوگا۔ وہ تغیرات یہ ہیں کہ کمیشن سفارش کرتا ہے کہ ڈائی آرکی (DAIRCHY) اُڑا دی جائے اور منسٹر اور ایگزیکٹو منسٹر کا فرق مٹا دیا جائے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ سروسز اطاعت کے لحاظ سے پوری طرح منسٹروں کے ماتحت آجائیں گی۔ جب کہ اس سے پہلے منسٹروں کا اقتدار ان پر بہت ہی کم ہوتا تھا۔ اسی طرح کمیشن کی یہ بھی رپورٹ ہے کہ گورنر کو اختیار ہونا چاہئے کہ وہ چاہے تو سب منسٹر منتخب شدہ نمائندوں میں سے ہی مقرر کر دے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بالکل ممکن بلکہ غالب ہے کہ ایک وقت ایسا آجائے کہ تمام سول سرونٹس وزراء کے ماتحت ہوں اور ان کی ہدایتوں کے ماتحت عمل کریں کیونکہ سب ایگزیکٹو ان کے قبضہ میں ہوگی۔ لیکن اگر قاعدہ یہ ہوا کہ پریذیڈنسی صوبوں کے سوا باقی سب جگہ گورنر سول سرونٹس میں سے مقرر

ہونگے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ایک شخص منسٹر کے ماتحت کام کرتا ہوا یکدم گورنر بن کر اس کا حاکم ہو جائے گا جو اچھے انتظام کے منافی ہے۔

موجودہ نظام کے ماتحت بھی مذکورہ بالا صوبوں میں ہر سول سرونٹ بالقوۃ گورنر ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی موجودہ نظام میں منسٹر اس کے اوپر براہ راست افسر نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ نقص پیدا نہیں ہوتا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ نئے تغیر کے بعد اگر اس نقص کی اصلاح نہ کی گئی تو کبھی بھی منسٹروں میں صحیح طور پر کام کرنے کی جرأت نہ پیدا ہوگی اور نہ سول سرونٹس میں صحیح طور پر ان کے احکام کو بجالانے کی روح پیدا ہوگی جس سے نظام ڈھیلا ہوتا چلا جائے گا۔ پس اگر دو شاخی حکومت کو دور کرنا ہے تو ساتھ ہی یہ فیصلہ کرنا بھی ضروری ہے کہ آئندہ ان صوبوں کے گورنر بھی براہ راست آئیں گے۔

اس تبدیلی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس طرح سول سرونٹس کے لئے ترقی کی گنجائش کم رہ جاتی ہے لائق آدمی اس طرف آنے سے گریز کریں گے لیکن میرے نزدیک یہ اعتراض درست نہیں۔ اگر مدراس، بمبئی اور بنگال کو لائق آدمی مل جاتے ہیں تو کیوں ان صوبوں کو نہ ملیں گے؟ ایک اور علاج بھی اس نقص کو رفع کرنے کا کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ بجائے اس کے کہ بعض صوبوں میں سے ایسے افسروں کو جو اس وقت کام کر رہے ہوں گورنر بنایا جائے گورنر علاوہ انگلستان کے تجربہ کار سیاسیوں کے ایک حصہ گورنروں کا ہندوستان کے ایسے ریٹائرڈ افسروں میں سے بھی مقرر کیا جایا کرے جو کم سے کم پانچ سال پہلے ہندوستان کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہو۔ اس طرح اس ملازمت میں بھی پہلی سی کشش باقی رہے گی اور مذکورہ بالا نقص بھی دور ہو جائے گا بلکہ تجربہ کے ساتھ ساتھ وہ زائد فوائد بھی حاصل ہو جائیں گے جو براہ راست گورنر مقرر کرنے کے بیان کئے جاتے ہیں۔

وزارت

سائمن رپورٹ کی سفارش یہ ہے کہ:-

(۱) منسٹری متفقہ طور پر کونسلوں کے سامنے ذمہ دار ہو۔

(۲) گورنمنٹ کے سب ممبر منسٹر کہلائیں۔ ایگزیکٹو ممبر اور منسٹر کی تفریق مٹا دی جائے۔

(۳) منسٹر کیلئے کوئی شرط نہ ہو کہ وہ منتخب شدہ یا نامزد شدہ ممبر ہی ہو بلکہ سرکاری افسر یا پبلک کے کسی آدمی کو جو کونسل کا ممبر نہ بھی ہو وزارت کے عہدہ پر مقرر کرنے کی گورنر کو

اجازت ہو۔

(۴) وزارت کے خلاف صرف بحیثیت مجموعی اظہار ناراضگی ہو سکتا ہے ایک وزیر کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

(۵) وزراء کے علاوہ نائب وزراء کی جگہیں بھی نکالی جائیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ جہاں مذہبی اختلاف شدت سے ہو گا وہاں دو مختلف مذاہب کے وزیر اور نائب وزیر مقرر کر کے ایک دوسرے کے ظلم سے حفاظت کی جاسکے گی۔

مذکورہ بالا اصول کی اصل غرض یہ بتائی گئی ہے کہ وزارت ہر روز تبدیل نہ ہو گی بلکہ ایک حد تک مستقل عرصہ حیات اسے مل جائے گا اور اس طرح وہ اچھا کام کر سکے گی۔ دوسرے یہ کہ وسیع حلقہ انتخاب کی وجہ سے زیادہ اعلیٰ کارکنوں پر مشتمل وزارت تیار ہو سکے گی۔

میرے نزدیک یہ سفارش کمیشن کی کہ نائب وزراء کی جگہیں بھی نکالی جائیں' بہت معقول ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کا حکومت کے بنیادی قوانین سے کیا تعلق ہے؟ یہ معاملہ صوبہ جاتی کونسلوں سے متعلق ہے اور انہی پر اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ اس وقت قانون میں صرف یہ بات رکھ دینی چاہئے کہ نئے طریق پر مقرر ہونے والی صوبہ جاتی کونسلوں کے معاً بعد گورنر ایک شخص کے سپرد وزارت بنانے کا کام کرے اور وہ پہلے اجلاس میں پریزیڈنٹ کے انتخاب کے بعد اپنی ضرورتوں کو پیش کر کے کونسل سے وزارتوں اور نائب وزارتوں کی تعداد مقرر کرالے۔ اس طرح ہر صوبہ میں اس کی ضرورت کے مطابق وزراء مقرر ہوں گے۔ یہ طریق درست نہیں کہ بے تعلق اور بغیر تجربہ کئے کچھ لوگ انگلستان میں بیٹھ کر سب صوبوں کی ضرورتوں کا آپ ہی قیاس کر کے وزارتیں مقرر کر دیں۔ اور نہ گورنروں کے سپرد یہ کام ہونا چاہئے کیونکہ یہ کام کونسلوں کا ہے کہ وہ ان کاموں کی جو انہوں نے جاری کرنے ہیں تعیین کریں۔ پس انہی کا یہ کام بھی ہونا چاہئے کہ وہ کام کے مطابق عہدے بھی تجویز کریں اور اسی طرح تنخواہیں مقرر کرنا بھی ان کا کام ہے۔ ہاں وہ تنخواہیں ذاتی نہیں ہونی چاہئیں یعنی یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہر وزیر کے تعین پر تنخواہ بدلی جاسکے۔ ہاں یہ شرط ہونی چاہئے کہ اگر سول سروس میں سے کسی کو وزیر مقرر کیا جائے تو اس کی تنخواہ اگر وزیر کی تنخواہ سے زائد ہو تو اسے اس کی زائد تنخواہ ملتی رہے۔ باقی جو امور کمیشن نے وزارت کے متعلق مقرر کئے ہیں گو بظاہر معمولی

معلوم ہوتے ہیں مگر میرے نزدیک ان کا مُضِر اثر صوبوں کی سیاسی ارتقاء پر پڑے گا کیونکہ یہ سب اصول پارٹی سسٹم کو کمزور کرنے والے ہیں۔ مثلاً یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کونسلوں میں پارٹیوں کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ کچھ لوگ اپنے جزوی اختلافات کو اس لئے ترک کر دیتے ہیں کہ تا اصول متفقہ کو اپنی پارٹی کے زور سے اپنے ملک میں جاری کر سکیں۔ اور اصول کے جاری کرنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایگزیکٹو پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کونسلوں سے باہر کے لوگوں کو بھی اگر وزارت پر مقرر کرنے کی اجازت ہوئی تو کونسلوں میں پارٹیوں کے بنانے کی کوئی غرض باقی نہیں رہے گی اور ممبر اس میں زیادہ فائدہ دیکھیں گے کہ وہ ہر ایک پارٹی سے الگ رہیں تاکہ پوری حریت سے رائے دے سکیں۔ اس صورت میں انہیں کوئی مجبوری نہ ہوگی کہ وہ اپنے خیالات کے ایک حصہ کو قربان کر کے کسی خاص جماعت سے اپنے آپ کو وابستہ کر دیں کیونکہ وہ خیال کریں گے کہ پارٹی کی طاقت سے وزارت کا سوال وابستہ نہیں ہے۔ پس بہتر ہے کہ ہم الگ ہی رہ کر کام کریں تاکہ ہماری حریت پوری طرح قائم رہے۔ نیز یہ بھی خیال کرنا چاہئے کہ سول سروس سے کسی وزیر کو لینے کی اجازت دینے کی وجہ تو موجود ہے' یعنی ایک غیر ملک کا شخص اور سرکاری عہدیدار کونسلوں میں نہ قانوناً آسکتا ہے' نہ اپنے رسوخ سے آسکتا ہے ادھر اس کے تجربہ سے بھی ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ پس اس کا یہی طریق ہو سکتا ہے کہ اسے ہم براہ راست وزارت پر مقرر کر دیں۔ لیکن ایک ایسا شخص جو ملازم بھی نہیں اور اس ملک کا باشندہ بھی ہے اور بالکل آزاد ہے کہ کوشش کر کے کونسلوں میں آسکے وہ اگر کونسلوں میں آنے کی زحمت برداشت نہیں کرتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے وزارت کے کام پر مقرر کر کے اس سیاسی نظام کو جس پر کونسلوں کی زندگی کی بنیاد ہے تباہ کر دیا جائے۔

باقی رہی یہ اجازت کہ گورنر چاہے تو سول سروس میں سے کسی شخص کو وزارت پر مقرر کر دے میں ذاتی طور پر اس کا مؤیّد ہوں کیونکہ میرے نزدیک ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کُلّی طور پر برطانوی حکام کے مشورہ سے ہندوستانی حکومت آزاد ہو سکے لیکن یہ اصول کہ گورنر اپنی مرضی سے ایک آدمی کو سول سرونٹس (CIVIL SERVANTS) میں سے وزارت کے لئے مقرر کر دیا کرے کسی طرح درست نہیں۔ اور اس متحدہ ذمہ داری کے اصول کے خلاف ہے' جسے سائمن کمیشن جاری کرنا چاہتا ہے۔ عقل اسے کس طرح باور کر سکتی ہے کہ ایک شخص کو جو کونسلوں پر کوئی اثر نہیں رکھتا گورنر اپنی مرضی سے وزارت میں داخل کر دے اور پھر ساری

وزارت کو مجبور کیا جائے کہ وہ ذمہ واری میں ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔ انسان ذمہ داری تو اس کی لیتا ہے جس کے ساتھ کام کرنے کی رغبت وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے لیکن جس ساتھی کو دوسرا منتخب کرتا ہے اس کے ساتھ وہ ذمہ داری میں کس طرح شریک ہو سکتا ہے؟ دنیا کی مختلف وزارتوں کو دیکھ لو مشترکہ ذمہ داری انہی ملکوں میں ہے جہاں وزیر اعظم اپنی وزارت منتخب کرتا ہے۔ جہاں انتخاب دوسرے کے ہاتھ سے ہو وہاں گو سب مل کر کام کرنیکی کوشش کرتے ہیں لیکن ذمہ داری مشترکہ نہیں ہوتی۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک کے فعل پر نکتہ چینی ہونے پر سب ہی مستعفی ہو جائیں۔ انگلستان اور فرانس میں ایک وزیر اپنے ہمراہی منتخب کرتا ہے اس لئے وہاں وزارت کی ذمہ داری بھی مشترکہ ہے۔ لیکن یونائیٹڈ سٹیٹس اور سوئٹزرلینڈ میں سب وزراء الگ الگ چُنے جاتے ہیں۔ اول الذکر میں پریذیڈنٹ وزراء کا انتخاب کرتا ہے اور مؤخّر الذکر میں دونو پارلیمنٹیں مل کر وزراء کا انتخاب کرتی ہیں۔ پس وہاں ذمہ داری بھی مشترکہ نہیں ہے۔ اگر ایک وزیر کو پریذیڈنٹ اپنی ذاتی یا ملک کی ناراضگی کی وجہ سے علیحدہ کرنا چاہے تو دوسرے وزراء پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ سوئٹزرلینڈ میں اگر ایک وزیر کے کام پر اعتراض ہو اور وہ استعفاء دے تو سب پابند نہیں کہ وہ بھی ساتھ استعفاء دے دیں۔

پس یہ عقل کے خلاف ہے کہ وزراء کا انتخاب تو گورنر کرے اور ذمہ داری سب کی مشترکہ ہو۔ ذمہ داری مشترکہ تبھی ہو سکتی ہے جب کہ پارٹی سسٹم پر ایک وزیر اپنی پارٹی یا اپنے ساتھ اتحاد رکھنے والی پارٹیوں میں سے باقی وزراء کو منتخب کرے پس کمیشن کی تجویز ہرگز قابلِ عمل نہیں۔ ہاں چونکہ سردست سول سروس کے افسروں سے کام لینا میرے نزدیک ضروری ہے اس لئے درمیانی راہ میرے نزدیک یہ ہو سکتی ہے کہ یہ شرط کر دی جائے کہ وزارت عالیہ کے لئے جس شخص کو چُنا جائے اس کا فرض ہو کہ مثلاً آج سے پندرہ سال تک کم سے کم ایک یورپین سول سرونٹ کو وہ اپنی وزارت میں شامل کرے لیکن اس افسر کی تعیین گورنر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کے اختیار میں ہو جس کے سپرد وزارت تیار کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ جس افسر کو وہ چنے اسے مجبور کیا جائے کہ وہ وزارت کے کام کو قبول کرے۔ بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی مرضی کے افسروں میں سے کسی کو اس کام کے لئے راضی کرے۔ پندرہ سال کے بعد ہر صوبہ کی کونسل کو اختیار ہو کہ وہ حقیقی

(ABSOLUTE) اکثریت کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کرے کہ آئندہ یہ سلسلہ جاری رہے یا بند کر دیا جائے اور وزارت کلی طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائے۔ اس طرح پارٹی سسٹم بھی ترقی کرے گا اور وزارت مشترکہ ذمہ داری بھی اٹھا سکے گی اور تجربہ کار افسروں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا بھی ملک کو موقع مل جائے گا اور جس طرح سول سروس کے کسی ایک فرد کو وزارت دینے کا اختیار وزیر اعظم کو حاصل ہو اسی طرح کونسلوں سے باہر کسی شخص کو منتخب کرنے کا اختیار بھی اسے ہو لیکن شرط یہ ہو کہ ایسا شخص وزارت کے عہدہ پر مأمور ہونے کے چھ ماہ کے عرصہ کے اندر بذریعہ انتخاب کونسل کا ممبر ہو جائے۔ اگر اس عرصہ میں وہ ممبر منتخب نہ ہو سکے تو پھر وہ وزارت پر قائم نہ رہ سکے بلکہ استعفاء دینے پر مجبور ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کہ افسران میں سے بعض کا وزارت پر مقرر ہوتے رہنا بشرطیکہ وزیر اعظم کے انتخاب پر ایسا ہو ملک کے لئے ایک وقت تک مفید ہو گا بلکہ میری ذاتی رائے میں صحیح طریق پر حکومت کرنے کے لئے ضروری ہو گا۔ وہاں گورنر کی مرضی سے ایسے ہندوستانی وزراء کا تقرر جو کونسلوں کے منتخب ممبر نہ ہوں آئینی ترقی کے سخت منافی ہو گا۔ پس ہندوستانی نمائندوں کو اس امر کو کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔

سائمن رپورٹ نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ گورنر کو اختیار ہونا چاہئے کہ خواہ ایک پارٹی یا جماعت میں سے وزارت کا انتخاب کرے یا مختلف پارٹیوں میں سے۔ اس امر کا تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آئین اساسی کے ماتحت گورنر ہی وزراء مقرر کرتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر صحیح طور پر پارٹیوں کے اصول پر حکومت کو چلانا مدنظر ہو تو اس انتخاب میں گورنر آزاد نہیں ہوتا بلکہ اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس بارے میں وہ اس وزیر کی رائے کو قبول کرے جسے وہ وزارت بنانے کے لئے مقرر کرلے وہ وزیر اعظم کو مشورہ دے سکتا ہے لیکن اصل ذمہ واری وزارت کے انتخاب کی وزیر اعظم پر ہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہر روز مصنوعی پارٹیاں محض وزارتوں کی خاطر بنتی رہیں گی اور آئینی طور پر کام کرنے کی عادت کبھی بھی پارٹیوں کے ممبروں کو نہیں پڑے گی۔ پس گورنر کو پابند کرنا چاہئے کہ وہ اس بارہ میں وزیر اعظم کے انتخاب کی تصدیق کرے۔ یا پھر وزارت بنانے کا کام کسی اور وزیر کے سپرد کرے۔ صرف اسی صورت میں پارٹیاں اپنے اثر کو محسوس کرا سکتی ہیں اور اسی صورت میں گورنر مجبور ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اس پارٹی کو موقع دے جو اکثریت رکھتی ہو۔ ورنہ

وہی ہوتا رہے گا جو اب ہو رہا ہے۔ یعنی گورنر چند اقلیتوں کو ملا کر ایک وزارت مقرر کر دیتے ہیں جو کسی پارٹی کی بھی نمائندہ نہیں ہوتی۔

گورنر اور وزارت کے تعلقات

گورنروں اور وزارت کے تعلقات کے متعلق کمیشن کی رپورٹ یہ ہے کہ:

"گو عام طور پر گورنر کو اپنی وزارت کے فیصلوں میں دخل نہیں دینا چاہئے لیکن پانچ مواقع پر اسے اختیار ہو گا کہ وہ دخل دے۔ یعنی جب وہ سمجھے کہ اس کا دخل دینا ضروری ہے۔

(۱) صوبہ کے امن اور سلامتی کے قیام کیلئے۔

(۲) بعض قوموں یا جماعتوں کے مقابل پر بعض دوسری قوموں یا جماعتوں کے فوائد کو کسی سخت نقصان سے بچانے کے لئے۔

(۳) تاکہ گورنمنٹ کی اس ذمہ داری کی واجبی عہدہ برائی ہو سکے جو کہ ان اقوام کے خرچ سے تعلق رکھتی ہے جو مجلس واضع قوانین کے فیصلہ کے ماتحت نہیں۔

(۴) تاکہ ان احکام کی تعمیل ہو سکے جو کہ کسی صوبہ کی گورنمنٹ یا گورنمنٹ ہند یا وزیر ہند کی طرف سے پہنچیں۔

(۵) تاکہ ان فرائض کو ادا کیا جا سکے جو کہ قانوناً گورنر پر ذاتی طور پر عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسے فرائض جو کہ ملازمتوں کے سوال یا بیک ورڈ (BACKWARD) یعنی غیر ترقی یافتہ علاقوں کے متعلق ذمہ داری سے تعلق رکھتے ہیں۔[۵۰]

ان پانچ مواقع میں سے آخری تین تو کسی قدر اصلاح کے ساتھ بالکل درست ہیں اور وہ اصلاح میرے نزدیک یہ ہے کہ چوتھی صورت میں جو گورنمنٹ آف انڈیا کے الفاظ ہیں ان کی جگہ گورنر جنرل کے الفاظ رکھے جائیں اس لئے کہ بعض معاملات میں دخل اندازی کی اس وقت تک گورنر جنرل کو تو اجازت دی جا سکتی ہے جب تک کہ صوبہ جات اور مرکزی حکومت کا نظام پختہ نہیں ہوتا لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کو جس سے مراد شروع میں یا کچھ دیر کے بعد وزارت منتخبہ ہو سکتی ہے صوبہ جات وہ اختیار دینے کو ہرگز تیار نہ ہونگے۔ کیونکہ احتمال ہے کہ وہ صوبہ جات کی آزادی کو کمزور کرنیکی کوشش کریں گے۔

اسی طرح پانچویں استثناء میں بیک ورڈ علاقوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو میرے نزدیک

درست نہیں۔ کیونکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ اصولاً بھی ایسے علاقوں کی موجودگی فیڈریشن کے اصول کے خلاف ہے اور عملاً بھی اس سے گورنمنٹ میں اوپر سے نیچے تک ثنائیت (DUALITY) پیدا ہوتی ہے جو عمدہ گورنمنٹ کے اصول کے خلاف ہے اور جس کی اجازت صرف خاص صورتوں میں دی جاسکتی ہے۔

اب دو پہلی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ میرے نزدیک ان دونوں صورتوں میں گورنر کو اختیار دینا نظام حکومت کو پراگندہ کرنے والا ہوگا۔

پہلی صورت میں حفاظت اور امن کے لفظ اس قدر مُبہم ہیں کہ ان کے ماتحت ہر وقت گورنر دخل دے سکتا ہے اور وزارت کا حقیقی معنوں میں وزارت ہونا صرف گورنر کے مزاج پر منحصر ہوگا۔ اچھا گورنر اپنے آپ کو روکے رکھے گا بُرا گورنر جس طرح چاہے گا دخل دے گا اور کہے گا کہ یہ امن اور ملک کی حفاظت کی خاطر میں ایسا کرتا ہوں۔

یہی حال دوسری شق کا ہے۔ اس میں اقلیتوں کو خطرناک نقصان پہنچنے کی صورت میں دخل اندازی کی اجازت دی گئی ہے لیکن ایسی بیوقوف وزارت کم ہی ہوگی کہ جو اقلیتوں پر ظلم کو خطرناک صورت میں ظاہر ہونے دے۔ پس اقلیت کو تو اس شرط سے کچھ فائدہ نہیں۔ اکثریت ان کا گلا کاٹتی جائے گی اور گورنر خطرناک صورت کے انتظار میں بیٹھا رہے گا۔ ہاں جب کوئی گورنر ایسا آ جائے گا جو حکومت میں زیادہ حصہ لینے کا خواہشمند ہوگا تو وہ اس استثناء سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ضرور دخل اندازی کرے گا۔ حالانکہ اگر کوئی وزارت خطرناک طور پر اقلیتوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے تو بجائے اس کے کہ گورنر اس کی غلطیوں کی اصلاح میں لگا رہے اس کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اس وزارت کو استعفاء دینے پر مجبور کرے اور اگر اس کی جگہ دوسری وزارت نہ کھڑی کی جاسکتی ہو تو اس کونسل کو برخاست کر دے جس کے افراد صرف انہی لوگوں کو وزیر مقرر کرنے کیلئے مُصِر ہوں جو اقلیتوں پر خطرناک قسم کے ظلم روا رکھتے ہوں اور نئی کونسل کا انتخاب کرائے۔

میرے نزدیک یہ دونوں صورتیں جن.......... میں گورنر کو دخل اندازی کا اختیار دیا گیا ہے ان کی موجودگی میں گورنر کو یہ طریق اختیار کرنا چاہئے کہ وزارت کو سمجھائے۔ اگر وزارت اس کے مشورہ کو قبول نہ کرے اور وہ سمجھے کہ معاملہ اہم ہے تو اسے مجبور کرے کہ وہ استعفاء دے دے۔ اگر دوسری وزارت کھڑی نہ ہو یا اسی طریق عمل کو اختیار کرے تو اگر معاملہ اہم ہو

تو گورنر اس کونسل کو برخاست کر کے نئی کونسل کے انتخاب کا حکم دے۔ اس طریق کو اختیار کرنے سے دونوں فریق یعنی وزارت بھی اور گورنر بھی اپنی حد کے اندر رہنے کی کوشش کریں گے۔ وزارت اس بات سے ڈرے گی کہ اگر وہ ناجائز اصرار کرے گی تو شاید کوئی دوسری وزارت اس کی جگہ لینے کو تیار ہو جائے۔ یا وہ اس امر سے ڈرے گی کہ اگر اس کے ظلموں کی وجہ سے کونسل کو برخاست کیا گیا تو شاید ملک اس کی امداد نہ کرے اور انتخاب میں اسے شکست حاصل ہو۔ اسی طرح گورنر بھی خیال رکھے گا کہ میں اس وقت اپنے پہلو پر زور دوں جب کہ ملک کا ایک طبقہ میرا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو۔ ورنہ بلاوجہ دخل اندازی وزارت کو اور زیادہ ہر دل عزیز کر دے گی۔ اگر مذکورہ بالا طریق کے باوجود بھی ظلم کی کوئی صورت باقی رہ جائے گی تو اس کا علاج سپریم کورٹ کے ذریعہ سے جس کی ضرورت میں پہلے ثابت کر آیا ہوں مظلوم گروہ کر سکتا ہے۔

وزارت کے کام کے طریق کے متعلق جو کچھ کمیشن نے لکھا ہے میرے نزدیک درست ہے۔ بعض لوگ مجلس وزارت کا سیکرٹری مقرر کرنے کی جو کمیشن نے سفارش کی ہے تا وہ گورنر کو وزارت کی مجلس کی کارروائیوں سے اطلاع دیتا رہے اسے جاسوس قرار دے کر ناپسند کرتے ہیں لیکن جب کہ وزارت کی مجلس کا پریذیڈنٹ قانوناً گورنر سمجھا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ گورنر حالات سے آگاہ نہ رہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کو حالات سے واقف رکھنے کا نام جاسوسی رکھا جائے۔

خطرناک حالات کے متعلق گورنروں کے اختیارات

کمیشن نے ایسے خطرناک حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب کوئی صورت بھی آئینی طور پر حکومت چلانے کی باقی نہ رہے گورنروں کو خاص اختیارات دیئے ہیں جو یہ ہیں کہ ایسے حالات میں انہیں اختیار ہو گا کہ خواہ وہ سب کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں خواہ اپنے مددگار مقرر کر کے حکومت کا کام چلائیں۔ خطرناک صورت کی تشریح اس نے یہ کی ہے کہ ایسی وزارت کا بنانا یا قائم رکھنا مشکل ہو جائے جسے کونسل کی امداد حاصل ہو یا جب کہ گورنمنٹ کے کام کو چلانے سے عام طور پر انکار کر دیا جائے اور اس کے کام کو خراب کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان حالات میں جب گورنر حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لے کمیشن نے اسے اختیار دیا ہے کہ اپنی مرضی سے وزراء مقرر کرے اور انہیں کونسلوں کا ممبر مقرر کر

دے اور اسے یہ بھی اختیار دیا ہے کہ وہ ضروری اخراجات کی منظوری دے یا ایسا نیا قانون پاس کر دے جس کی قیام امن کیلئے ضرورت ہو لیکن جب گورنر ان اختیارات کو برتنا چاہے تو پارلیمنٹ کو اس کی فوراً اطلاع دے اور بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے ان غیر معمولی اختیارات کو بارہ ماہ سے زائد استعمال نہ کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب حکومت کا کام بند ہونے لگے تو اس قسم کا اختیار گورنر کے ہاتھ میں ضرور ہونا چاہئے کہ جس کی مدد سے وہ حکومت کا کام چلا سکے لیکن خطرہ کی جو تشریح کمیشن نے کی ہے وہ ایسی ہے کہ اسے غیر معمولی خطرہ نہیں کہہ سکتے اس لئے اس کی وجہ سے غیر معمولی اختیارات کو استعمال کرنیکی اجازت دینا کسی صورت میں جائز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اس کا یہ کہنا کہ جب کوئی ایسی وزارت بنائی یا قائم نہ رکھی جا سکے جسے کونسل کی امداد حاصل ہو تو اس وقت گورنر یہ اختیار برت سکتا ہے ہرگز درست نہیں۔ یہ حالت ہمیشہ متمدن ممالک میں پیش آتی رہتی ہے لیکن کبھی بھی اس کی وجہ سے آئینی حکومت کو معطل کر کے نیا نظام قائم نہیں کیا جاتا۔ اگر وزارت کا انتخاب یا اس کا قیام ناممکن نظر آئے تو گورنر کا یہ کام ہے کہ وہ مجلس واضع قوانین کو برخاست کر کے نیا انتخاب کرائے نہ کہ فوراً حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

پس اصل قانون یہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی موجودہ وزارت کام سے انکار کر دے اور اس کی جگہ لینے کے لئے منتخب نمائندوں میں سے کوئی شخص تیار نہ ہو تو پھر گورنر کو اختیار ہو گا کہ وہ وزارت کا کام اپنی مرضی کے مطابق بعض آدمیوں کے سپرد کر دے اور مجلس کو فوراً برخاست کر کے دوسرا انتخاب کرائے اور اگر وہ مجلس بھی وزارت بنانے کے لئے تیار نہ ہو تو پھر وزارت کا کام اپنی نگرانی میں لے کر پارلیمنٹ کو اطلاع دے۔ یا اگر یہ حالت پیدا ہو جائے کہ موجودہ وزارت کام سے انکار کر دے اور بعض منتخب شدہ نمائندے وزارت کا عہدہ لینے کیلئے تیار ہوں تو منتخب شدہ نمائندوں میں سے قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن کونسل کسی وزارت سے بھی تعاون کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو مختلف پارٹیوں کو وزارت پیش کرنے کے بعد اگر کام کسی صورت میں نہ چل سکے تو گورنر کو چاہئے کہ مجلس کو برخواست کر کے نیا انتخاب کرائے اور اگر اس نئے انتخاب کے بعد بھی وزارت کو کثرت حاصل نہ ہو اور نہ دوسری کوئی پارٹی اکیلی یا دوسروں سے مل کر کونسل میں کثرت حاصل کر سکے اور نہ کثرت خود حکومت کا کام آئینی طور پر اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تیار ہو تو اس صورت میں کونسل کو برخاست کر کے گورنر پارلیمنٹ

کو اطلاع دے۔

پس ان قیدوں کے ساتھ یہ اختیارات گورنروں کو ملنے چاہئیں ورنہ جن الفاظ میں سائمن کمیشن نے لکھا ہے ان کی رو سے تو عام آئینی مظاہروں کی بناء پر بھی گورنر آئینی حکومت کو توڑ کر غیر آئینی حکومت کو قائم کر سکیں گے۔

صوبہ جات کی مجالس واضع قوانین

کونسلوں کی عمر

کمیشن نے صوبہ جات کی مجالس واضع قانون کے متعلق جو سفارشات کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صوبہ جات کی کونسلوں کی عمر پانچ سال کر دی جائے اور گورنر کو اختیار ہو، تا دوسرے صوبہ جات کے انتخاب سے اس کے انتخاب کے وقت کو برابر رکھنے کے لئے دو سال تک عمر بڑھا کر سات سال کر دے۔ اس تبدیلی کی وجہ اس نے یہ بتائی ہے کہ آئندہ ہم نے مرکزی مجلس کے متعلق یہ قاعدہ رکھا ہے کہ اس کے ممبر بِالواسطہ طور پر کونسلوں کے ذریعہ سے منتخب ہوا کریں۔ اس وجہ سے اس قسم کا انتظام ہونا چاہئے کہ عام طور پر سب کونسلیں ایک وقت میں منتخب ہوں تاکہ اسمبلی کے ممبروں کے انتخاب میں دقّت نہ ہو۔

کاغذ پر یہ سکیم بے شک اچھی لگے لیکن اس کی تشریح کر کے دیکھیں تو یہ سکیم بالکل غیر معقول معلوم ہوتی ہے۔ اول تو یہ خیال ہی غلط ہے کہ فیڈرل اسمبلی کا انتخاب صوبہ جاتی کونسلوں کے ذریعہ سے کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سوال تو الگ زیر بحث آئے گا سرِدست تو میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ صوبہ جاتی کونسلوں کی عمر کو غیر طبعی قواعد کے ماتحت رکھنا انتظام کو خراب کرے گا۔ صوبہ جاتی کونسلوں کی عمر بے شک پانچ سال رکھی جائے میرے نزدیک یہ اچھا نتیجہ پیدا کرے گا لیکن اس سے زیادہ عمر کے بڑھانے کی اجازت دینی مناسب نہیں۔ دنیا کے اکثر نیابتی حکومتوں والے ممالک میں کونسلوں کی عمر پانچ سال یا اس سے کم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون سیاسی کے ماہروں کا خیال ہے کہ اس عرصہ میں اس قدر تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ملک دوبارہ انتخاب کا بے صبری سے انتظار کرنے لگتا ہے۔ انگلستان کا ہی تجربہ زیر نظر رکھ لو کہ وہ وزارتیں جو یہ کوشش کرتی ہیں کہ ہم پورے پانچ سال اپنی عمر پوری کر کے پھر جنرل الیکشن کا اعلان کریں الیکشن میں اکثر ناکامی کا منہ دیکھتی ہیں۔

پس جب ان ممالک میں جن کا نظام پرانا اور ٹھوس ہو چکا ہے پانچ سال کی عمر ایک کافی

لمبی عمر سمجھی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک خیالی فائدہ کے لئے سات سال کے لمبے عرصہ تک کونسلوں کی عمر کو لمبا کیا جائے۔ جب ہندوستان میں صوبے زیادہ ہوگئے اور کونسلوں کو اختیارات زیادہ ملے تو دوسری جمہوری حکومتوں کی طرح یہاں بھی تغیرات جلدی پیدا ہونگے اور ہونے چاہئیں۔

پس ان تغیرات کو نظرانداز کرکے یہ فرض کرلینا کہ ایسے تغیرات بہت کم ہونگے اور پھر یہ فرض کرلینا کہ وہ دو سال سے پہلے ہی ہونگے محض ایک قیاسی بات ہے۔ اگر چار پانچ صوبوں میں تغیرات ہوئے اور کسی میں پہلے الیکشن کے بعد دوسرے سال میں کسی میں تیسرے سال میں اور کسی میں چوتھے سال میں تغیر ہوا تو پھر کونسلوں اور اسمبلی کے انتخاب میں کس طرح موافقت قائم رکھی جاسکے گی؟ تو یہ قاعدہ ہونا چاہئے کہ پانچ سال کی مدت پر سب کونسلوں کا خواہ ان کا درمیان میں جدید انتخاب ہو چکا ہو دوبارہ انتخاب ہو۔ سوائے اس صورت کے کہ آخری سال کے دوران میں انتخاب ہو اس صورت میں انتخاب اگلے انتخاب کے آخر تک کام دے سکے گا۔ یا پھر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جب کسی کا انتخاب ہو' ہو' ایسا علاج جو مرض کو تو دور نہیں کر سکتا صرف مزید پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کس کام کا؟

میں اس جگہ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں گورنروں کو کونسلوں کے برخاست کرنے کا حق دیا گیا ہے وہاں خود کونسلوں کو بھی اپنے برخاست کرنے کا حق ملنا چاہئے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ملک کی رائے ایک خاص پارٹی کی تائید میں بڑھ چکی ہو لیکن گورنر اپنے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے کونسلوں کو برخاست نہ کرتا ہو۔ اس صورت میں اجازت ہونی چاہئے کہ کونسل کی کثرت رائے کونسل کے برخاست کرنے کا فیصلہ کر دے اور دوبارہ انتخاب کے ذریعہ سے اپنی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کرے۔

ممبروں اور ووٹروں کی تعداد کی زیادتی

کمیشن کی ایک یہ تجویز بھی ہے کہ کونسلوں کے ووٹروں کی تعداد اور ممبروں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا جائے۔ یہ تجویز کمیشن کی نہایت معقول ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ پہلے بھی ووٹروں کی تعداد ناکافی ثابت ہوئی ہے اور اس اصلاح کی دیر سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس موقع پر میں ایک ضروری اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ووٹروں کی قابلیت کا موجودہ معیار ایک مصنوعی معیار ہے۔ اصل میں تو ہر عاقل و بالغ ووٹ کا مستحق ہے۔ پس ان حد بندیوں سے

جو ووٹروں پر لگائی جائیں اور جس کے نتیجہ میں قوم کو نقصان پہنچتا ہو اس کی ذمہ دار حکومت ہے نہ کہ وہ قوم۔ پس اس قوم کے حقوق کے نقصان کا ازالہ کرنا بھی حکومت کا کام ہے۔

گزشتہ سکھ حکومت کے وقت پنجاب میں مسلمانوں کی جائدادیں عام طور پر سکھوں کے قبضہ میں چلی گئی تھیں اور بنگال کے برطانیہ کے ماتحت آنے کے وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں نے اپنے کام کی سہولت کے لئے بنگال کی اکثر زمینیں مستقل ٹھیکہ کے اصول پر چند ہندو عُمّال کے سپرد کر دی تھیں۔ اس وجہ سے پنجاب اور بنگال میں جائداد کی بنیاد پر مسلمان ووٹروں کی تعداد بہت کم ہے اور اس امر کو ہمیشہ اس بات کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نمائندگی ان کی تعداد کے حق سے کم ملنی چاہئے اور یہ مطالبہ انہی زبانوں سے سنا جاتا ہے جو جمہوریت کا وعظ کرتے کرتے خشک ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت انہیں اسی وقت پسند ہے جب وہ ان کے مطلب کی ہو۔ حالانکہ کسی قوم کو اس کی تعداد کے مطابق حق ملنا ایک ایسا معقول امر ہے کہ اس میں نہ کوئی رعایت کا پہلو ہے اور نہ کسی پر ظلم ہے۔

پس چاہئے کہ اگر ووٹروں کے دائرہ کو ابھی کچھ عرصہ تک محدود رکھنے کی تجویز ہو تو اس امر کا انتظام ہو جائے کہ جس جس قوم کو اس سے نقصان پہنچتا ہو اس کا ازالہ کسی دوسری طرح کر دیا جائے یعنی خاص حقوق کے ذریعہ سے اس کے ووٹروں کی تعداد اس تعداد کے برابر (نہ کہ قریباً برابر جیسا کہ سائمن کمیشن نے لکھا ہے) کر دی جائے جو اسے تناسب آبادی کے لحاظ سے حاصل ہو سکتی تھی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مشترکہ انتخاب پر جو زور دیا جاتا ہے اس کا راستہ بند کرنے کا الزام بھی اس قدر مسلمانوں پر نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ پر ہے۔ جس نے فرنچائز (FRANCHISE) کے ایسے اصول مقرر کئے ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے ووٹروں کی تعداد کم رہ جاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ ڈرتے ہیں کہ جائنٹ الیکٹوریٹ (JOINT ELECTORATE) میں نہ معلوم ہمارا کیا حال ہو گا۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جائنٹ الیکٹوریٹ لے کر فرنچائز وسیع کرا لو جیسا کہ کانگریس والوں نے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے تو یہ بات مسلمانوں کے شبہ کو اور بھی قوی کرتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ گو فرنچائز کی وسعت کی خوبی کو تو ہندو تسلیم کرتے ہیں لیکن

انہوں نے اس سوال کا حل سودا کرنے کے لئے ملتوی کر رکھا ہے۔ حالانکہ اصل طریق یہ ہے کہ پہلے ہر نوجوان کے حق رائے دہندگی کو تسلیم کر کے اس کا اجراء کیا جائے پھر اس کا تجربہ ہو چکنے کے بعد مسلمانوں سے مشترکہ انتخاب کے متعلق سمجھوتہ کیا جائے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اگر مسلمانوں کے ووٹ ان کی تعداد کے مطابق ہو جائیں اور کچھ عرصہ تک انہیں الیکشن کا تجربہ کرنے کا بھی موقع دے دیا جائے تو مسلمانوں کا میلان خود بخود مشترکہ انتخاب کی طرف ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر ان کے اس حق کو ہندوؤں نے دوسرے امور کے لئے سودا کرنے کے طور پر محفوظ رکھا تو ان کے شبہات اور بھی بڑھتے چلے جائیں گے۔ لیکن اگر انتظام کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے فوراً ہی ہر بالغ کو ووٹ کا حق نہیں دیا جا سکتا تو بہتر ہے کہ ایسے قواعد تجویز کئے جائیں کہ کمیشن کی تجویز کے مطابق ووٹروں کی موجودہ تعداد سے تین گُنا زیادہ ووٹ ہو جائیں۔ لیکن اس امر کا خیال رکھ لیا جائے کہ مسلمانوں کا حق نہ مارا جائے اور ان کی تعداد کے مطابق ان کے ووٹروں کی تعداد ہو۔

کونسلوں کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ

ووٹروں کے متعلق اپنی رائے کے اظہار کے بعد میں ممبروں کی زیادتی کے سوال کو لیتا ہوں۔

میرے نزدیک تمام اقوام کی صحیح نمائندگی کے لئے ضروری ہے کہ جن صوبوں کی آبادی ایک کروڑ سے کم ہو ان کی کونسل کم سے کم پچھتر ممبروں کی ہو۔ اور ایک کروڑ سے زائد آبادی رکھنے والے صوبوں میں دو سَو سے اڑھائی سَو تک ممبروں کی تعداد مقرر کی جائے۔ سوائے بنگال اور یو۔پی کے کہ جن کی تعداد دوسرے صوبوں سے بہت زیادہ ہے۔ ان دونوں صوبوں میں تین سَو ممبروں کی کونسلیں مختلف علاقوں کی نمائندگی کے لئے ضروری ہیں۔

جُداگانہ انتخاب
اور
مختلف اقوام کا حقِّ نیابت

اب مَیں جُداگانہ انتخاب کے سوال کو لیتا ہوں۔ یہ سوال اس وقت سیاسیات ہند میں اہم ترین سوال بن رہا ہے اور مختلف اقوام کے حق نیابت کا سوال بھی اسی کے گرد چکر کھا رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے جُداگانہ انتخاب اور تعداد سے زیادہ نیابت کا حق صاف الفاظ میں لارڈ منٹو (LORD MINTO) نے منظور کیا تھا۔ ان کے الفاظ سر آغا خان کی قیادت میں پیش ہونے والے ڈیپوٹیشن (DEPUTATION) کے جواب میں یہ تھے۔

"آپ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ موجودہ قواعد کی بناء پر جو جماعتیں کونسلوں کے ممبر منتخب کرتی ہیں ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی مسلمان امیدوار کو منتخب کریں گی اور یہ کہ اگر اتفاقاً وہ ایسا کر بھی دیں تو یہ اسی صورت میں ہو گا کہ وہ امیدوار اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اکثریت کے ہاتھ فروخت کر دے اور اس وجہ سے وہ امیدوار اپنی قوم کا نمائندہ نہیں ہو گا۔ اسی طرح آپ لوگ بالکل جائز طور پر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ کے حقوق کا فیصلہ صرف آپ کی قوم کی تعداد کو مدنظر رکھ کر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس فیصلہ کے وقت آپ کی قوم کی سیاسی اہمیت کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے اور ان خدمات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ جو اس نے حکومت برطانیہ کی تائید میں کی ہیں۔ میں بالکل آپ کے اس خیال سے متفق ہوں۔

میں اسی طرح اس امر پر یقین رکھتا ہوں جس طرح کہ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انتخاب کا حق اگر صرف ایک فرد رعایا ہونے کی حیثیت سے دیا گیا اور مذہب اور رسم و رواج کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا جو اس براعظم میں بسنے والی اقوام میں پایا جاتا ہے تو یہ انتظام یقیناً بُری طرح برباد ہو گا اور ناکام رہے گا۔"

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ لارڈ منٹو (LORD MINTO) نے تسلیم کیا تھا کہ:۔

(۱) مسلمانوں کو مشترکہ انتخاب کے ذریعہ سے نہ تو ان کے حق کے برابر نیابت مل سکتی ہے اور نہ ان کے صحیح نمائندے ہی منتخب ہو سکتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں کو حق صرف تعداد کے مطابق ہی نہیں ملنا چاہئے بلکہ ان کی پولیٹیکل حیثیت کے لحاظ کو مدنظر رکھ کر ان کی تعداد سے زائد حق ملنا چاہئے۔

چنانچہ اس اعلان کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا نے مارلے منٹو ریفامز سکیم (MORLEY MINTO REFORMS SCHEME) میں مسلمانوں کے حقوق کی علیحدہ نمائندگی کے متعلق کچھ قوانین تجویز کئے۔ جو ۱۹۱۰ء میں نافذ کئے گئے۔

بہرحال حکومت برطانیہ کا ایک ذمہ وار افسر اس امر کا صریح طور پر اقرار کر چکا ہے کہ علیحدہ نمائندگی کے بغیر نہ کمیّت کے لحاظ سے اور نہ کیفیّت کے لحاظ سے مسلمانوں کا حق انہیں مل سکتا ہے جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہیں کہ اس ملک میں اکثریت اقلیت کے حقوق تلف کرنے کے لئے اپنی ساری قوت خرچ کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں جُداگانہ انتخاب کے جس قدر نقائص بھی فرض کئے جائیں ان کی ذمہ داری ہندوؤں پر پڑتی ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔ اور ان حالات میں علیحدہ نمائندگی کا حق کوئی رعایت نہیں جس کے بدلہ میں کوئی اور حق مسلمانوں سے لیا جائے یا ان سے کسی قسم کی قربانی کا مطالبہ کیا جائے بلکہ یہ طریق صرف ان کے جائز حقوق کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے۔

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ (MONTAGUE CHELMSFORD REPORT) نے بھی اس امر کا تذکرہ کیا ہے اور سائمن کمیشن نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کہ علیحدہ نمائندگی ہندوستان کی موجودہ حالات میں ضروری ہے۔ پس کسی نتیجہ پر پہنچتے وقت پہلے اس امر کو ضرور مدنظر رکھنا چاہئے کہ علیحدہ نمائندگی کی ضرورت مسلمانوں کے کسی فعل کے سبب سے نہیں بلکہ

ہندوؤں کے افعال کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور یہ وہ صداقت ہے کہ اسے لارڈ منٹو (LORD MINTO) بھی تسلیم کر چکے ہیں اور اسی کتاب میں مَیں ثابت کر چکا ہوں کہ حالات اور عقل بھی اسی رائے کی تائید کرتے ہیں۔

سائمن رپورٹ کا بیان ہے کہ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ باوجود اس کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بیان کرتی ہے کہ جُداگانہ انتخاب۔

"فرقہ وارانہ امتیاز کو ہمیشہ کیلئے مستقل کرتا ہے اور اقوام کے موجودہ تعلقات کو ایک نہ بدل سکنے والی شکل دے دیتا ہے اور حکومت خود اختیاری کے اصول کی ترقی کے راستہ میں ایک سخت روک ہے۔"

خود سائمن کمیشن کے ممبر بھی اس رائے کی ان الفاظ میں تائید کرتے ہیں کہ:-

"اگر اوپر کے خیالات کو تسلیم کرنا تعصب ہے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے خیالات بھی یہی ہیں۔"[۵۱]

میرا خیال ہے کہ نہ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ کے لکھنے والوں نے اور نہ سائمن رپورٹ (SIMON REPOT) کے لکھنے والوں نے اس امر کا خیال کیا ہے کہ جُداگانہ اور مشترکہ انتخاب مختلف مواقع کے لحاظ سے مختلف اثر پیدا کرتے ہیں۔ انسانی دماغ سب شعبہ ہائے زندگی میں ایک ہی طرح عمل کرتا ہے۔ جس طرح میاں بیوی میں جب شقاق پیدا ہوتا ہے تو ایک حد تک صلح کی کوشش کر کے ہمیں انہیں علیحدہ کرنا پڑتا ہے اور وہ تعلقات جو اکٹھا رکھنے سے درست نہیں ہو سکتے اس طرح بسا اوقات درست ہو جاتے ہیں۔ یہی حال قوموں کا ہوتا ہے جب ان کا تنافر حد سے بڑھ جاتا ہے تو ان میں ایک حد تک علیحدگی بجائے نقصان کے فائدہ کا موجب ہوتی ہے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ اور سائمن رپورٹ کے مصنفوں کے دل پر یہ خیال حاوی معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس لئے کہ مسلمان اس کے چھوڑنے پر ناراض ہونگے علیحدہ نمائندگی کی ضرورت ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ صورت حالات میں یہی علاج ملک میں قیام امن کا موجب ہو سکتا ہے۔ جب ایک کمزور قوم جس میں بیداری پیدا ہو چکی ہو یہ دیکھتی ہو کہ وہ قوم جو پہلے سے مضبوط تھی اس کی ترقی کے راستہ میں پورا زور لگا کر روکیں پیدا کرتی ہے اور حکومت میں اپنے مناسب حصہ کے حصول کی بھی اسے اجازت نہیں دیتی تو ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت کو دیکھ کر یکجائی الیکشن سے اس کے خیالات میں سکون اور محبت پیدا

نہیں ہو گی بلکہ غصہ اور رنج بڑھے گا اور جب وہ دیکھے گی کہ جائز ذریعہ سے میرے حقوق نہیں ملتے تو وہ فساد اور لڑائی پر آمادہ ہو جائے گی۔ لیکن جب کسی قوم کے حقوق اسے مل جائیں گے تو وہ ان غم اور غصہ کے خیالات سے بہت کچھ آزاد ہو جائے گی چنانچہ اس کا ثبوت مسٹر چنتا مونی کے اس بیان سے جو انہوں نے انڈین ریفارمز کمیٹی (INDIAN REFORMS COMMITTEE) کے سامنے دیا تھا ملتا ہے۔ مسٹر چنتا مونی لبرل لیڈر ہیں اور اِس وقت راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے نمائندے ہو کر گئے ہیں۔ سر محمد شفیع صاحب بیان کرتے ہیں۔

"جیسا کہ انڈین ریفارمز کمیٹی کے سامنے مسٹر چنتا مونی نے بیان کیا تھا کہ جداگانہ انتخاب سے صوبہ جات متحدہ کے مسلمانوں کے قلوب میں اپنے حقوق کے محفوظ ہو جانے کی وجہ سے جو اطمینان پیدا ہوا اور اس کا جو اچھا نتیجہ ہندو مسلم تعلقات کے بہتر ہو جانے کی صورت میں نکلا وہ ایسا نمایاں تھا کہ مسٹر چنتا مونی اور ان کے ہم خیال ہندوؤں نے میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بھی جُداگانہ انتخاب کے طریق کو جاری کر دیا۔" ؂۵۲

اس کے مقابلہ میں مشترکہ انتخاب نے ہندوستان کی فضاء میں جو اثر پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک ممبر متحدہ طور پر سب اقوام کی طرف سے منتخب ہوتا ہے۔ اس وقت تک کئی الیکشن ہو چکے ہیں لیکن مسلمان اس حلقہ انتخاب سے ایک دفعہ کوشش کرنے کے بعد اس قدر مایوس ہوئے ہیں کہ اب کوئی مسلمان اس حلقہ کی طرف سے کھڑا ہی نہیں ہوتا اور ان کی ساری کوشش اس امر میں مرکوز رہتی ہے کہ کوئی مسلمان اس حلقہ میں ووٹ نہ دے تاکہ ہندو ممبر مسلمانوں کا نمائندہ نہ سمجھا جا سکے۔ اگر مشترکہ انتخاب کا مطالبہ واقعہ میں ہندوؤں کی طرف سے قومی اتحاد کی خاطر ہوتا تو یہ خطرناک نتیجہ اس حلقہ میں جس کا ہر ووٹر یونیورسٹی کا گریجوایٹ ہے کیوں نکلتا اور اگر یہ طریق ہر ملک میں قطع نظر وہاں کے مخصوص حالات کے ایسا ہی بابرکت ہوتا تو ہندوستان کے وہ حلقے جن میں اس طریق کو رائج کیا گیا ہے سب سے زیادہ تعصّب بُغض اور کینہ کے نظارے کیوں دکھاتے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشترکہ انتخاب کے طریق میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت جو انتخاب ہوں ان میں ایسے مسائل کو نہیں چھیڑا جا سکتا جو ایک قوم کو دوسری قوم سے لڑوانے

والے ہوں۔ مگر میرے نزدیک جہاں پہلے سے تعصّب موجود ہو اور سیاسی سوالات زیر بحث نہ ہوں وہاں مشترکہ انتخاب میں سب سے زیادہ یہی سوال اٹھایا جائے گا کیونکہ اگر ہندو الگ حلقہ سے منتخب ہو رہا ہو اور مسلمان الگ حلقہ سے تو ہندو کی اپنے ہندو مدمقابل کے خلاف اور مسلمان کی اپنے مسلمان مدِمقابل کے خلاف طاقت خرچ ہوگی لیکن اگر ایک ہی حلقہ سے ہندو اور مسلمان کھڑے ہونگے تو تعصّب کی موجودگی کی وجہ سے ان کے لئے سب سے سہل طریق یہ ہو گا کہ اپنی اپنی قوم کے تعصّب سے اپیل کر کے اس کی مدد حاصل کریں۔ اصل میں انگلستان کے لوگ اس امر کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ الیکشن کے وقت کسی نہ کسی چیز پر حصول امداد کا دارومدار ہوتا ہے۔ ووٹر کو جگانا آسان کام نہیں۔ اس کے جگانے کے لئے کوئی ایسا مقصد اس کے سامنے رکھنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی غفلت کو ترک کر کے امیدوار کی مدد کے لئے تیار ہو جائے۔ انگلستان میں اور دوسرے ممالک میں خاص خاص سیاسی پالیسیاں ہیں جن کی خوشنمائی اور دلفریبی ظاہر کر کے امیدوار ووٹروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں لیکن ہندوستان میں تو اب تک کوئی سیاسی پالیسی سوائے انگریزوں کی مخالفت کے نہیں ہے۔ آزادی کے ساتھ ہی یہ جوش دلانے کا ذریعہ بھی ختم ہو جائے گا۔ باقی اور کونسی پالیسی ہے جس سے پبلک میں امیدوار جوش پیدا کر سکیں گے۔ سیاسی پارٹی کوئی ہے نہیں جس کے پروگرام کی تائید کر کے امیدوار لوگوں کی مدد حاصل کرے اور اگر کوئی پارٹی ہو بھی تو ابھی تک چونکہ پارٹی سسٹم پر حکومت کو قائم نہیں کیا گیا اور آئندہ کے لئے بھی سائمن رپورٹ نے اس کا دروازہ بند کر دیا ہے کوئی پارٹی سیاسی پروگرام نہیں تیار کر سکتی۔ پس کوئی امیدوار جو کسی حلقہ سے کھڑا ہو اپنے حلقہ کے ووٹروں کے سامنے پیش کرے تو کیا؟ کیا وہ اکیلا کوئی پالیسی تیار کر سکتا ہے اور اگر کرے تو کیا اپنے حلقہ کے لوگوں کو یقین دلا سکتا ہے کہ اگر وہ کامیاب ہوا تو اس پالیسی پر عمل کرا سکے گا۔ پارٹی تو یہ امید دلا سکتی ہے کیونکہ وہ بوجہ ایک جماعت ہونے کے اس امر کی امید رکھتی ہے کہ اگر اس کی کثرت ہوئی تو وہ حکومت پر قابض ہو جائے گی اور اپنی پالیسی کے مطابق حکومت کرے گی لیکن ایک فرد کس برتے پر کوئی وعدہ کر سکتا ہے؟ اس کے لئے تو ان حالات میں سوائے قومی اور مذہبی تعصب کی پناہ لینے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہو سکتا پس وہ اسی حربہ کو استعمال کرے گا۔ پس اب جب کہ علیحدہ انتخاب کی صورت میں امیدوار کی قوم کے سوال پر یا حد سے حد اس کے کانگریسی یا مخالف کانگریس ہونے کی بنیاد پر الیکشن کا جھگڑا طے کیا جاتا ہے۔

اگر متحدہ انتخاب ہو گا تو مذہب کی بناء پر جنگ ہو گی۔ پس جب تک کہ حکومت حقیقی طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں آتی اور بجائے اس کے کہ گورنر مختلف پارٹیوں سے چن کر وزارت بنائے ایک وزیر اعظم کے ذریعہ سے وزارت نہیں بنائی جاتی پارٹی سسٹم کبھی ترقی نہیں پا سکتا اور کبھی بھی سیاسی اصول پر انتخابات میں مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں جب صوبہ جات کو آزادی ملے گی اور لوگ یہ محسوس کریں گے کہ قوانین انگریزوں کی طاقت سے نہیں بلکہ وزارت کی مرضی سے بنتے ہیں تب وہ لوگ جن کو ان قانونوں سے تکلیف پہنچی اکٹھے ہونے شروع ہونگے اور اپنے لئے ایک الگ پالیسی مقرر کرلیں گے اور مشترکہ تکلیف کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ تمام ہندو، سکھ، مسلمان اور مسیحی ایک جتھہ بنالیں گے جن کو ان قانونوں سے تکلیف پہنچی ہوگی اور اس طرح آہستہ آہستہ مختلف سیاسی طریق کار ایسے تجویز ہو جائیں گے جن کی بناء پر لوگوں کو انتخاب کی جنگ لڑنا آسان ہو جائے گا اور بوجہ اس کے کہ یہ لوگ اپنی پارٹیوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، مسیحی ہر قسم کے لوگ شامل رکھتے ہونگے انتخاب کے موقع پر ہندو، مسلم یا سکھ، مسیحی کا سوال نہیں اٹھا سکیں گے اور نہ اس کی انہیں اس وقت ضرورت محسوس ہوگی تب اور صرف تب وہ وقت آئے گا جب ہندوستان کے مخصوص حالات کے لحاظ سے مخلوط طریق انتخاب بغیر فتنہ پیدا کرنے کے ملک کے لئے مفید ہو سکے گا۔ اس سے پہلے اسے جاری کر کے دیکھ لو، قومی تعصّب کی آگ روزانہ تیز سے تیز تر بھڑکنے لگے گی اور یہ علاج جو یورپین نگاہ میں تریاق نظر آتا ہے ہندوستان کو زہر ہو کر لگے گا۔ پس علیحدہ انتخاب کے طریق کو مسلمانوں پر احسان کر کے نہیں بلکہ ہندوستان کی ترقی اور یہاں کے باشندوں کے اچھے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے جاری رکھنا چاہئے۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر اس طریق کو جاری کر دیا گیا تو کیا ہمیشہ کے لئے یہ انوکھا طریق ہندوستان کے گلے پڑا رہے گا؟ آخر اس کے دور کرنے کا بھی کوئی طریق ہو گا یا نہیں؟ مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اس کے دور کرنے کا طریق یہی ہے کہ وہ اقلیتیں جن کے حق میں اس طریق کو جاری کیا جائے اس کے بدلنے کی سفارش کریں۔ اس وقت تک حکومتِ ہندوستان کا بھی یہی خیال ہے لیکن میرے نزدیک یہ حل کوئی ایسا آسان حل نہیں۔ "جن کے حق میں اس قانون کو جاری کیا گیا ہے" مُبہم الفاظ ہیں اس کا کون فیصلہ کرے گا کہ یہ قانون کس کے حق میں جاری کیا گیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ جن کو جُداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا ہے

یعنی جن کے ووٹروں کی الگ فہرست بنائی جاتی ہے انہیں کے حق میں اس قانون کو سمجھا جائے گا۔ یہ تعریف بے شک ایک حد تک مشکل کو حل کر دیتی ہے لیکن بعض صوبوں میں اس تعریف سے بھی کام نہیں چلتا۔ مثلاً پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ ایک عام حلقۂ انتخاب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ حق پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کو ملا ہے۔ لیکن یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اوپر کی دونوں قوموں کو چھوڑ کر ہندوؤں اور مسیحیوں کے سوا کسی اور مذہب کے لوگ پنجاب میں نہیں ہیں اور مسیحیوں کی تعداد بھی اس قدر کم ہے کہ یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ نام کے سوا عام حلقہ انتخاب میں ہندوؤں کے سوا کوئی اور قوم بھی شامل ہے۔ پس ہندو میرے نزدیک جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں اور سکھوں کو الگ کر کے درحقیقت عام حلقۂ انتخاب کا لفظ محض ایک نام کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ اس سے مراد ہندو ہی ہیں اس لئے یہ حق پنجاب میں ہماری خاطر بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ مسلمانوں اور سکھوں کی خاطر اور کم سے کم میرے نزدیک ان کا یہ دعویٰ خلاف عقل نہیں ہوگا۔ پس ان حالات میں وہی ہندو جو آج اپنے فائدہ کے لئے مخلوط انتخاب کا دعویٰ کرتے ہیں کل کو مسلمانوں کا فائدہ دیکھ کر علیحدہ انتخاب پر زور دیں گے۔ اس وقت اس طریق کو جو درحقیقت ایک عارضی تدبیر کے طور پر ہے کس طرح چھوڑا جا سکے گا؟

ابھی چند دن ہوئے ایک مشہور مسلمان سیاسی لیڈر سے اس بارہ میں میری گفتگو ہوئی اور میں نے ان سے یہی سوال کیا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ اس طریق انتخاب کو چھوڑنا پڑے گا۔ اُس وقت ہم کس طرح اس طریق کو چھوڑ سکیں گے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے اختیار میں ہوگا کہ ہم چھوڑ دیں۔ میں نے کہا کہ سائمن رپورٹ نے پنجاب میں اسے ہمارے اختیار میں نہیں رکھا بلکہ ہندو، مسلمان، سکھ تینوں قوموں کی رضامندی پر اس کے منسوخ ہونے کو منحصر رکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بے شک لیکن ہم یہ زور دیں گے کہ جس کی خاطر یہ قانون رکھا جائے اس کی مرضی پر یہ منسوخ ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا کہ اگر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہماری اس دلیل کو کارگر ہوتے دیکھ کر سکھوں اور ہندوؤں نے بھی پنجاب میں اپنے لئے علیحدہ انتخاب کا مطالبہ پیش کیا تو پھر؟ انہوں نے جواب دیا کہ تب ہم مخلوط انتخاب کی طرف آ جائیں گے۔ سکھ اور ہندو جُداگانہ انتخاب کو اختیار کر لیں گے اور مخلوط انتخاب ہمارے حصہ میں آ جائے گا جو کہ اس صورت میں بغیر جُداگانہ انتخاب کا الزام اپنے سر لینے کے جُداگانہ انتخاب کے

برابر ہی مفید ہو گا۔ چونکہ چائے پر دوستانہ گفتگو ہو رہی تھی اور کم سے کم میں اپنے دماغ پر پورا زور نہیں دے رہا تھا مجھے یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ مگر بعد میں جب میں نے اس کے سب پہلوؤں پر غور کیا تو مجھے یہ تجویز بالکل نامناسب معلوم دی کیونکہ یہ امر میرے دوست کے ذہن سے اتر گیا تھا کہ جُداگانہ انتخاب کا حق جسے دیا جائے اس کا چھوڑنا اسی کے اختیار میں ہے۔ سو اگر مسلمان اس پوزیشن کو اختیار کر لیں گے جو انہوں نے تجویز کی تھی تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نئے نظام حکومت کے بعد دوسرے ہی الیکشن پر ہندو' سکھ اپنے اس حق کو چھوڑ کر ہم سے آ ملیں گے اور ہمارے پاس ان کے روکنے کے لئے کوئی دلیل نہ ہو گی کیونکہ مخلوط انتخاب والے کا حق نہیں کہ وہ علیحدہ حلقہ انتخاب والے کو جُداگانہ انتخاب کا حق چھوڑنے سے روک سکے۔ پس نتیجہ یہ ہو گا کہ پیشتر اس کے کہ پنجاب مخلوط انتخاب کے لئے تیار ہو' وہ جُداگانہ انتخاب کے حق سے محروم کر دیا جائے گا اور نظام چونکہ قائم ہو چکا ہو گا مسلمان دوبارہ اس سوال کو نہیں اٹھا سکیں گے۔

غرض کم سے کم پنجاب میں اس علاج سے ہماری مشکلات کا حل نہیں ہو سکتا اور ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی نیا علاج تجویز کریں۔ میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا علاج ایک ہی ہے کہ علیحدہ انتخاب کا حق صرف محدود سالوں کے لئے ہو۔ اس عرصہ کے گذر جانے پر خود بخود سب ملک میں مخلوط انتخاب کا طریق رائج ہو جائے گا۔ ہاں اس عرصہ کے گذرنے سے پہلے بھی اگر اس جماعت کے تین چوتھائی منتخب نمائندے جس کے حق میں اس طریق کو جاری کیا گیا ہو یہ فیصلہ کر دیں کہ وہ اس حق کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں اور گورنر صوبہ کی رائے ہو کہ وہ اپنی قوم کی ترجمانی کر رہے ہیں تو اس قوم کے حق میں اس طریق انتخاب کو ترک کر دیا جائے۔ قوم کی ترجمانی معلوم کرنے کا ذریعہ یہ ہو کہ گورنر ان کی اس رائے کو شائع کر کے پبلک رائے کو معلوم کر لے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے پچیس سال کا عرصہ اس انتخاب کے طریق کو جاری رکھنے کے لئے کافی ہے وہ اقوام جو ڈرتی ہیں کہ کہیں ہماری حق تلفی نہ ہو۔ اگر وہ اس عرصہ میں بھی اپنے آپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں کر سکیں تو وہ مزید امداد کی مستحق نہیں ہیں لیکن یہ عرصہ نئے نظام سے شروع ہو۔ گذشتہ زمانہ اس میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ اس زمانہ میں صوبہ جات کو آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی اور بیداری بغیر آزادی کے نہیں پیدا ہوتی۔

اس پچیس سال کے عرصہ کے بعد جہاں جہاں اور جس جس قوم کے حق میں یہ طریق ابھی جاری ہو اسے موقوف کر دیا جائے لیکن شرط یہ ہو کہ صرف ان اقلیتوں کے حق میں اسے موقوف کیا جائے جو تین فیصدی سے زائد ہوں۔ جن اقلیتوں کی تعداد تین فیصدی سے کم ہو اور انہیں جُداگانہ انتخاب کا حق حاصل ہو ان کے اس حق کو بغیر ان کی مرضی کے خواہ کسی قدر عرصہ بھی گذر جائے۔ باطل نہ کیا جائے دوسری شرط یہ ہو کہ اس صورت میں اس حق کو باطل کیا جائے جب کہ ہر بالغ مرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو چکا ہو۔ جن قوموں کے حق میں اس قانون کو پچیس سال بعد منسوخ کر دیا جائے ان کی بھی میرے نزدیک دو قسمیں ضروری ہیں۔ اگر تو وہ قوم جسے جُداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا ہو اس کی صوبہ میں اکثریت ہے تب تو کُلّی طور پر اس قانون کو منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن اگر وہ قوم اقلیت ہے تو جُداگانہ انتخاب تو منسوخ ہو لیکن مخلوط انتخاب کے ساتھ اس کی تعداد یا اس کے مقررہ حق کے برابر نشستیں جو بھی ان میں سے زیادہ ہوں اس قوم کے لئے مقرر کر دی جائیں اور ان مقررہ نشستوں کو ترک کر کے کُلّی طور پر مخلوط انتخاب کو اختیار کرنا اس قوم کے تین چوتھائی افراد کے ریزولیوشن پر منحصر ہو۔ اور اس کے ساتھ بھی وہی شرطیں ہوں جو میں وقت سے پہلے جُداگانہ انتخاب کے طریق کو منسوخ کرنے کے متعلق بیان کر آیا ہوں۔

مختلف اقوام کی نیابت کا تناسب

جُداگانہ انتخاب کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر ایک قوم کی نمائندگی کا تناسب کیا ہوگا۔ کیونکہ جس ملک میں یہ طریق جاری نہ ہو وہاں سوائے اس صورت کے کہ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعیّن کیا جائے یہ سوال بِلاواسطہ طور پر پیدا ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب سب لوگ مل کر نمائندے منتخب کریں اور نشستوں کا تعیّن بھی نہ ہو تو جو قوم زیادہ جگہیں لے سکتی ہو لے جائے اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ پس یہ سوال خصوصیت کے ساتھ علیحدہ انتخاب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اسی کے ساتھ اسے بیان کرنا مناسب ہے۔

مسلمانوں کا مطالبہ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں شروع سے یہ رہا ہے کہ چونکہ ان کی پولیٹیکل حیثیت اس ملک میں بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے ان سے حکومت لی ہے اور اکثر حصے ملک کے ایسے ہیں جو مسلمان بادشاہوں سے بطور ٹھیکہ کے انہوں نے لئے تھے یا بطور انعام کے ان کو ملے تھے پس عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ جس قوم سے حکومت بطور مستأجری

یا انعام میں لی گئی ہو اس کے حق کو وقعت دی جائے۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ مسلمان فوجی خدمات میں اپنی قومی تعداد سے زیادہ حصہ لیتے رہے ہیں اس لئے بھی انہیں زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ یہ مطالبہ معقول ہے یا غیر معقول میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ بہرحال اس کو لارڈ منٹو تسلیم کر چکے ہیں اور مسٹر گوکھلے جیسا لیڈر اس کی تصدیق کر چکا ہے۔

لارڈ منٹو کے اعلان کے بعد ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے لکھنؤ میں ایک مجلس ہوئی تھی جس میں ہندوؤں نے اس اصل کو قبول کر کے مسلمانوں سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندو صوبوں میں ہندو مسلمانوں کو ان کے حق سے زائد حق دے دیں گے لیکن اسی طرح مسلمان مسلمان صوبوں میں ہندوؤں کو ان کے حق سے زائد نشستیں دے دیں۔ مسلمانوں نے بدقسمتی سے اسے منظور کر لیا۔ میں اسے بدقسمتی کہتا ہوں کیونکہ تمام بعد میں ظاہر ہونے والے فسادات اسی سمجھوتہ پر مبنی ہیں۔ ایک طرف ہندو مسلمانوں کو یہ سمجھوتہ یاد دلاتے ہیں دوسری طرف برطانوی نمائندے اس سمجھوتہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان نمائندوں نے اپنی طرف سے تو اپنی قوم سے نیکی ہی کرنی چاہی تھی لیکن ہو گئی بُرائی۔ اگر لارڈ منٹو کے اعلان اور اس پر مسٹر گوکھلے اور دوسرے ہندو لیڈروں کی تصدیق تک ہی معاملہ ختم ہو جاتا تو مسلمانوں کا حق ضائع نہ ہوتا۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بعض ہندوؤں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان اپنا حق لے چلے ہیں یہ چال چلی اور مسلمانوں سے میثاقِ لکھنؤ باندھ کر ہمیشہ کے لئے انہیں اپاہج کر دیا۔ لکھنؤ پیکٹ کیا ہے ایک اقرار ہے کہ ہندوستان بھر میں کسی صوبہ میں بھی مسلمانوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب نہ ہو گا۔ تعداد کے لحاظ سے بے شک مسلمانوں کو بہت کچھ مل گیا ہے لیکن قیمت کے لحاظ سے وہ سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ سائمن رپورٹ نے بھی مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ دوسرے صوبوں میں بھی مسلمانوں کو ان کے حق سے بہت زیادہ ملے اور پنجاب اور بنگال میں بھی انہیں قانون کے ذریعہ سے کثرت دلا دی جائے۔

میرے نزدیک لکھنؤ پیکٹ ایک غلطی تھی لیکن اس کے پیش کرنے والوں کو ایک بات بھول جاتی ہے اور وہ یہ کہ لکھنؤ پیکٹ کی کبھی بھی تصدیق نہیں کی گئی۔ وہ ہمیشہ کے لئے ایک منسوخ شدہ تحریر کی حیثیت میں رہا ہے اور اس امر کی تو سائمن رپورٹ بھی شہادت دیتی ہے کہ کم سے کم موجودہ زمانہ میں وہ قابل توجہ نہیں ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

"اس (لکھنؤ کے) معاہدہ کو اب دونوں ہی فریق نمائندگی کا صحیح فیصلہ کرنے والا نہیں تسلیم کرتے۔" ۵۳

لیکن حق یہ ہے کہ کبھی بھی اس پیکٹ پر عمل نہیں ہوا کیونکہ اس میں ایک اہم شرط تھی جس کی بناء پر یہ فیصلہ تسلیم کیا گیا تھا اور اس شرط پر ایک دن کے لئے بھی عمل نہیں ہوا اور وہ یہ کہ جب کسی قوم کے ممبروں کی تین چوتھائی یہ فیصلہ کر دے کہ کسی قانون کا ان کی قوم پر خاص طور پر مضر اثر پڑتا ہے تو وہ قانون پاس نہیں ہو سکے گا یہ قانون کبھی بھی قانون کی صورت میں نہیں آیا۔ پس جس اطمینان کی صورت کی امید دلانے پر مسلمان اس فیصلہ پر راضی ہوئے تھے جب کہ وہ صورت ہی پیدا نہیں ہوئی تو معاہدہ کی کیا ہستی رہی؟ غرض اس معاہدہ پر کسی فیصلہ کی بنیاد رکھنی بالکل درست نہیں اور جیسا کہ سائمن کمیشن نے لکھا ہے موجودہ مشکلات کو حل کرنے کے لئے ہمیں کوئی اور راہ تلاش کرنی ہوگی۔

سائمن کمیشن نے یہ راہ تجویز کی ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو انہیں وہی حقوق دے دیئے جائیں جو ان کو ملے ہوئے ہیں ۵۴ لیکن پنجاب اور بنگال جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کے نزدیک مسلمانوں کو ان کی آبادی کے مطابق حقوق دینے کمیشن کے نزدیک درست نہیں۔ کیونکہ

"اس سے مسلمانوں کو دونوں صوبوں (بنگال اور پنجاب) میں ایک معیّن اور ناقابلِ تغیّر اکثریت حاصل ہو جائے گی۔" ۵۵

کمیشن کا خیال ہے کہ:۔

"موجودہ زائد حق جو چھ صوبوں میں مسلمانوں کو حاصل ہے اس کی موجودگی میں بغیر دونوں قوموں میں کوئی نیا معاہدہ ہونے کے انصاف کے خلاف ہوگا کہ انہیں بنگال اور پنجاب میں موجودہ حق سے زائد دے دیا جائے۔"

کمیشن پھر خود ہی ایک تجویز پیش کرتا ہے۔ جس کے قبول کرنے پر وہ امید دلاتا ہے کہ مسلمانوں کے زائد حقوق دوسرے صوبوں سے نہیں چھینے جائیں گے اور جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے ان میں بھی انہیں زیادہ نمائندگی حاصل کرنے کا موقع رہے گا اور وہ یہ ہے کہ وہ بنگال میں مخلوط انتخاب کو مان لیں۔

پنجاب کے متعلق بھی ان کا خیال ہے کہ اگر مسلمان سکھ اور ہندو تینوں مخلوط انتخاب پر

راضی ہو جائیں تو اس سمجھوتے کے بعد وہ مسلمانوں کے باقی صوبوں سے زائد حق نہیں چھینیں گے۔

ایک ایسی جماعت سے جس میں سرجان سائمن (SIR JOHN SIMON) جیسا قانون دان شامل ہو اس قسم کی غیر معقول تجویز کی میں ہرگز امید نہیں کر سکتا تھا۔ کمیشن نے اس تجویز کے پیش کرتے وقت کئی امور بالکل نظرانداز کر دیئے ہیں۔ اول یہ کہ جو چیز انسان کی اپنی نہ ہو اسے وہ کسی کو دینے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر باہمی سمجھوتے سے بنگال میں جُداگانہ انتخاب کے طریق کو ترک کر دیا جائے تاکہ ہر اک جماعت ایک متحدہ حلقہ انتخاب سے اپیل کر کے جس قدر نشستیں لے جا سکے لے جائے۔ ہم اس بناء پر مسلمانوں سے ان دوسرے صوبوں میں کہ جہاں وہ اقلیت ہیں۔ جو زائد حق انہیں ملا ہوا ہے' نہیں چھینیں گے۔" ۵٦

جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر پنجاب اور بنگال دونوں مسلم صوبوں میں سے بنگال میں یہ سمجھوتہ ہو جائے کہ جُداگانہ طریق انتخاب کو چھوڑ کر مخلوط انتخاب جاری کر لیا جائے تو وہ اس صورت میں دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کے حق سے کچھ کم نہیں کریں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ملک کی قوموں میں آپس میں سمجھوتہ ہو جائے کہ وہ باوجود دوسری جگہ مسلمانوں کو زائد حق دینے کے اس صوبہ میں ان سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتے جس میں وہ اکثریت ہیں تو اس میں سائمن کمیشن کا کیا دخل ہے۔ سائمن کمیشن کا دخل تو اس صورت میں ہو سکتا تھا اگر وہ یہ کہتا کہ اگر مسلمان بنگال میں مخلوط انتخاب کو ترک کر دیں تو ہم بغیر دوسرے صوبوں میں سے مسلمانوں کا حق کم کرنے کے بنگال میں عام مقابلہ کی انہیں اجازت دے دیں گے لیکن جب بنیاد انہوں نے مختلف قوموں کے اتفاق پر رکھی ہے تو ان کی دخل اندازی کا سوال ہی نہیں رہتا۔ اس قسم کی بات انہوں نے پنجاب کے متعلق بھی کہی ہے۔

دوسری خلاف عقل بات ان کی اس تحریر سے یہ نکلتی ہے کہ ایک طرف تو ان کا یہ دعویٰ ہے کہ چونکہ مسلمان پنجاب اور بنگال میں جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرتے ہیں اس وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں بھی انہیں اس حق کے ساتھ ان کی تعداد کے برابر حق دے دیا جائے اور دوسرے صوبوں میں بھی انہیں ان کی آبادی سے زیادہ حق دے دیا جائے۔ اور دوسری طرف وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر بنگال اور پنجاب میں مسلمان اور دوسری قومیں سمجھوتہ

سے جُداگانہ انتخاب کو چھوڑ دیں تب ہو سکتا ہے کہ دوسرے صوبوں میں ان کا حق کم کرنے کے بغیر انہیں ان دونوں صوبوں میں آزاد مقابلہ کی اجازت دے دی جائے۔ اب ایک ادنیٰ غور سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دعوے متضاد ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں میجارٹی (MAJORITY) سے اس لئے محروم کیا گیا ہے کہ جُداگانہ انتخاب ان کے مطالبہ پر جاری کئے گئے ہیں اس وجہ سے انہیں مستقل اکثریت کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری طرف کمیشن کہتا ہے کہ جُداگانہ انتخاب کا طریق چھوڑ کر مخلوط انتخاب کو اختیار کرنا مسلمانوں کے اختیار میں نہیں بلکہ دوسری قوموں کی رضامندی پر مبنی ہے۔ اگر یہ تبدیلی دوسری قوموں کی رضامندی پر مبنی ہے تو مسلمانوں کی وجہ سے اس قانون کا اجراء نہ ہوا بلکہ سب قوموں کے لئے ہوا۔ پس کمیشن کا جُداگانہ انتخاب کی بناء پر مسلمانوں سے کسی قربانی کا مطالبہ کرنا درست نہ ہوا۔ لیکن اگر یہ درست ہے کہ یہ قانون مسلمانوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے اور اس وجہ سے انہیں اکثریت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے تو پھر اس کا ترک کرنا بھی صرف انہی کی مرضی پر منحصر ہونا چاہئے نہ کہ دوسروں کی رضامندی پر۔

تیسری بات جو کمیشن کے اس فیصلہ میں خلاف عقل نظر آتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کو کیا دیتے ہیں اور ان سے کیا لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ مسلمانوں کو دیتے ہیں وہ چند نشستیں ہیں اور جو لیتے ہیں وہ اکثریت ہے اور اقتصادیات کا یہ ایک موٹا اصل ہے کہ چیزوں کی قیمت ان کی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان کے فائدہ کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کیا سرجان سائمن اپنی پارٹی کی طرف سے یہ سمجھوتہ کسی دوسری پارٹی سے کرنے کو تیار ہونگے کہ جس دفعہ ان کی پارٹی کو پارلیمنٹ میں میجارٹی حاصل ہو سکتی ہو وہ اس میجارٹی کو چھوڑ دیں۔ اور بجائے اس کے آئندہ مختلف پارلیمنٹوں میں مثلاً دس فیصدی نشستیں انہیں حاصل ہو سکتی ہوں تو پندرہ فیصدی نشستیں ان کی پارٹی کو بلا مقابلہ دوسری پارٹیاں دے دیا کریں۔ یہ ایک موٹی بات ہے کہ دس پارلیمنٹوں کی مینارٹی کی قلیل زیادتی بھی ایک دفعہ کی میجارٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن سائمن کمیشن اس ظلم اور اس تعدی کا نام برطانوی انصاف رکھتا ہے کہ مسلمانوں کو چھ صوبوں میں کچھ زائد حق دے کر وہ مسلمانوں کو دو صوبوں کی میجارٹی سے محروم کر دیتا ہے اور محروم بھی ابدی طور پر کیونکہ آئندہ میجارٹی کے امکان کو بھی وہ اس شرط سے مشروط کر دیتا ہے کہ دوسری پارٹیاں قواعد کو تبدیل کرنے پر راضی ہوں اور اتنا بھی نہیں سوچتا

کہ ان پارٹیوں کو مستقل میجارٹی (MAJORITY) چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

چوتھی بات جو اس فیصلہ میں خلاف عقل ہے یہ ہے کہ سائمن رپورٹ مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں ان کی تعداد کے مطابق نیابت دینے سے اس وجہ سے انکار کرتی ہے کہ:۔

> "اس سے مسلمان کو دونوں صوبوں میں معیّن اور ناقابلِ تغیّر اکثریت حاصل ہو جائے گی۔"۵۷

گویا سائمن کمیشن کی نگاہ میں کسی جماعت کو خواہ وہ اکثریت ہی کیوں نہ ہو۔ مستقل میجارٹی (MAJORITY) دینا درست نہیں اور حد سے بڑھا ہوا مطالبہ ہے لیکن اس حد سے بڑھے ہوئے مطالبہ کا علاج وہ یہ کرتا ہے کہ اقلیت کو مستقل میجارٹی دے دیتا ہے۔ کیونکہ وہ موجودہ طریق کو آئندہ بھی جاری رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے اور موجودہ قانون میں بنگال اور پنجاب میں درحقیقت ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہے۔ پنجاب کے معاملہ کو اگر مشتبہ بھی قرار دیا جائے تو بھی بنگال کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ جنرل کانسٹی چیوانسی (GENERAL CONSTITUENCY) میں چھیالیس ہندو ممبر ہیں اور اُنتالیس مسلمان ممبر ہیں۔ ادنیٰ اقوام میں سے جو ممبر ہو گا وہ بھی ہندو ہی ہو گا اور ایسا ہی ہوتا ہے اس طرح ہندوؤں کو سینتالیس ممبریاں مل گئیں۔ لیبر کی طرف سے دو ممبر مقرر ہیں۔ جن میں سے کم سے کم ایک ہندو ہو گا تو اَڑتالیس ہندو ہو گئے ۔ اگر ایک لیبر کا ممبر مسلمان فرض کر لیا جائے۔ جو عام طور پر نہیں ہوتا تو چالیس مسلمان ہوئے۔ زمینداروں کی کانسٹی چیوانسی (CONSTITUENCY) کی طرف سے پانچ ممبر ہوتے ہیں۔ عملاً وہ سب کے سب ہندو ہوتے ہیں لیکن اگر ووٹروں کی تعداد کو مدنظر رکھیں تو فرض کر لیتے ہیں کہ چار ہندو اور ایک مسلمان ہو گا۔ اس طرح باون ہندو اور اکتالیس مسلمان ہوئے۔ یونیورسٹی کا ممبر بوجہ ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ ہونے کے لازماً ہندو ہو گا۔ بہرحال اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ممبر باری باری ہندو مسلمانوں میں سے منتخب ہوتا رہے گا تو اس کو دونوں طرف نہیں ڈالتے۔ لیکن تجارت چونکہ پورے طور پر ہندوؤں کے قبضہ میں ہے۔ چار ہندوستانی ممبر سب کے سب ہندو ہونگے۔ یہ فرض کر کے شاید کبھی مسلمان بھی ہو جائے۔ ووٹروں کی تعداد کا ایک سرسری اندازہ لگا کر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ چار میں سے ایک مسلمان ہو جایا کرے گا اور اس طرح کُل ہندو ممبر چوّن اور مسلمان بیالیس بنتے ہیں۔ یعنی بارہ کا فرق ہے۔ انگریز اینگلوانڈین

(ANGLO INDIANS) اور ہندوستانی مسیحیوں کی تعداد آٹھ بنتی ہے۔ اور تجارت کے انگریز نمائندے ملا کر یہ تعداد انیس ہوتی ہے۔ گویا اکثریت جو چوّن فیصدی سے کچھ اوپر ہے اس کے کُل نمائندے بیالیس اور اقلیت جو پینتالیس فیصدی سے کچھ کم ہے۔ اس کے کُل نمائندے تہتّر ہو جاتے ہیں۔ یعنی پچھتّر فیصدی زیادہ حق اقلیت کو دے دیا گیا ہے۔ اگر انگریز اور مسیحی نمائندوں کو نکال دیا جائے تب بھی ہندو ممبر اپنے حق سے ساٹھ فیصدی زیادہ لے گئے ہیں اور مسلمانوں سے قریباً پچیس فیصدی زیادہ ہیں حالانکہ آبادی میں وہ ان سے بیس فیصدی کم ہیں۔ یہ اندازے جو میں نے اوپر لکھے ہیں بہت نرم ہیں عملاً جو کچھ ہوتا ہے اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں منتخب شدہ ممبر چھیالیس ہندو اور اُنتالیس مسلمان تھے۔ زمینداروں کی کانسٹی چیوانسی (CONSTITUENCY) میں سے پانچوں ہندو تھے' یونیورسٹی کا ممبر ہندو تھا' تجارتی ممبریوں میں سے گیارہ انگریز اور چار ہندو تھے۔ ادنیٰ اقوام کا ممبر بھی ہندو تھا۔ گویا ستاون ہندو اور انتالیس مسلمان تھے۔ پھر گورنر صاحب نے جو غیر سرکاری ممبر اپنے اختیار سے نامزد کئے وہ چار تھے لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ہندو اپنے حق سے بہت زیادہ لے چکے ہیں انہوں نے بھی بجائے مسلمانوں کی کمی کو پورا کرنے کے ایک مسلمان اور تین ہندو نامزد کئے گویا ساٹھ ہندو اور چالیس مسلمان مقرر ہو گئے اور وہ مسلمان جن کو ہندوؤں کے مقابل پر پچیس فیصدی کی اکثریت حاصل تھی ان پر ہندوؤں کو ساٹھ فیصدی کی اکثریت دے دی گئی۔

خلاصہ یہ کہ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو توڑ کر بنگال میں قانونی طور پر غیر مبدّل اکثریت ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف دے دی گئی ہے اور پنجاب میں بھی کم سے کم ۱۹۲۲ء میں ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں پر اکثریت حاصل تھی۔ اب ممکن ہے کہ مساوات حاصل ہو۔ پس غور کے قابل بات یہ ہے کہ اکثریت کو قانوناً اگر اکثریت دینی جائز نہیں تو اس کی اکثریت کو قانوناً توڑ دینا یا کسی ایک اقلیت یا اقلیتوں کے مجموعہ کو قانونی اکثریت دے دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ اور کیا اس ناواجب طریق کو جاری رکھتے ہوئے سائمن کمیشن کو یہ خیال نہیں گذرا کہ یہ طریق اکثریت کو اکثریت دینے سے زیادہ ظالمانہ ہے؟ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوؤں کی اکثریت خاص منافع کی نمائندگی کے سبب سے ہے نہ کہ عام حلقہ ہائے نیابت کی وجہ سے۔ کیونکہ بنگال میں تو عام حلقہ نیابت میں بھی ہندوؤں کو مسلمانوں کی اُنتالیس نشستوں کے مقابل پر چھیالیس نشستیں دی گئی ہیں زمینداری' تجارتی'

یونیورسٹی اور ڈپرسڈ کلاسز (DEPRESSED CLASSES) کے نام سے ان کی اکثریت کو صرف مزید تقویت دی گئی ہے۔ اور پنجاب میں بھی یہی بات ہے کہ خاص منافع کے نام سے ہندوؤں اور سکھوں کو اکثریت دے دی گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ خاص منافع کی نشستیں کس نے قائم کی ہیں۔ آیا قانون نے یا مسلمانوں نے۔ جو قانون اس قسم کی مصنوعی شاخیں پیدا کر کے ایک اکثریت کی اکثریت کو باطل کر دیتا ہے کیا وہ ظالمانہ نہیں اور کیا اس کا بدلنا کمیشن کا فرض نہ تھا کیا اس قسم کی خاص نشستیں انگلستان میں جاری ہیں وجہ کیا ہے کہ وہاں تو تجارت کے باوجود ہندوستان سے زیادہ اہم ہونے کے علیحدہ نمائندگی کی مستحق نہیں قرار پاتی اور ہندوستان میں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر انگریزی تجارت بوجہ غیر ملکی ہونے کے خاص نمائندوں کی مستحق تھی تو اس کی کیا وجہ ہے کہ انگریزوں کو زائد نمائندگی دینے کے لئے ہندوؤں کو بھی زائد نمائندگی دے کر مسلمانوں سے بڑھایا جاتا ہے مگر میں اس سوال کے متعلق آگے چل کر زیادہ تفصیل سے لکھوں گا اس لئے یہاں اس کا ذکر چھوڑتا ہوں۔

پانچویں غلطی سائمن کمیشن نے اس فیصلہ میں یہ کی ہے کہ ایک طرف تو وہ فیڈرل اصول کو جاری کر کے یہ اصل تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کے صوبہ جات ایک آزاد ہستی رکھتے ہیں یا لارڈ منٹو (LORD MINTO) کے الفاظ میں ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک براعظم ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آتا ہے تو وہی کمیشن یہ کہتا ہے کہ چونکہ دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو زیادہ حق مل گیا ہے اس لئے پنجاب اور بنگال میں ان کی میجارٹی قائم نہیں رکھی جاسکتی۔ کیا وہ صوبہ جات جو فیڈریشن کے اصول پر زور دیتے ہیں اس امر کو پسند کر سکتے ہیں کہ ایک صوبہ کا حق دوسرے کو دے دیا جائے۔ کیا دنیا میں کسی اور جگہ بھی یہ قاعدہ ہے کہ ایک پارٹی کو ایک صوبے میں زیادہ حق دے دیا جائے اور دوسری کو دوسرے میں۔ کیا اس قسم کا فیصلہ آسٹریلیا یا کینیڈا کے صوبوں کے متعلق کوئی کمیشن بغیر خطرناک نتائج پیدا کرنے کے کر سکتا ہے۔ پھر یہ قربانی پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے حقوق کے متعلق کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ کیا کبھی بھی بنگال اور پنجاب کے باشندوں نے سائمن کمیشن یا کسی اور کمیشن کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ان کے حقوق دوسرے صوبوں کے مسلمانوں میں تقسیم کر دے اور وہ بھی اس طرح کہ مسلمان ہر جگہ کمزور ہو جائیں۔ میں ذاتی طور پر تو اس امر کے لئے تیار ہو جاؤں گا کہ اگر مثلاً یو۔ پی اور بہار میں مسلمانوں کو میجارٹی دے دی جائے تو بنگال اور پنجاب

میں مسلمانوں کو مائناریٹی (MINORITY) دے دی جائے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ دوسرے مسلمان بھی اس پر راضی ہوں۔ لیکن اس امر پر تو کوئی مسلمان جماعت راضی نہیں اور راضی نہیں ہو سکتی کہ دوسرے صوبوں کی مسلمان اقلیتوں کو اس قدر حق زائد دے کر جن سے وہ پھر بھی اقلیت میں ہی رہیں مسلمانوں کی دو جگہ کی اکثریت کو اقلیت سے بدل دیا جائے۔ اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہندوؤں نے جو قربانی دوسرے صوبوں میں کی ہے' اس کا بہت بڑا بدلہ ان کو مل چکا ہے اور وہ یہ کہ صوبہ سرحد کے مسلمان صوبے کو ان کی شہہ اور ان کی خوشی کے لئے اب تک آزادی سے محروم رکھا گیا ہے۔

بہر حال کسی کمیشن کا یہ حق نہیں کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا حق وہ اور کسی صوبہ کے لوگوں کی خاطر قربان کر دے۔ ان دونوں صوبوں کے مسلمان اس کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں اور میں جانتا ہوں کہ خواہ کس قدر قربانی ہی کیوں نہ کرنی پڑے وہ ہرگز اس کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ اگر برطانیہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو کسی زائد حق کا حقدار نہیں سمجھتا تو وہ اس زیادتی کو جو دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو دی ہے واپس لے سکتا ہے۔ لیکن وہ ان صوبوں کو کوئی زیادتی پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو کمزور کر کے کسی صورت میں نہیں دے سکتا بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ دوسرے صوبوں کے مسلمان بھی کوئی ایسی زیادتی قبول نہیں کریں گے جس کی ناقابل برداشت قیمت پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں سے وصول کی جائے۔ اگر قیمت لینی ہے تو صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان اس قیمت کو ادا کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ صوبہ سرحد کے مسلمان اس امر کو قبول کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو پچیس فیصدی تک حق دے دیں گویا ان کی آبادی سے پانچ گُنے زیادہ۔ اسی طرح سندھ اور بلوچستان کے مسلمان بھی اگر انہیں آزادی ملے تو تیار ہیں کہ دوسرے صوبہ جات کے مسلمانوں کی خاطر ہندوؤں کو ان کے حق سے بہت زیادہ تعداد میں نیابت دے دیں۔

چھٹی غلطی اس فیصلہ میں کمیشن سے یہ ہوئی ہے کہ باوجود اس امر کو تسلیم کرنے کے کہ لکھنؤ پیکٹ پر کبھی بھی عمل نہیں کیا گیا اور اب تو دونوں پارٹیاں اسے رد کرتی ہیں یہ خیال اس کے ذہن پر مستولی رہا ہے کہ مسلمانوں کو جو کچھ دوسرے صوبوں میں ملا ہے وہ لکھنؤ پیکٹ کی وجہ سے ملا ہے اور اس وجہ سے لکھنؤ پیکٹ کے مطابق پنجاب اور بنگال میں بھی عمل ہونا چاہئے لیکن یہ خیال ان کا بالکل غلط ہے۔ نہ مسلمانوں کا دعویٰ لکھنؤ پیکٹ پر مبنی ہے اور نہ اس کی بناء

پر وہ کسی تبدیلی کے لئے تیار ہیں۔ مسلمانوں کو اگر ہندو اکثریت کے صوبوں میں کوئی حق ملا ہے یا اس کا وہ مطالبہ کرتے ہیں تو اس کی بناء لارڈ منٹو کے اعلان پر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے نقل کر چکا ہوں۔ لارڈ منٹو نے بحیثیت وائسرائے کے مسلمانوں کے وفد کے جواب میں یہ اعلان کیا تھا کہ:۔

"آپ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ موجودہ قوانین کی بناء پر جو جماعتیں کونسلوں کے ممبر منتخب کرتی ہیں ان سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی مسلمان امیدوار کو منتخب کریں گی اور یہ کہ اگر اتفاقاً وہ ایسا کر دیں تو یہ اسی صورت میں ہو گا کہ وہ امیدوار اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اکثریت کے ہاتھ فروخت کر دے اور اس وجہ سے وہ امیدوار اپنی قوم کا نمائندہ نہیں ہو گا۔

اسی طرح آپ لوگ بالکل جائز طور پر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ کے حقوق کا فیصلہ صرف آپ کی قوم کی تعداد کو مدّ نظر رکھ کر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس فیصلہ کے وقت آپ کی قوم کی سیاسی اہمیت کو بھی مدّ نظر رکھنا چاہئے اور ان خدمات کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ جو اس نے حکومت برطانیہ کی تائید میں کی ہیں۔ میں آپ کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ لارڈ منٹو (LORD MINTO) تسلیم کرتے ہیں کہ۔ (۱) جُداگانہ انتخاب کے طریق کو اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے کوئی احسان نہیں بلکہ صرف انہیں موت سے بچانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔

(۲) مسلمانوں کا حق ہے کہ ان کی تعداد سے زیادہ ان کو نیابت دی جائے۔ پس جُداگانہ انتخاب کو سائمن کمیشن یا کوئی اور جماعت احسان قرار دے کر اس کے بدلہ کی طالب نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک ایسا طریق ہے جس کو لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے حقوق کے قیام کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو ان کی تعداد سے زائد نیابت کا دیا جانا بھی لارڈ منٹو کے اعلان کے مطابق کسی اور صوبے میں اپنا حق چھوڑ دینے کے بدلہ میں نہیں ہے بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے ہے۔ پس اس زیادتی کے بدلہ میں پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے حق کو تلف کرنا برطانیہ کے لئے ہر گز جائز نہیں ہو سکتا۔ برطانیہ کے نمائندے کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ منٹو کا اعلان ایک پرزہ کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب وہ

زمانہ نہیں رہا کہ ہم اس امر کا خیال کریں کہ ہندوستان کا بڑا حصہ مسلمان حکومت سے بطور انعام یا بطور مستأجری ہمیں ملا تھا اس لئے مسلمانوں کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں۔ اور پھر وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی خدمات کی قیمت ادا ہو چکی۔ یا یہ کہ اب ان سے بڑھ کر خدمت کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ہم نے جن صوبہ جات میں مسلمانوں کو ان کے حق سے زائد نیابت دی تھی اسے اب واپس لیتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات کسی صورت میں نہیں کہہ سکتے کہ پنجاب اور بنگال کی اکثریت کی قربانی کے بدلہ میں انہوں نے دوسرے صوبہ جات کے مسلمانوں کو ان کے حق سے زائد دیا تھا کیونکہ یہ امر حکومت ہند کے ریکارڈ کے خلاف ہے۔ اگر انہیں وہ زیادتی گراں معلوم ہوتی ہے تو وہ بے شک اسے واپس لے لیں لیکن وہ ہم سے اس قربانی کا مطالبہ نہ کریں جو قربانی ہم کسی صورت میں کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور جو مسلمان نمائندہ بھی اس فیصلے پر راضی ہو گیا کہ پنجاب اور بنگال کی اکثریت کو قربان کر دیا جائے تو مسلمان اسے یقیناً غدار سمجھیں گے اور میرے نزدیک وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہونگے۔

کمیشن کی یہ دلیل کہ کسی قوم کو مستقل میجارٹی نہیں دی جاسکتی بالکل بے حقیقت ہے۔ میجارٹی کو مستقل میجارٹی ہی دی جاتی ہے۔ اقلیت کو میجارٹی بے شک نہیں دی جاسکتی مگر اس مستقل اور غیر مستقل کی کوئی شرط نہیں۔ لیکن کمیشن کا فعل تو بالکل ہی عجیب ہے کہ اس نے اقلیت کو تو قانوناً اکثریت دے دی ہے لیکن اکثریت کو اکثریت دینے سے انکار کر دیا ہے۔

ساتویں غلطی سائمن کمیشن نے اس فیصلہ میں یہ کی ہے کہ آخر میں اس حقیقت کو بھی ظاہر کر دیا ہے کہ اس کا یہ فیصلہ کن مخفی اغراض پر مبنی ہے۔ کمیشن پنجاب اور بنگال میں جائنٹ الیکٹوریٹ (JOINT ELECTORATE) کے چھوڑنے کی تحریک کے متعلق لکھتا ہے۔

> "ہم نے یہ آخری تجویز جو درحقیقت مسلمانوں کو دو راستوں میں سے ایک کے منتخب کرنے کا حق دیتی ہے اس لئے پیش کی ہے۔ کیونکہ ہم سچے دل سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ جس قدر ذرائع ممکن ہو سکیں انہیں اختیار کر کے جُداگانہ انتخاب کے طریق کو کم کیا جائے۔ اور دوسرے (یعنی مشترک) طریق انتخاب کے لئے عملی تجربہ کا موقع نکالا جائے۔" [۵۸]

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ سائمن کمیشن کا اصل منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کو مجبور کر کے

جُداگانہ انتخاب کے طریق کو منسوخ کرایا جائے۔ گویا چونکہ حکومت ہند مسلمانوں سے جُداگانہ انتخاب کا وعدہ کر چکی ہے اب صاف لفظوں میں تو مسلمانوں سے کمیشن نہیں کہنا چاہتا کہ تم اس حق کو چھوڑ دو۔ ہاں وہ مخفی ذرائع سے زور دے کر انہیں مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس حق کو چھوڑ دیں۔ مگر میں کمیشن کے ممبروں کو بتانا چاہتا ہوں کہ وعدہ کے ایفاء کا یہ بہت ہی بُرا طریق ہے اور علم الاخلاق کے رو سے یہ وعدہ کا پورا کرنا نہیں بلکہ اس کا توڑنا سمجھا جاتا ہے۔

کمیشن کے ممبروں کو لارڈ منٹو کا یہ اقرار نہیں بھولنا چاہئے تھا کہ جو مسلمان نمائندے جُداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے چُنے جائیں' وہ حقیقی طور پر مسلمان نمائندے نہیں ہو سکتے اور اس کی روشنی میں دیکھنا چاہئے تھا کہ کیا اس قسم کے تجربے کا وقت آگیا ہے؟ پھر کمیشن کو یہ بھی دیکھنا چاہئے تھا کہ اب بھی انتخاب کا ایک حصہ مخلوط ہے کیا اس تجربہ میں وطنیت کا کوئی نمونہ نظر آتا ہے؟ کیا یونیورسٹیوں کی نشستیں مسلمانوں کو مل رہی ہیں اگر پنجاب اور بنگال میں بھی مسلمان یونیورسٹیوں کی نشستیں حاصل نہیں کر سکے تو اس قسم کے انتخاب کی برکات کا انہیں کس طرح قائل کیا جا سکتا ہے؟ اور جب تجربہ بتاتا ہے کہ ہندو وطنیت نہیں بلکہ مذہب کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اس تجربہ کے لئے مسلمانوں کو مشورہ دینا نہیں بلکہ ان کی اکثریت کو تباہ کر کے مجبور کرنا کس طرح قرینِ انصاف ہو سکتا ہے۔

میں گو تفصیل سے اس امر کو بیان نہیں کر سکتا لیکن اس جگہ مختصراً اس امر کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں کہ جُداگانہ انتخاب کا اصول اس قدر بُرا نہیں ہے جس قدر کہ ظاہر کیا جاتا ہے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اس اصل کو سیاسیات نے تسلیم کیا ہوا ہے۔ پس اس کی مخالفت بوجہ اصول کی خرابی کے نہیں ہے بلکہ اس کی شکل کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان کے جُداگانہ انتخاب اور دوسرے ملکوں کے جُداگانہ انتخاب میں فرق صرف یہ ہے کہ باہر کے ملکوں میں اس کی بنیاد نسل یا علاقہ یا پیشہ پر رکھی جاتی ہے اور ہندوستان میں اس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ چنانچہ انگلستان میں ہاؤس آف لارڈز (HOUSE OF LORD) کی بنیاد اسی اصل پر پڑی ہے۔ سیکنڈ چیمبر (SECOND CHAMBER) کی خوبیاں تو بعد میں معلوم ہوئی ہیں لیکن لارڈز پہلے سے اپنا حق سمجھتے تھے کہ انہیں حکومت کے مسائل میں عُذر کرنے کا موقع دیا جائے اور یہ کہ ان کے انتخاب کو عام لوگوں کے ووٹ پر نہ رکھا جائے کیونکہ اس طرح ان کا انتخاب خطرہ میں ہوگا۔ بلکہ ان کا دعویٰ تھا کہ جب ایک شخص ذاتی حیثیت میں بادشاہ کی طرف سے پارلیمنٹ میں

بیٹھنے کیلئے بلایا جائے اور وہ اس دعوت کو قبول کرلے تو آئندہ اس کی اولاد کا بھی حق ہو جائے گا کہ اسے بھی اس غرض کیلئے بلایا جائے۔ ۵۹ یونیورسٹی کی نشستیں بھی اسی اصل کے ماتحت ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ یونیورسٹیوں کو الگ ممبر دیئے جائیں۔ کیوں انہیں نہ کہا جائے کہ عام حلقۂ انتخاب سے اپنے آدمیوں کو بھیجیں۔ تجارت و صنعت کی نشستیں بھی ایسی ہی ہیں لیکن ان سب منافع کی حفاظت کیلئے اہمیت کے لحاظ سے بہت کم ہی علیحدہ انتخاب کی اجازت دی جاتی ہے لیکن مذہب خطرہ میں ہو تو اس طریق کو بے اصول سمجھا جاتا ہے۔ یہ واقعہ میں حیرت کی بات ہے اور سمجھ سے بالا ہے۔

سائمن کمیشن کی تجویز کی غلطیاں ظاہر کرنے کے بعد اب میں وہ تجاویز بتاتا ہوں جو میرے نزدیک معقول ہیں اور جن پر عمل کر کے عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے۔ سو سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گو بنگال اور پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن اکثریت سے مراد صرف تعداد کی اکثریت نہیں ہوتی بلکہ حقیقی اکثریت ہوتی ہے اور وہ اکثریت ان صوبوں میں بھی مسلمانوں کو حاصل نہیں ہے۔ شروع شروع میں تو مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں خود حکومت نے کمزور کیا تھا کیونکہ غدر کے بعد حکومت کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو آگے بڑھانا حکومت کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ قانون کوئی نہیں تھا لیکن عملاً حکام کی یہی پالیسی تھی کہ وہ مسلمانوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ یہ روح اس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ ہمارے وطنی شاعر غالب کی سوانح میں اس بارہ میں ان کا ایک عجیب تجربہ لکھا ہے۔ وہ آخری شاہِ دہلی کے درباری تھے اور خود نواب زادے تھے۔ غدر کے بعد تباہی آئی تو یہ بے چارے بھی فاقوں کو پہنچ گئے۔ آخر کسی نے مشورہ دیا کہ نوکری کرلیں۔ انہی دنوں انگریزی مدرسہ میں فارسی کی پروفیسری کی جگہ خالی ہوئی۔ یہ اس انگریز کے پاس جا پہنچے جس کے سپرد پروفیسر کا انتخاب تھا۔ وہاں پہنچے تو اس نے دیکھتے ہی کہا کہ "ہم مسلمان کو نہیں مانگتا" غالب سا حاضر جواب بھلا کہاں چُوکتا تھا۔ بولے صاحب! مسلمان کہاں ہوں آپ کو دھوکا ہوا۔ اگر عمر بھر ایک دن شراب چھوڑی تو کافر اور ایک دن بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان۔ مگر ان کی حاضر جوابی کام نہ آئی اور صاحب نے گھر سے نکال کر دم لیا۔

اس قسم کے واقعات ہر روز پیش آتے تھے اور اس وقت تک پیش آتے رہے جب تک لارڈ کرزن (LORD CURZON) نے اس ظلم کا ازالہ نہ کیا اور خاص سرکلر کے ذریعہ سے

تاکید کی کہ آئندہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے حق کو مقدم رکھا جائے کیونکہ یہ قوم بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ لیکن لارڈ کرزن کی تجویز بھی کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ ہندو دفاتر پر بہت قبضہ کر چکے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ دفاتر پر ان کا قبضہ ہے' بنکوں پر ان کا قبضہ ہے اور تجارت پر ان کا قبضہ ہے۔ پنجاب میں قانون زمیندارہ کے منظور ہونے سے پہلے قریباً تیس فیصدی زمینیں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر ان کے ہاتھ میں جا چکی تھیں۔ اور بنگال میں انگریزی عمل داری کے شروع ہی میں تحصیل داری کے ٹھیکوں میں وہ ملک کے مالک ہو چکے تھے۔ اب جو کچھ باقی ہے وہ رہن ہے یا قرضہ کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے کیونکہ زمیندار قرض لینے پر مجبور ہے اور ہندو ساہوکار اپنی زیادہ طلبی کے راستہ میں کسی قانون کو مانع نہیں پاتا۔

پس ان حالات میں مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں حقیقی اکثریت کا مالک نہیں کہا جا سکتا حالانکہ جس اکثریت سے کوئی قوم اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے وہ حقیقی اکثریت ہے نہ کہ خالی تعدادی اکثریت۔ پس جب تک مسلمانوں کو حقیقی اکثریت حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک وہ ان دونوں صوبوں میں بھی خاص حفاظت کے مستحق ہیں۔

اوپر کے تمدنی نقص کے علاوہ ایک اور نقص بھی ہے اور وہ یہ کہ فرنچائز (FRANCHISE) کے اصول ایسے بنائے گئے ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں ووٹر دوسری اقوام سے تھوڑے رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ پنجاب جس میں مسلمان ۲ء۵۵ کی تعداد میں ہیں ان کے ووٹروں کی تعداد ۷ء۴۳ ہے اور بنگال جس میں مسلمان ۶ء۵۴ ہیں۔ اس میں مسلمان ووٹروں کی تعداد ۱ء۴۵ فیصدی ہے۔ پس جب کہ بناوٹی قوانین سے مسلمانوں کے ووٹروں کی تعداد کو کم رکھا جاتا ہے تو مسلمان اکثریت میں کس طرح سمجھے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آئندہ اس قسم کا انتظام کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی تعداد کے مطابق ووٹر مل جائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال تو جس قدر جلد ہو سکے حل ہونا چاہئے لیکن باوجود اس نقص کے دور کرنے کے مسلمان فوراً اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ ووٹر فوراً اپنے کام اور اپنے فرض کو نہیں سیکھ جاتے۔ کچھ عرصہ مسلمانوں کو پھر بھی چاہئے ہوگا جس میں کہ وہ اپنے ووٹروں کو ووٹ دینے کا طریق سکھا سکیں اور ان میں سیاسیات سے دلچسپی پیدا کرا سکیں۔ کیونکہ شروع میں غیر مسلموں کو مسلمانوں پر یہ فوقیت ہوگی کہ ان کے ووٹروں کی زیادہ تعداد پچھلے بارہ سال کے تجربہ کے ماتحت اپنے کام سے واقف ہو چکی ہوگی اور سیاسی دلچسپی اس میں پیدا ہو چکی ہوگی۔ نئے ووٹر کو

پوری دلچسپی نہیں ہوتی۔ چنانچہ انگلستان میں عورتوں نے کس زور سے ووٹ کا حق حاصل کیا تھا لیکن اس کے استعمال میں وہ شوق ظاہر نہیں کیا جس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں ابھی ووٹ کے استعمال کا طریق نہیں آیا اور نہ سیاسیات کی تفصیلات سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان پنجاب اور بنگال میں گو ظاہراً اکثریت میں ہیں لیکن طاقت کے لحاظ سے اقلیت میں ہیں اور اس وجہ سے ویسے ہی حفاظت کے مستحق ہیں جس طرح کہ ظاہری اقلیتیں۔ کیونکہ زیادہ آدمیوں پر ظلم ہوتے رہنا تھوڑے آدمیوں پر ظلم ہوتے رہنے سے زیادہ بُرا اور ظالمانہ فعل ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک صداقت ہے کہ اکثریت ہمیشہ کے لئے حفاظت کی مستحق نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرح دائمی حفاظت سے مطمئن ہو کر وہ کمزور ہونے لگتی ہے اور نہ صرف خود تباہ ہوتی ہے بلکہ ملک کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ پس جہاں تک اکثریت کی حفاظت کا سوال ہے اس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہ بات صرف عارضی ہو سکتی ہے اور اس حفاظت کا عارضی رکھنا ملک کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ اکثریت کی اپنی زندگی کے قیام کے لئے بھی ضروری ہے۔

اس اصل کو پیش کرنے کے بعد میں اب پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے سوال کو لیتا ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک اکثریت اسی وقت حفاظت کی مستحق ہوتی ہے جب وہ معنوی طور پر اقلیت ہو اور یہ کہ وہ اس صورت میں بھی دائمی حفاظت کی مستحق نہیں ہوتی۔ پس اس اصل کے ماتحت پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو جن کی نسبت میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ معنوی طور پر وہ اقلیت ہی ہیں گو حفاظت تو مل سکتی ہے لیکن صرف عارضی حفاظت مل سکتی ہے۔

پس ہمیں جہاں ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت کا سامان مہیا کرنا چاہئے وہاں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ اس حفاظت کے سوال کو کب اور کس طرح ختم کیا جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب اکثریت کہہ دے گی کہ اب ہمیں حفاظت کی ضرورت نہیں اس وقت حفاظتی تدابیر کو ختم کر دیا جائے گا۔ لیکن میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ تدبیر قابلِ عمل نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ جس وقت اکثریت کہے کہ اب ہمیں حفاظتی تدابیر کی ضرورت نہیں اس وقت دوسری اقوام یہ کہہ دیں کہ اب ہم ان کے چھوڑنے پر راضی نہیں اور اس طرح صرف ضِدّ اور تعصب کی وجہ سے نہ کہ حقیقی ضرورت کے لحاظ سے حفاظتی تدابیر جو کہ درحقیقت

وقتی علاج ہوتی ہیں دائمی طور پر ملک کے گلے پڑ جائیں۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک اس تدبیر کو اختیار کرنے میں یہ نقص بھی ہے کہ گو ہم یہ کہتے رہیں کہ یہ تدابیر وقتی ہیں لیکن جو قوم ان کے ذریعہ سے فائدہ اٹھا رہی ہو گی وہ اس خیال سے کہ ہمارے ہی اختیار میں تو بات ہے جب چاہیں گے ان تدابیر کو چھوڑ دیں گے' اپنی کمزوری کو دور کرنے کے لئے جلد کوشش نہیں کرے گی اور نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بجائے اپنے نفس میں بیداری پیدا کرنے یا دوسری قوم سے صلح کی کوشش کرتے رہنے کے حفاظتی قانون پر دارومدار رکھنے کی عادی ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے ان کی تدابیر کی حفاظت کی آڑ لینے پر مجبور رہے گی۔

پس ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسا طریق ایجاد کریں جس کی مدد سے ہماری تینوں غرضیں پوری ہو جائیں۔ اول ان حفاظتی تدابیر کو بغیر از سرِ نَو جھگڑا پیدا کرنے کے ختم کیا جا سکے۔ دوم اکثریت اپنی حالت کو جلد سے جلد اچھا کرنے پر مجبور ہو۔ سوم حفاظتی تدابیر فساد اور جھگڑے کو بڑھانے میں مُمِدّ نہ ہوں۔ سو ان تینوں غرضوں کو پورا کرنے کے لئے میرے نزدیک صرف ایک ہی تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ چند سال مقرر کر دیئے جائیں کہ اس وقت تک یہ حفاظتی تدابیر رہیں گی' اس کے بعد خود بخود منسوخ ہو جائیں گی۔ اس طرح تینوں فائدے حاصل ہو جائیں گے کیونکہ سال مقرر ہونے کی وجہ سے کسی جماعت کو کسی وقت بھی یہ کہنے کا موقع نہ ملے گا کہ ہم انہیں ختم نہیں ہونے دیں گے۔ دوسرے اکثریت کو یہ خیال رہے گا کہ صرف فلاں وقت تک یہ حفاظت ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی اس لئے وہ اس قانون سے مطمئن نہیں ہو گی بلکہ پورا زور لگائے گی کہ اس سے پہلے پہلے وہ اپنے افراد کو بیدار کر لے تاکہ اس کے منسوخ ہونے پر وہ اپنی حفاظت خود کر سکے۔ تیسرے سب اقوام اپنے اندر صلح کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہیں گی کیونکہ ہر ایک فریق جان لے گا کہ وہ دوسرے کو اس کی غفلت کی حالت میں کمزور نہیں کر سکتا اور یہ کہ کچھ عرصہ کے بعد سب کو مل کر کام کرنا ہو گا۔ پس آئندہ آنے والے مخلوط انتخاب کے خیال سے جب کہ ہر ایک امیدوار کو اپنی ہمسایہ قوم کی امداد کا خواہاں ہونا پڑے گا' سب قوموں کے افراد آپس کی رنجش اور کدورت کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ غرض عرصہ کی تعیین سے یہ تینوں فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے بہتر تدبیر یہی ہے کہ عرصہ کی تعیین ہو جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ کتنا عرصہ اکثریت کو بیدار کرنے کے لئے ملنا چاہئے سو اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔ اس جگہ اصولی طور پر اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ کامل صوبہ جاتی آزادی کے حصول کے بعد پندرہ سال یعنی تین الیکشن کا عرصہ اس غرض کے لئے ضروری ہے اور صوبہ جاتی حکومت کی تکمیل کا عرصہ اگر ہم دس سال فرض کریں تو پچیس سال کا عرصہ اس غرض کے لئے بہت مناسب ہے۔ اس عرصہ کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اس عرصہ سے کم میں قوم کی تعلیم اور اقتصادی حالت کو درست کرنا بہت مشکل کام ہے۔

جہاں اقلیتوں کو حفاظت دی گئی ہے ان کے متعلق بھی میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ اس عرصہ کے بعد جُداگانہ انتخاب کا حق ان سے لے لیا جائے لیکن مقررہ نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب کا حق ان کے پاس اس وقت تک رہے جب تک ان کی مرضی ہو۔

اس کے بعد میں حق نیابت کی مقدار کے سوال کو لیتا ہوں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ اقلیتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تعداد کے لحاظ سے اور ایک ضعف اور کمزوری کے لحاظ سے۔ پس اگر اقلیتوں کے حق کی حفاظت کی ضرورت تسلیم کرلی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو اقلیت ظاہری نہیں بلکہ معنوی ہے وہ بھی اسی طرح حفاظت کی محتاج ہے جس طرح کہ ظاہری۔ اور جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ معنوی اقلیت بھی حفاظت کی محتاج ہوتی ہے، تو اسے طاقت پہنچانے کے لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس قدر زیادہ سے زیادہ حق اسے جائز طور پر دیا جا سکے اسے ملنا چاہئے تا کہ وہ طاقت حاصل کر سکے۔ اگر زیادہ سے زیادہ جائز حق اسے نہ دیا جائے تو جس غرض سے اسے حفاظت دی گئی ہے وہ پوری نہیں ہو سکے گی اور ایک اکثریت کا زیادہ سے زیادہ جائز حق وہ تناسب نیابت ہے جو اسے تعداد کے لحاظ سے مل سکتا ہے۔ پس عقلاً ایک اکثریت جو اس قدر کمزور ہو کہ اقلیت سے بھی اسے خطرہ لاحق ہو اسے پورے طور پر وہ حق ملنا چاہئے کہ جو تعداد کے لحاظ سے اسے مل سکتا ہے۔ اور اس دلیل کی بناء پر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو اگر واقعہ میں اپنی کمزوری دور کرنے کا موقع دینا ہے تو لازمی طور پر پچپن اور چوّن فیصدی حق نیابت دینا لازمی ہے۔

چونکہ میرے مقرر کردہ اصول کے مطابق پنجاب اور بنگال کی اکثریت کو صرف ایک معیّن مدت تک جو عقلاً ان کے لئے اپنی کمزوری دور کرنے کے لئے ضروری ہے حفاظت حاصل ہو گی اس لئے کمیشن کا یہ اعتراض بھی دور ہو جاتا ہے کہ قانوناً کسی کو مستقل اکثریت نہیں مل

سکتی۔ کیونکہ یہ اکثریت مستقل نہیں ہوگی بلکہ عارضی ہوگی اور پچیس سال کے بعد سب فریق آزاد ہوں گے کہ ووٹروں کو اپنی پالیسی بتا کر اپنے حق میں کرلیں بلکہ اس عرصہ میں سیاسی پالیسیاں قائم ہو چکی ہوں گی۔ غالب امید ہے کہ مذہبی بنیاد پر الیکشن کی جنگ کا زمانہ بھی گذر چکا ہوگا اور سیاسی سوالات پر الیکشن کا مقابلہ شروع ہو چکا ہوگا اور ان احتیاطوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی جو آج نہایت اہم اور ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

کمیشن کے اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے کہ اکثریت کی اکثریت کو قانون کی مدد سے قائم رکھنا اصول کے خلاف ہے میں ایک تجویز بھی پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ پنجاب اور بنگال کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی ایک وہ حلقہ ہائے انتخاب جن میں ایک مذہب کے پیروؤں کے ووٹ اسی فیصدی یا اس سے زائد ہوں۔ یعنی اکثریت اور اقلیتوں کے ووٹوں کی نسبت ایک اور چار کی ہو یا اس سے بھی زیادہ ہو۔ ایسے تمام حلقہ ہائے انتخاب میں مخلوط انتخاب کر دیا جائے اور جن حلقہ ہائے انتخاب میں اس سے کم فرق ہو ان میں جُداگانہ انتخاب رہے۔ اس طرح دونوں ملکوں میں بعض حصوں سے تو جُداگانہ انتخاب پر ممبر آئیں گے اور بعض حصوں سے مخلوط انتخاب کے ذریعہ۔ لیکن چونکہ نسبت ووٹروں کی ایک اور چار کی ہوگی اس لئے جب تک اکتیس فیصدی ووٹ اقلیت اکثریت سے نہیں چھینے گی اس وقت تک اس پر فتح نہیں پا سکے گی۔ اس ذریعہ سے ایک ہی وقت میں دونوں قسم کے تجربے شروع ہو جائیں گے اور اکثریت کو کوئی ایسا خطرہ بھی نہ ہوگا جس کا علاج نہ ہو سکے۔ جس حلقہ میں جُداگانہ انتخاب رہے وہ انہیں شرائط کے ساتھ جو میں پہلے لکھ چکا ہوں پچیس سال کے بعد بند ہو جائے۔ اس طریق سے اکثریت قانونی اکثریت نہیں کہلا سکے گی کیونکہ اس کا ایک حصہ مخلوط انتخاب سے بغیر کسی قانون کی مدد کے آیا ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ ایک اور چار کا فرق ایسا بڑا فرق ہے کہ اس میں اکثریت کا کامیاب ہونا یقینی ہے پس یہ بھی ایک قسم کی قانونی مدد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فائدہ دونوں قوموں کو یکساں ملے گا۔ دوسرے اگر یہ بات قانونی مدد کہلانے کی مستحق ہوگی تو کیوں سی۔ پی اور مدراس کے انتخاب جہاں مسیحی اور مسلمان مل کر بھی پندرہ فیصدی سے کم ہیں قانونی طور پر ہندوؤں کو اکثریت دینے والے نہ قرار دیئے جائیں؟

دوسرا سوال ان صوبوں کا ہے جن میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ سو صوبہ سرحد اور سندھ دونوں کے آزاد حکومت حاصل کرنے پر اس سوال کا حل خود بخود ہو جاتا ہے۔ اگر

ہندو صاحبان بحیثیت مجموعی مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنا چاہیں گے تو ان دونوں صوبوں کے مسلمانوں سے سمجھوتہ کرلیں گے۔ جو حق وہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو دیں گے وہی حق ان کو ان دونوں صوبوں میں اور بلوچستان میں مل جائے گا اور اگر ہندو صاحبان نے بحیثیت قوم سمجھوتہ نہ کرنا چاہا تو ان نئے اسلامی صوبوں میں بھی انہیں کوئی زائد حق نہیں مل سکے گا کیونکہ مسلمان بھی اپنی قوم کا ویسا ہی درد رکھتے ہیں جیسا کہ ہندو اپنی قوم کا رکھتے ہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کا دعویٰ لارڈ منٹو (LORD MINTO) کے اعلان کی بناء پر زائد نیابت کے لئے قائم رہے گا۔ لیکن ہندوؤں کو اسلامی صوبوں سے زائد حق مانگنے کا حق نہ ہو گا اس لئے کہ ان کے دعویٰ کی بنیاد کسی گورنمنٹ کے اعلان پر نہیں ہے بلکہ صرف سمجھوتہ پر ہے۔ پس سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں ان کا مطالبہ ناجائز ہو جائے گا۔

اس سوال کو اصولی طور پر حل کرلینے کے بعد جب ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں تو ہمیں بہت سی مشکلات معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم پنجاب اور بنگال کے انتخاب کے حلقوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی طرح بنائے گئے ہیں کہ ان کی بناء پر مسلمانوں کی اکثریت خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ بہت سے حلقے مخصوص فوائد کے قرار دیئے گئے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو عام حلقوں سے کافی نیابت مل بھی جائے تو مخصوص حلقے توازن کو خراب کر دیتے ہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ سوال حکومت کو بہت پریشان کر رہا ہے لیکن اگر غور سے دیکھیں تو یہ پریشانی خود اپنی پیدا کی ہوئی ہے کیونکہ جس قدر وسیع مخصوص فوائد ہندوستان میں ہیں دنیا بھر میں اور کسی جگہ نہیں ہیں۔ دوسرے ممالک میں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑا زمیندار' بڑا تاجر' بڑا صنّاع اپنی دولت اور اپنے رسوخ کے ذریعہ سے دوسرے لوگوں کی نسبت کونسلوں میں آنے کا زیادہ موقع حاصل کر سکتا ہے لیکن ہمارے ہاں براہمنی طریق نے ہر شعبہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر نسلی براہمن کو ہم اس کے مقام سے ہٹانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی یہ نیا براہمن جو پیشوں یا کاموں کی وجہ سے اپنے آپ کو باقی دنیا سے بالا سمجھتا ہے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا اور ہمارے ملک کے نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

پنجاب میں علاوہ عام حلقہ ہائے انتخاب کے مندرجہ ذیل حلقہ ہائے انتخاب میں ایک یونیورسٹی کا' ایک بلوچ سرداروں کا' ایک مسلمان زمینداروں کا' ایک ہندو زمینداروں کا'

ایک سکھ زمینداروں کا' دو تجارتی' ایک مزدوروں کا' ایک مسیحیوں کا' ایک یوروپین کا' ایک اینگلوانڈین کا' ایک فوجی' گویا کل چھہتر (۷۶) غیر سرکاری ممبروں میں سے بارہ حلقے مخصوص ہیں یعنی سولہ فیصدی اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں سولہ فیصدی بھرتی مخصوص حلقوں سے ہوگی وہاں قوموں کا توازن کب قائم رہ سکتا ہے۔ دنیا کا اور کونسا ملک ہے جس میں اس سے نصف بھرتی بھی مخصوص حلقوں سے کی جاتی ہو؟

تفصیلاً نگاہ ڈالنے کے لئے زمینداروں کا حلقہ ہی لے لو۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے کہ زمیندار کو اپنے انتخاب کے لئے خاص حلقہ کی ضرورت ہے؟ خود سائمن کمیشن نے بھی اس امر پر حیرت ظاہر کی ہے کہ یہ حلقہ الگ کیوں ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ زمیندار علاوہ اپنے حلقہ کے دوسرے حلقوں سے بھی بہت زیادہ تعداد میں کونسلوں میں داخل ہوئے ہیں پس کوئی وجہ نہیں کہ ان حلقوں کو قائم رکھا جائے۔ خاص حلقے یا تو اس وجہ سے بنائے جاتے ہیں کہ کسی خاص گروہ کو دوسروں سے مل کر انتخاب کے ذریعہ سے حق نہ مل سکتا ہو۔ یا اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ ملک میں دو کونسلیں ہوں۔ جیسے کہ ہاؤس آف لارڈز (HOUSE OF LORDS) اور ہاؤس آف کامنز (HOUSE OF COMMONS) میں فرق کیا گیا ہے۔ لیکن جب کہ زمینداروں کو نہ خطرہ ہے اور نہ کسی دوسری مجلس کا سوال ہے پھر انہیں خاص حق کیوں دیا جائے۔ میری یہ تحریر اور بھی وزنی ہو جاتی ہے جب کہ اس امر کو یاد رکھا جائے کہ میں خود اُن زمینداروں میں سے ہوں جنہیں اس خاص حق کا فائدہ پہنچتا ہے۔ اور اس حلقہ کے اُڑانے پر میرے اور میرے چار بھائیوں کا یہ حق تلف ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے جو فضول بات ہے میں اسے فضول کہنے سے نہیں رک سکتا۔

اسی طرح تجارتی حلقہ ہے۔ وجہ کیا ہے کہ اس حلقہ کو قائم رکھا جائے؟ کیا تاجروں کو دوسرے حلقہ میں کھڑا ہونے سے کوئی روک ہے؟ اگر روک نہیں تو بڑا تاجر جو بڑا رسوخ بھی رکھتا ہے کیوں دوسرے حلقہ سے کھڑا نہیں ہو سکتا؟ کیا انگلستان میں یا امریکہ میں تاجر کو حق دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں دیا جائے؟ تاجر بے شک عام حلقہ سے کھڑے ہوں اور سب ممبریاں لے لیں لیکن انہیں خاص طور پر حق کیوں دیا جائے؟ اس طرح فوجی ممبر ہے۔ جنگ عظیم میں شامل ہونے والے فوجیوں کو خاص طور پر ووٹ کا حق دیا گیا ہے۔ پس اگر فوجی کوئی خاص فوائد کونسلوں سے وابستہ رکھتے ہیں تو اپنے حد سے بڑھے ہوئے ووٹنگ (VOTING) کے حق سے

کام لیکر فوجیوں کو کونسلوں میں بھیج سکتے ہیں۔ الگ فوجی ممبر مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہی حال مزدور ممبر کا ہے کافی طور پر مزدور ووٹر ہر ایک صوبہ میں موجود ہیں وہ اپنے ووٹ سے کام لے کر اپنے آدمی بھیج سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بیّن بات ہے کہ خود سائمن کمیشن کے ایک ایسے ممبر نے جو مزدور پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اس پر اعتراض کیا ہے اور نامزدگی کو مزدوروں کے مفاد کے خلاف بتایا ہے۔ اگر یہ حلقہ ہائے مخصوص اُڑا دیئے جائیں تو توازن کا قائم رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ بنگال کے زمینداروں کے حلقے اور تجارتی حلقے اگر اُڑا دیئے جائیں تو مختلف اقوام کو ان کی تعداد کے مطابق ووٹ دینا نسبتاً بہت آسان ہو جاتا ہے۔

اب ایک انگریزوں کا سوال رہ جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس وجہ سے کہ اس وقت بوجہ حکومت سے ناراضگی کے ان کے خلاف خاص جوش ہے وہ اس امر کے مستحق ہیں کہ انہیں خاص نیابت ملے لیکن ان میں بھی تجارتی اور عام حلقوں کی تقسیم فضول ہے۔ جس قدر تعداد کہ انگریزی فوائد کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھی جائے اس قدر تعداد ان کے لئے مقرر کر دی جائے۔ تاجر بھی اور دوسرے بھی اپنے اپنے اثر کے حلقے سے کھڑے ہو کر اپنی نیابت حاصل کر لیں ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مگر ہمیں اس پر ضرور اعتراض ہے کہ انگریزوں کو خاص حصہ دینے کے لئے ایسے اصول ایجاد کئے جائیں جن کے ماتحت ہندوؤں کو بھی اپنے حق سے زائد لینے کا موقع مل جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ فوائد صرف انگریزوں کی نیابت کو مضبوط کرنے کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں لیکن اب مسلمان اس طریق کی مضرتوں سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ وہ انگریزوں کے خاص حق پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے اور انگریزوں کے لئے جو خطرات ہیں ان کو دیکھ کر انہیں کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن ایسے اصول تجویز کر کے انہیں حق نہ دیئے جائیں کہ ساتھ ہی مسلمانوں کے حق کا ایک ٹکڑا اسی اصل کے ماتحت ہندو بھی کاٹ لیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں پنجاب کی ممبریوں کی تقسیم عمدگی سے اس طرح ہو سکتی ہے کہ دو فیصدی حق نیابت انگریزوں اور اینگلو انڈینز (ANGLO INDIANS) کو دے دیا جائے۔ ان کے تجارتی اور دوسرے سب فوائد بھی اس میں شامل ہوں لیکن تجارت کے نام سے علیحدہ حق نہ دیا جائے۔ ایک سیٹ یونیورسٹی کو ملے لیکن شرط یہ کر دی جائے کہ ایک دفعہ ہندو یا سکھ ممبر ہو اور دوسری دفعہ مسلمان ممبر گو انتخاب مخلوط ہو۔ یا پھر یہ کیا جائے کہ دو نشستیں یونیورسٹی

کو دے دی جائیں لیکن ان میں سے ایک مسلمان کے لئے اور ایک ہندو یا سکھ کے لئے وقف ہو۔ انتخاب مخلوط ہی ہو۔ اور یا تو واحد قابل انتقال ووٹ سے انتخاب ہو لیکن شرط یہ ہو کہ دوسرا ممبر وہ نہیں ہوگا جسے دوسرے نمبر پر ووٹ ملیں بلکہ وہ مسلمان امیدوار ہوگا جسے مسلمانوں میں سے سب سے زائد ووٹ ملیں۔ یا ہر ووٹر کو دو ووٹ دیئے جائیں جن میں سے ایک وہ ہندو کو دینے کا اور ایک مسلمان کو دینے کا پابند ہو یا اور ایسا ہی کوئی طریق اختیار کیا جائے۔ خاص زمینداروں کو اگر الگ سیٹ دینی ہی ہے تو صرف ڈیرہ غازیخان کے تمنداروں کو جو چھوٹی قسم کے رولنگ چیفس (RULING CHIEFS) ہیں ایک سیٹ دے دی جائے لیکن اس صورت میں ان کے لئے قاعدہ ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے حلقوں میں سے نہیں کھڑے ہو سکتے۔

اگر ہم پنجاب کے دو سو ممبر فرض کریں جو ضرور ہونے چاہئیں تو یونیورسٹی کی دو اور تمنداروں کی ایک نشست فرض کر کے سات نشستیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک سو ترانوے (۱۹۳) نشستیں باقی رہ جاتی ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے مسلمان پچپن فیصدی سے کچھ زیادہ ہیں۔ ہندو اٹھائیس فیصدی کے قریب ہیں اور سکھ بارہ فیصدی ہیں اور مسیحی اور ادنیٰ اقوام وغیرہ ایک فیصدی سے کچھ زیادہ ہیں۔ پس تعداد آبادی کے لحاظ سے ۲۳ء۱۶ سکھوں کو اور ۵۹ء۸ ہندوؤں کو اور ۲ء۵ مسیحیوں اور ادنیٰ اقوام کو ممبریاں ملنی چاہئیں۔ ہم ہندوؤں کی نشستیں پوری ساٹھ فرض کر لیتے ہیں اور اسی طرح سکھوں مسیحیوں اور ادنیٰ اقوام کی کسر پوری ممبری فرض کر کے چوبیس اور تین ممبر فرض کر لیتے ہیں۔ پس بقیہ ۱۹۳ ممبروں میں ایک سَو چھ ممبر مسلمان ہوئے۔ چونکہ ایک یونیورسٹی کی اور ایک تمنداروں کی نشست ان کو مل چکی ہے اس لئے ایک سَو آٹھ ممبران کے ہوئے۔ اپنی تعداد کے لحاظ سے انہیں ایک سَو گیارہ ممبریاں ملنی چاہئیں تھیں۔ پس اس حساب کے رو سے انہوں نے تین ممبریاں انگریزوں اور دوسری اقوام کو دیں۔ اس کے مقابل پر ہندوؤں کی یونیورسٹی کی نشست ملا کر اکسٹھ ممبریاں ہوئیں اور انہیں ایک ممبری اقلیتوں کے لئے قربان کرنی پڑی۔

جہاں تک میں غور کرتا ہوں اس امر کو دیکھ کر کہ سکھ اور ہندو تمدنی طور پر ایک ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق نہ صرف ادا کرتے ہیں بلکہ دوسری اقوام کے مقابل پر اکٹھے ہو جاتے ہیں یہ انتظام نہایت منصفانہ انتظام ہے اور اس میں کسی قوم کا حق نہیں مارا جاتا۔

بنگال کی نسبت میرے نزدیک بہتر طریق یہ ہو گا کہ چھ فیصدی انگریزوں اور اینگلو انڈینز (ANGLO INDIANS) کو نشستیں دے دی جائیں۔ خواہ تجارت پیشہ ہوں یا دوسرے جو چار فیصدی مسلمانوں سے اور دو فیصدی ہندوؤں سے لی جائیں اور اس طرح مسلمانوں کو ۵۰۶٫ حق دیا جائے اور دوسری اقوام کو ۴۹۴٫ حق دیا جائے۔ یونیورسٹی کی دو نشستیں مقرر کی جائیں جن میں سے ایک ہندو کو اور ایک مسلمان کو ملے۔ زمینداروں کی الگ نمائندگی کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر انہیں علیحدہ نمائندگی دی جائے تو اس اصل پر ہو کہ ہر قوم کے حقِّ نیابت کے برابر اس کی قوم کے زمینداروں کو حق نیابت ملے کیونکہ اگر زمینداروں کو صرف زمینداری کے حقوق کی نیابت کا خیال ہے تو ان کی نیابت اسی طرح ایک مسلمان زمیندار کر سکتا ہے جس طرح ایک ہندو۔

پس اگر ان کی غرض صرف زمیندارہ حقوق کی حفاظت ہے تو انہیں اس بات پر راضی ہو جانا چاہئے کہ دونوں قوموں کی نیابت کے تناسب کو قائم رکھنے کے لئے زمینداروں کے حلقوں کا انتخاب مخلوط لیکن معین نشستوں کے ساتھ ہو اور تعیّن نشستوں کا آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہو۔ اسی طرح اگر ہندوستانی تجارتی حلقوں کو حق دینا ضروری سمجھا جائے تو اسی اصول پر دیا جائے۔ یعنی نشستوں کا تعین مذہب کے مطابق ہو جائے تاکہ تجارتی اور زمینداری حلقوں کو قومی برتری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ آخر مسلمان تاجر بھی ہیں اور زمیندار بھی اور وہ اسی طرح ان مخصوص مفاد کی نگرانی کر سکتے ہیں جس طرح ہندو صاحبان۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر ان حلقوں کو قائم رکھا جائے تو یہ شرط نہ کر دی جائے کہ تعداد آبادی کے مطابق ان حلقوں کے نمائندے منتخب ہونے چاہئیں۔ میں اس تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا کہ یہ انتخاب کن اصول پر ہوں کیونکہ انتخاب کے مختلف ذرائع میں سے کئی ذرائع ہماری غرض کو پورا کر سکتے ہیں۔ جو بھی مناسب ہو اسے اختیار کیا جائے۔ اصل غرض صرف یہ ہے کہ انگریزوں کی نمائندگی کے بعد جس میں چار فیصدی کی قربانی مسلمانوں سے اور دو فیصدی کی قربانی ہندوؤں سے کرائی جائے باقی سب حلقوں میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ خواہ مخصوص ہوں خواہ عام نسبت آبادی کی قائم رہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ میرے کئی دوست مجھ پر اعتراض کریں گے کہ۔ اس وقت تک تو میں زور دیتا رہا ہوں کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے مطابق ووٹ ملیں لیکن اب میں نے خود

پنجاب میں ساڑھے پچپن کی بجائے چون اور بنگال میں ساڑھے چون کی بجائے پچاس کی تجویز پیش کی ہے۔ سو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں اب بھی اسی تجویز کی تائید میں ہوں لیکن علاوہ ہندوستانی اقوام کے ہمیں انگریزوں کے مخصوص مفاد کا بھی خیال رکھنا پڑے گا جن کی آبادی بہت کم ہے لیکن تجارت اور صنعت بہت وسیع ہے۔ پس اگر انہیں کوئی حق دیا گیا تو لازماً دوسری اقوام کے حق میں سے دیا جائے گا اور یہ معقول بات نہیں ہو سکتی کہ ہم انگریزوں کے اس حق کو تو تسلیم کریں لیکن ساتھ ہی اپنی تعداد سے بحصّہ رسدی انہیں نشستیں دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ پس ان حالات میں ہمیں دو اصل تسلیم کرنے پڑیں گے۔ ایک یہ کہ بنگال و پنجاب میں مسلمانوں کی حقیقی اکثریت قائم رہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے حصہ کے مطابق بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ انگریزوں کو حق دے دیں تاکہ ان کے حقوق کی نمائندگی پوری طرح ہو سکے۔

مسلمانوں کو یہ امر بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ پنجاب اور بنگال دونوں جگہوں میں انگریزوں نے اکثر اوقات مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے اور آل انڈیا برٹش ایسوسی ایشن (ALL INDIA BRITISH ASSOCIATION) نے تو حال کے کلکتہ کے اجلاس میں کُلّی طور پر مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کی ہے۔ پس ہمیں بھی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہئے۔ اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ان کی طرف ہمارا دوستانہ طور پر بڑھنا ان کے دلوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہے گا اور ہم آئندہ انہیں ایک خیر خواہ دوست پائیں گے۔ خصوصاً جب کہ ان کا زیادہ تر کام تجارت ہے اور اس وجہ سے ان کی رقابت ہندوؤں سے بہ نسبت مسلمانوں کے بہت زیادہ ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ پنجاب اور بنگال میں آپس میں سمجھوتہ کر کے ایک مستقل اکثریت کے ساتھ مسلمان اور انگریز نمائندے ان دونوں صوبوں کی ترقی کے لئے حکومت قائم کر سکیں گے اور اپنے منصفانہ رویہ سے دوسرے صوبوں کے لئے ایک نیک مثال قائم کر دیں گے۔

میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ تقسیم جو میں نے اوپر بتائی ہے یہ فرض کر کے ہے کہ پنجاب اور بنگال کی آبادی ۵۵ء۴ اور ۵۶ء۶ ہے۔ اگر اس سے زائد آبادی مسلمانوں کو حاصل ہوئی جیسا کہ امید ہے کہ آئندہ مردم شماری میں اِنْشَاءَ اللّٰہُ حاصل ہوگی تو جو زیادتی اس وقت یا آئندہ مردم شماریوں میں ہوگی یہ سب کی سب مسلمانوں کو ملے گی۔ اسے کسی صورت

میں بھی دوسری اقوام میں بانٹا نہیں جائے گا۔ مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ خوش آئند مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے قوموں کے سمجھوتے کی کوشش کریں اور اگر سکھوں کو خوش کرنے کے لئے کسی قدر اور قربانی کرنی پڑے تو پرواہ نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی طرح بھی صلح سے کام نہ نکلے تو پنجاب کے مسلمانوں کو باون فیصدی حق تمام دوسری اقوام کی مشترکہ طاقت کے مقابل پر قبول کرلینا چاہئے۔ کیونکہ اِنْشَاءَ اللّٰہُ آئندہ مردم شماری میں ستاون فیصدی تک مسلمانوں کی آبادی ہونے کی امید ہے جسے ملا کر فوراً ہی ساڑھے ترپن فیصدی حق مسلمانوں کو مل جائے گا۔ جسے ان کی بڑھتی ہوئی نسل اِنْشَاءَ اللّٰہُ ہر مردم شماری میں مضبوط کرتی چلی جائے گی۔

فرنچائز اور عورتوں کی نمائندگی

اب میں فرنچائز (FRANCHISE) کے سوال کو لیتا ہوں لیکن چونکہ اس سوال کے صرف اس پہلو کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو عورتوں کے ووٹ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں نے اسی کے ساتھ عورتوں کی نمائندگی کو بھی شامل کر دیا ہے۔

مجھے اس سوال کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کمیشن نے اس سوال کا فیصلہ کرتے وقت بہت بے احتیاطی سے کام لیا ہے اور اس مضمون کو چھیڑ دیا ہے جسے چھیڑنا اس کے منصب سے باہر تھا یعنی مسلمانوں کے مذہب پر حملہ کیا ہے۔ سرجان سائمن (SIR. JOHN SIMON) اور ان کے ساتھی اس امر سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ پردہ اسلام کا ایک حکم ہے اور اس کے خلاف کچھ لکھنا براہ راست اسلام پر حملہ کرنا ہے۔

میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی رائے کے متعلق آزاد ہے۔ اس بارہ میں اسلام سے زیادہ کوئی مذہب حریت نہیں سکھاتا اور اگر سرجان سائمن کوئی مذہبی کتاب لکھ رہے ہوتے تو میں ان کے خیالات کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا اور ان کے دلائل کے حسن و قبح کو پرکھتا لیکن سرجان سائمن ایک سرکاری کمیشن کی رپورٹ لکھ رہے تھے اور اس وجہ سے انہیں مذہبی مسائل سے علیحدہ رہنا چاہئے تھا۔ وہ بار بار پردہ کو بہت سے مصائب کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

> "(مردوں اور عورتوں کی تعداد میں) فرق سب سے نمایاں دس سے بیس سال کی عمر کے افراد میں ہے اور تمدنی رسوم اور عادات جیسے کہ پردہ اور بچپن کی شادی ہیں اور نادان دائیوں کی حرکات کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان امور

کی وجہ سے ہندوستان کی عورتوں کی قوتوں کو بہت نقصان پہنچا ہے۔"[۶۰]

اسی طرح وہ لکھتے ہیں:۔

"جب تک کہ ایک چھوٹی لڑکی کی قسمت میں پردہ اور بچپن کی شادی لکھی ہوئی ہے اُس وقت تک نہ تو رائے عامہ اور نہ والدین کی اُمنگیں ہی روبکار ہو کر لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کیلئے آواز اُٹھائیں گی۔"[۶۱]

بزعم خود ان نقائص کو دور کرنے کیلئے کمیشن نے عورتوں کی فرنچائز پر زور دیا ہے لیکن وہ اس اہم سیاسی اصل کو بھول گئے ہیں کہ سیاسی حقوق مانگنے پر ہی ملنے چاہئیں۔ جب کہ وہ مردوں کے لئے جو اپنا حق مانگ رہے ہیں فرنچائز کو وسیع کرنے سے گھبراتے ہیں' سرحد کے لوگوں کو براہ راست فرنچائز دینے سے انکار کرتے ہیں' بلوچستان کو اس لئے فرنچائز نہیں دیتے کہ ان کی عادات کے یہ طریق خلاف ہے وہ عورتوں کو فرنچائز دینے کے لئے بغیر ان کی مانگ کے اور ان کے حالات کا خیال کئے بغیر تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بات ان کے افعال کے متضاد ہونے کا ثبوت نہیں؟ اور کیا یہ امر اس بات کو ظاہر نہیں کرتا کہ اس سوال کے حل کرنے میں اس قدر تمدنی ضرورتوں کا خیال نہیں کیا گیا جس قدر مغربی تمدن کی برتری کو ثابت کرنا مد نظر رکھا گیا ہے؟ اور ایک شاہی کمیشن کے ممبروں کا اس رویہ کو اختیار کرنا نہایت ہی ناپسندیدہ اور مکروہ فعل ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ کمیشن کے اس رویہ میں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا مسٹروجوڈبن بھی شامل ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ مجھ سے گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک ممبر اور ایک سیکرٹری نے بیان کیا تھا راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے ممبروں کے انتخاب کے موقع پر باوجود گورنمنٹ آف انڈیا کے دو دفعہ کے انکار کے انہوں نے زور دے کر دو عورتوں کو ممبر مقرر کروایا ہے اور پھر یہ کہہ کر نامزد کروایا ہے کہ ان دو میں سے ایک ہندو اور ایک مسلمان ہو۔ مسلمان نمائندہ خاتون ہمارے ایک معزّز ہم وطن کی بیٹی ہیں اور میرے ایک معزز ہم وطن دوست کی بیوی ہیں اور ان کی ذاتی لیاقت پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پس میں امید کرتا ہوں کہ میری اس تحریر کو کسی رنگ میں بھی اس معزّز اور قابل احترام خاتون کے خلاف نہیں سمجھا جائے گا۔ مجھے اعتراض صرف سیکرٹری آف سٹیٹ کے اس رویہ پر ہے کہ باوجود حکومت ہند کے انکار کے انہوں نے زور دے کر عورتوں میں سے نمائندے مقرر کروائے ہیں اور اس طرح ایک قوم کے اندرونی دستور العمل میں ناجائز دست اندازی کی ہے۔

اب میں سائمن کمیشن کی جو رائے عورتوں کے پردہ کے بارہ میں ہے اس کی تغلیط کرتا ہوں۔ اول تو سائمن کمیشن نے یہ عجیب استدلال کیا ہے کہ عورتوں کی تعداد جو مردوں سے کم ہے اس کا ایک سبب پردہ ہے اس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور وہ مرجاتی ہیں۔ لیکن وہ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ انگلستان میں مردوں اور عورتوں کی نسبت میں فرق ہندوستان سے زیادہ ہے صرف اختلاف یہ ہے کہ وہاں مرد کم اور عورتیں زیادہ ہیں۔ اور ہندوستان میں عورتیں کم اور مرد زیادہ ہیں۔ کیا انگلستان کی نسبت بھی کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وہاں مردوں پر کوئی خاص ظلم ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ مرجاتے ہیں اور عورتیں زندہ رہتی ہیں؟ اگر سائمن کمیشن مختلف ممالک کی آبادیوں کا مقابلہ کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ عورت و مرد کی آبادی کے فرق کے اصول بالکل اور ہیں اور اکثر وجوہ نہایت باریک طبعی مسائل پر مبنی ہیں جن کی سائمن کمیشن کو کوئی واقفیت نہیں تھی۔ سائمن کمیشن کے ممبروں کے دلچسپ **معائنے** کے لئے میں انہیں بتاتا ہوں کہ آئرلینڈ کے شمالی حصہ میں یعنی السٹر کی حکومت میں چار فیصدی عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن جنوبی حصہ یعنی آئرش فری سٹیٹ (IRISH FREE STATE) میں قریباً دو فیصدی مرد زیادہ ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شمالی حصہ میں تو مردوں پر ظلم ہوتا ہے اور جنوبی حصہ میں عورتوں پر؟ لیکن اس فرق کا حل یہ نہیں ہوگا بلکہ یہ ہوگا کہ بعض باریک طبعی اسباب کی وجہ سے انگریزی قوم میں عورتوں کی زیادتی ہوتی ہے اس وجہ سے شمالی آئرلینڈ میں جس میں انگریزی نسل کے لوگ زیادہ بستے ہیں عورتیں زیادہ ہیں اور جنوبی آئرلینڈ میں جس میں آئرش نسل کی زیادتی ہے اس میں مرد زیادہ ہیں۔

سائمن کمیشن نے اپنے اندازہ میں ایک اور بھی غلطی کی ہے اور وہ یہ کہ اس نے غور نہیں کیا کہ عورتوں کی کمی سب سے زیادہ سکھوں اور پہاڑی نسلوں میں ہے اور یہ دونوں قومیں پردہ کی سخت مخالف ہیں اور سکھوں میں بچپن کی شادی کا رواج بھی دوسری قوموں سے کم ہے۔ سکھ عورت نہایت مضبوط ہوتی ہے۔ باوجود اس کے سکھوں میں عورتیں کم ہیں اور مرد زیادہ ہیں۔ پہاڑی قوموں میں عورتوں کی کمی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اب تک ایک عورت کے تین تین چار چار خاوند ہوتے ہیں اور سکھ قوم میں بوجہ رشتہ نہ ملنے کے دوسری قوموں کی عورتوں کو سکھ بنا کر ان سے شادیاں کرتے ہیں۔

پھر اگر سائمن کمیشن واقعات پر نگاہ ڈالتا تو اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ پردہ کا رواج دس فیصدی سے زیادہ لوگوں میں نہیں ہے۔ دیہات کی عورتوں میں سے ننانوے فیصدی پردہ کے عام مفہوم کے مطابق پردہ نہیں کرتیں۔ پس اگر عورتوں کی کمی کا فرق پردہ کی وجہ سے ہے تو اس فرق کو دیکھ کر جو مردوں اور عورتوں کی نسبت میں ہے فرض کر لینا چاہئے کہ پردہ دار حصہ جو صرف دس فیصدی ہے اس میں دو مردوں کے مقابلہ میں ایک عورت ہے جو بالبداہت غلط ہے۔ بچپن کی شادی جس سے میری مراد کسی خاص عمر سے نہیں ہے بلکہ قویٰ کے نشوونما پانے سے پہلے کی عمر کی شادی ہے بے شک نقصان دہ ہے لیکن مسلمانوں میں اس کا بہت کم رواج ہے اور سائمن کمیشن کا یہ کہنا کہ مسلمانوں میں اس کے متعلق ایک روایت ہے بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مسلمانوں میں بچپن میں شادی کر دینے کے متعلق کوئی روایت نہیں ہے۔ اور اگر شاردا ایکٹ کے خلاف مسلمانوں نے کوئی شور مچایا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ بچپن کی شادی کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اس امر کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی غیر مذہب کی اکثریت ان کے پرسنل لاء میں دخل اندازی کرے اور اس طرح آئندہ کے لئے راستہ کھل جائے۔ یہ عیب ہندوؤں میں ہی ہے اور انہی کو اس کا نقصان بھی پہنچتا ہے کیونکہ ان کے ہاں بیوہ کی شادی کا رواج نہیں۔ اور اس وجہ سے جو عورت بیوہ ہو جاتی ہے اس کی عمر برباد ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں جس قدر یہ رواج ہے بوجہ ہندوؤں کے اثر کے ہے اور ہم لوگ اسے آہستگی سے دور کر رہے ہیں۔

اب میں پردہ کے صحت اور تعلیم پر اثر کو لیتا ہوں۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ پردہ مسلمانوں میں ابتداء سے ہے۔ لیکن باوجود اس کے مسلمان عورتیں حکومتوں کے ہر قسم کے کاموں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ عورتیں مسلمانوں میں بادشاہ بھی ہوئی ہیں، فوجوں میں بھی انہوں نے کام کیا ہے، قضاء وغیرہ کے عہدہ پر بھی انہیں مقرر کیا گیا ہے، پروفیسر بھی وہ رہی ہیں اور ان پردہ دار عورتوں کو اُس زمانہ میں یہ طاقت اور علم کے کام کرنے پڑے ہیں جس وقت باقی اقوام کی بے پردہ عورتیں صحت اور علم دونوں میں ان کے مقابلہ سے عاجز تھیں۔ پس معلوم ہوا کہ پردہ نہیں بلکہ مسلمان عورتوں کی کمزوری اور جہالت کے اِس وقت اور اسباب ہیں۔

میں حیران ہوں کہ کس طرح پردہ کو تعلیم کے لئے روک کہا جاتا ہے۔ ہماری جماعت

خدا تعالیٰ کے فضل سے اسلامی پردہ کی بھی عامل ہے اور باوجود اس کے عورتوں کی تعلیم اس میں باقی سب ہندوستان کی عورتوں سے زیادہ ہے۔ میں نے جماعت کی امامت پر مقرر ہوتے ہی عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی ہے اور باوجود ہر قسم کے اعتراضات کے اس کو ترقی دیتا چلا گیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب خدا تعالیٰ کے فضل سے قادیان میں نوے فیصدی سے بھی زیادہ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ اور پچھلے تین سال سے یونیورسٹی کے امتحانوں میں ہماری عورتیں شامل ہونے لگی ہیں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے ہر سال ہماری جماعت کی کوئی نہ کوئی پردہ دار خاتون یونیورسٹی میں اول نمبر پر رہتی چلی آتی ہے۔ ہاں جو روک ہمارے راستہ میں ہے وہ پردہ کی نہیں بلکہ یہ ہے کہ اُستانیاں تیار ہونے میں دیر لگی ہے اور گورنمنٹ اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ مرد استاد پس پردہ عورتوں کو پڑھائیں۔ پس جب تک عورت اُستانیاں تیار نہ ہو جائیں ہمارے سکول یونیورسٹی سے باقاعدہ طور پر ملحق نہیں ہو سکتے۔ پس ہمارے تجربہ میں تو عورتوں کی تعلیم میں روک پردہ نہیں بلکہ گورنمنٹ کا رویہ ہے۔ جو یہ دیکھتے ہوئے کہ اُستانیاں نہیں مل سکتیں سوسائٹیوں کو اجازت نہیں دیتی کہ اس وقت تک کہ عورت اُستانیاں کافی تعداد میں میسّر آسکیں عمر رسیدہ اور قابلِ اعتبار مردوں سے لڑکیوں کو تعلیم دلوائیں۔

غالباً میری یہ تحریر سر جان سائمن (SIR JOHN SIMON) کی نظر سے بھی گزرے گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اسے ذاتیات پر مبنی نہیں سمجھیں گے بلکہ انہیں یہ امر یاد ہو گا کہ ان کے اور ان کے رفقاء کے ہندوستان کے ورود کے موقع پر سب سے زیادہ جوش کے ساتھ میری جماعت نے انہیں خوش آمدید کہا تھا اور ان کے بائیکاٹ کے خلاف نہایت زبردست پروپیگنڈا اشتہاروں، ٹریکٹوں، اخباروں اور لیکچروں کے ذریعہ سے کیا تھا۔ پس مجھے جو اس امر کے خلاف پروٹسٹ (PROTEST) کرنا پڑا تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ میرے نزدیک انہوں نے بغیر کافی تحقیق کے ایک اسلامی حکم پر حملہ کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ پردہ اسلام کا ایک حکم ہے۔ یوروپین اثر کے ماتحت بعض مسلمان اس کا انکار کریں یا اس پر عمل چھوڑ دیں تو یہ اور بات ہے مگر بہرحال اس کے اسلامی حکم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ خود رسول کریم ﷺ کی بیویاں پردہ کرتی تھیں اور اس وقت بھی کرتی تھیں جب کہ اسلام کی حکومت اپنے عروج پر تھی اور کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ اور ہمارا یہ یقین ہے کہ آخر اس بُرے طور پر استعمال کئے جانے والے اور غلط طور پر سمجھے جانے والے حکم کا

دن بھی اسی طرح آجائے گا جس طرح کہ طلاق، شراب اور عورت کے مالی حقوق کا دن آگیا ہے۔ پس ایسی تدابیر جن کا اصل مقصد مسلمانوں کو مجبور کر کے ان کے مذہبی احکام کا چُھڑوانا ہو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو منظور نہیں ہو سکتیں۔ یہ ہماری عورتوں کا کام ہے کہ وہ اپنے حق کا مطالبہ کریں اور اسلامی اصول کے ماتحت اسے استعمال کریں۔ کسی دوسری قوم یا دوسری حکومت کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں مجبور کر کے اپنے منشاء کے مطابق ہماری قوم کو چلائے۔ پس اگر عورتوں کو فرنچائز (FRANCHISE) میں شامل کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ جو قوم اس پر عمل نہ کر سکے اس کے ووٹر کم رہ جائیں تو میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی طرف سے کمیشن کو کہہ سکتا ہوں کہ اس امر کو مسلمانوں کے مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی تسلیم نہیں کریں گی۔

میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو عورتوں کی ترقی کے مخالف ہیں بلکہ میں مذہباً انہیں ویسا ہی روحانی، علمی اور اخلاقی ترقی کا حق دار سمجھتا ہوں جیسا کہ مردوں کو۔ اور میں نے جس طرح اپنے زمانۂ خلافت میں اپنی جماعت میں عورتوں کی تعلیم پر خاص زور دیا ہے اور اس کا انتظام کیا ہے اسی طرح میں نے ان کو آرگنائز (ORGANIZE) بھی کیا ہے۔ ان کی انجمنیں قائم کی ہیں اور قومی معاملات میں ان کو رائے دینے کا حق دیا ہے۔ پس یہ رائے کسی تعصّب اور قدامت پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک مخلصانہ مشورہ ہے جسے نظر انداز کرنے کی وجہ سے برطانیہ ہندوستان میں ایسی فضاء پیدا کرنے کا مرتکب ہو گا کہ جو نہ اس کے لئے اور نہ ہندوستان کے لئے برکت کا موجب ہو گی۔ مسلمان عورت اُس وقت سے اپنے حقوق کی مالک ہے جس وقت کہ دنیا عورت کو روح سے خالی سمجھتی تھی۔ اور صرف دوسری اقوام کے اثر سے وہ اپنے کئی حقوق سے محروم ہے۔ اِنْشَاءَ اللّٰہُ وہ اپنے ہی بھائیوں اور باپوں کی مدد سے اپنے کھوئے ہوئے حق کو واپس لے لے گی۔ مگر اسی راہ سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تجویز کیا ہے، جو نہ مرد ہے نہ عورت کہ اس پر ناجائز طرف داری کا الزام لگ سکے۔

(۳) سیکنڈ چیمبرس

مَیں شروع سے سیکنڈ چیمبرس (SECOND CHAMBERS) کا مخالف رہا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں اس کی خوبیوں کا قائل نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارمز سکیم میں جو سیکنڈ چیمبر کا ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا

وہ میرے نزدیک فتنہ پیدا کرنے والا تھا اور سیکنڈ چیمبرس کی جو غرض ہے اس سے پوری نہ ہوتی تھی اسی وجہ سے میں مرکزی سیکنڈ چیمبر اور صوبہ جاتی سیکنڈ چیمبر دونوں کا مخالف رہا ہوں لیکن اب جب کہ دوبارہ غور ہو رہا ہے اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہندوستانیوں کو موقع دیا گیا ہے کہ وہ اصول پر مبنی اور معقول ڈھانچہ اپنی حکومت کیلئے تیار کریں میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں دوبارہ اس سارے سوال پر غور کرنا چاہئے۔ چنانچہ غور کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ جو شکل موجودہ کونسل آف سٹیٹ کی ہے وہ درست نہیں۔ ایک تو اس میں نامزد شدہ عنصر بہت زیادہ ہے اور پھر نامزدگی بھی کسی مقررہ اصول پر نہیں ہے۔ دوسرے جو شرائط اس کی ممبری کے لئے مقرر ہیں وہ ایسی نہیں کہ ضرور لائق آدمی اس کے اندر آئیں۔ تیسرے فیڈریشن کا اصول اس میں مدّنظر نہیں رکھا گیا۔ پس ان حالات میں تو نہ کونسل آف سٹیٹ کی ضرورت ہے اور نہ کسی صوبہ میں اس قسم کی کونسل کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی کونسل کی موجودہ شکل کو ہم نظرانداز کر دیں تو ہمیں اصولاً دیکھنا چاہئے کہ مجلس واضع قانون کے بعد ہمیں کسی اور مجلس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کیوں؟

جن لوگوں نے دوسری چیمبرس کی مخالفت کی ہے ان کا سردار ABBE SEIVES ایک فرانسیسی قانون دان ہے۔ اس کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دوسری چیمبر پہلی کے مطابق فیصلہ کرے گی تو وہ غیر ضروری چیز ہے۔ اور اگر پہلی کے مخالف کرے گی تو وہ نقصان دہ ہے لیکن باوجود اس کے اکثر حکومتوں میں دو ہی مجالس مقرر ہیں۔ اور صرف بلقان روس سے علیحدہ ہونے والی ریاستوں اور ترکی کے علاقہ میں ایک مجلس وضع قوانین کا کام کرتی ہے۔ پس مختلف الفوائد اور مختلف الاغراض اقوام کا تجربہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اس امر پر سنجیدگی سے غور کریں کہ کیا دوسری مجالس مفید ہیں یا نہیں؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ جو لوگ دوسری چیمبر کے مؤیّد ہیں وہ اس کے مندرجہ ذیل کام بتاتے ہیں:۔

(۱) ایک مجلس چونکہ قانون کا مسودہ بناتی ہے اس وجہ سے اس جوش کی حالت میں جو مختلف فریقوں میں پیدا ہو جاتا ہے کئی سُقم اس میں رہ جاتے ہیں۔ پس ان نقائص کو دور کرنے کے لئے ایک دوسری مجلس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مجلس کے پاس چونکہ کافی غور کے بعد پاس شدہ قانون جاتا ہے وہ اس کے باریک نقائص کو معلوم کرنے پر زیادہ قادر

ہوتی ہے۔ پس دوسری چیمبر کا ہونا ضروری ہے۔

(۲) چونکہ مجلس عام کے ممبر زیادہ ہوتے ہیں وہ اس قدر وقت بحث پر خرچ نہیں کر سکتے جس قدر کہ تھوڑی جماعت آزادی سے وقت خرچ کر سکتی ہے۔ پس پالیسی اور اصول کی بحثیں زیادہ تر دوسری مجلس میں ہی کی جاسکتی ہیں۔

(۳) بعض تجربہ کار اور بوڑھے آدمی بوجہ اپنی خاص حیثیت یا اپنے مزاج یا اپنی صحت کے اس فضاء یا اس طریق کار کی برداشت نہیں کر سکتے جو مجلسِ عام میں اس کی ساخت کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے دوسری مجلس میں ان لوگوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

(۴) بوجہ قانون کی ابتدائی تشکیل کے مجلس عام میں جنبہ داری کے جذبات میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے قانون بناتے وقت ہر قسم اور ہر طبقہ کے فوائد کو مدنظر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس فضاء سے محفوظ رہنے والی دوسری چیمبر میں اس نقص کا ازالہ ہو جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے ہر قسم کے فوائد پر نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔

(۵) ماہرینِ فنون اگر عام مجلس میں شامل ہوں تو ان کے مشورہ کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سینکڑوں میں سے ایک ہوتے ہیں لیکن دوسری چیمبر چونکہ تھوڑے آدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے اس میں ان کا ووٹ زیادہ وزن رکھتا ہے اور اس طرح ملک ان کے تجربہ سے زائد فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ چار سو ممبر والی مجلس میں ایک شخص کے ووٹ کی قیمت ۱/۴۰۰ ہوگی۔ لیکن وہی شخص اگر اس پہلی مجلس کی نظر ثانی کرنے والی کمیٹی میں جس کے پچاس ممبر ہوں شامل ہو جائے گا تو اس کے ووٹ کی قیمت ۸/۴۰۰ ہو جائے گی۔ پس ایسی مجلس میں ماہرین فن کا شامل ہونا ملک کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے جہاں وہ مجلس واضع قوانین کے ممبر بھی سمجھے جاتے ہیں اور ان کی رائے کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

(۶) اگر ایک مجلس ہو تو الیکشن کے وقت حکومت ملک کے نمائندوں سے بالکل خالی ہو جاتی ہے لیکن دو مجالس ہوں تو ہر وقت ایک نہ ایک مجلس ملک کی نمائندہ موجود رہتی ہے کیونکہ دونوں کا الیکشن الگ الگ وقتوں پر رکھا جا سکتا ہے اور عملاً بھی مختلف ممالک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

(۷) اگر ایک ہی مجلس ہو تو چونکہ ملک کی رائے کا جلدی جلدی اندازہ لگانے کے لئے اسے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد برخاست کرنا پڑتا ہے۔ بعض تجربہ کار لوگ جن کے شامل کرنے کی بڑی غرض ان کی لیاقت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہوتا ہے لیکن ان کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہوتی وہ بار بار کے خرچ سے ڈر کر اس میں حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن دو مجالس ہوں تو دوسری چیمبر کی عمر کو لمبا کر کے ایسے لوگوں کے لئے خدمت کا موقع پیدا کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں دوسری مجلس کی عمر کو لمبا کر کے یہ فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ ایک تجربہ کار جماعت دیر تک حکومت کے کام میں مُمِدّ رہتی ہے۔

(۸) ملک کی مختلف ضرورتیں ہوتی ہیں جن میں سے بعض بعض کے ساتھ مشترک نہیں ہو سکتیں۔ پس اگر ایک ہی جماعت ہو تو بعض فوائد ملک کے نظر انداز کرنے پڑتے ہیں۔ پس دو چیمبرس کا ہونا ضروری ہے کہ تا ایک مجلس کو ایک قسم کا کام سپرد کر دیا جائے اور دوسری کو دوسرا۔ جرمن ریچس ریٹ (REICHSRAT) یعنی دوسری مجلس کی یہی غرض رکھی گئی ہے کہ وہ وضعِ قانون میں حصہ نہیں لیتی بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ وہ مسودات کو مجلس عام میں پیش ہونے سے پہلے دیکھ کر رائے دے کہ آیا وہ پیش کئے جائیں یا نہیں وہ مجلس عام یعنی ریچس ٹیگ (REICHSTAG) کے بنائے ہوئے قانون کو ردّ بھی نہیں کر سکتی بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اس کے پاس شدہ مسودہ کو دیکھے اور اگر قابلِ اعتراض پائے تو دو ہفتہ کے اندر گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دے۔ اگر مجلس عام سے اس کا سمجھوتہ ہو جائے تو خیر ورنہ پریذیڈنٹ اس مسودہ کے متعلق ملک کی رائے عامہ حاصل کر لے۔ لیکن اگر پریذیڈنٹ تین ماہ کے اندر ایسا نہ کرے اور مجلس عام دو تہائی کثرت کے ساتھ اس بل کو دوبارہ پاس کر دے تو پھر پریذیڈنٹ کا فرض ہے کہ یا تو اسی قانون کو منظور کرے یا ملک کی رائے حاصل کرے۔ یہ کام جو جرمن دوسری چیمبر (SECOND CHAMBER) کے سپرد ہے نہایت ضروری ہے لیکن باوجود اس کے قانون ساز مجلس کے سپرد کسی صورت میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہی مجلس جو قانون بناتی ہے اپنے کام کی نگرانی نہیں کر سکتی۔

(۹) ایک فائدہ دوسری مجالس میں یہ ہوتا ہے کہ بعض ملکوں میں حکومت کے دونوں حصے یعنی قانون ساز اور قانون کا اجراء کرنے والے الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ یعنی وزراء نہ

منتخب ممبر ہوتے ہیں اور نہ مجلس قانون ساز کو ان پر کوئی تصرف حاصل ہوتا ہے پس دوسری مجلس دونوں حصوں میں تعلق قائم رکھنے کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ امریکن SENATE کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ایک طرف تو مجلس عام کے پاس شدہ قوانین کی نظر ثانی کرتی ہے دوسری طرف پریزیڈنٹ کو جو حکومت کے محکمہ تنفیذ کا رئیس ہے اس کے کام میں مشورہ دیتی ہے یعنی معاہدات کی منظوری کے متعلق، سفیروں اور ججوں کے مقرر کرنے کے متعلق اور بعض ایسے ہی اور کاموں کے متعلق۔

(۱۰) دسواں فائدہ دوسری چیمبر کا جو فیڈرل حکومتوں میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ دوسری چیمبر فیڈرل حکومت کے صوبوں یا ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور مجلس عام کو جو افراد کی نمائندہ ہوتی ہے ریاستوں کے حقوق تلف نہیں کرنے دیتی۔ اس وجہ سے فیڈرل حکومتوں میں عام طور پر دوسری مجلس کا انتخاب ایسے اصول پر رکھا جاتا ہے کہ وہ افراد کی بجائے علاقوں کی نمائندہ ہوں تاکہ علاقوں کی آزادی کا خیال رکھ سکیں۔

یہ دس موٹے موٹے فائدے سیکنڈ چیمبر (SECOND CHAMBER) کے ہیں۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ بعض تو صرف خاص شکل کی دوسری مجلس میں پائے جاسکتے ہیں اور بعض ہر دوسری مجلس میں جمع ہو سکتے ہیں۔ ان فوائد کو مجموعی حیثیت سے دیکھنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ دوسری چیمبر کا وجود بھی بغیر مقصد کے نہیں ہے۔ اور اس کے مخالفین کا اعتراض کہ اگر وہ مجلس عام کے موافق ہے تو غیر ضروری ہے اور اگر مخالف ہے تو موجب تباہی ہے محض ایک ظاہر فریب دلیل ہے۔ دوسری چیمبر نہ پہلی کے موافق ہے نہ مخالف بلکہ وہ اس کا تتمہ ہے اور اس وجہ سے نہ زائد ہے نہ کام کو خراب کرنے والی۔

مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم میں دوسری چیمبر کے خلاف تین اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے کام پیچیدہ ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس قدر لائق آدمی نہ مل سکیں گے کہ دو چیمبرس کا کام چلایا جاسکے۔ تیسرے یہ کہ خاص فوائد والوں کو غیر ضروری حفاظت حاصل ہو جائے گی۔ مگر یہ تینوں اعتراض درست نہیں۔ پیچیدگی اس میں کوئی ہے نہیں۔ سب دنیا میں دوسری چیمبرس کام کر رہی ہے۔ آدمیوں کا سوال عارضی ہے۔ اگر دوسری مجلس کی ضرورت ثابت ہو تو اس کا اجراء دس پندرہ سال بعد کیا جاسکتا ہے۔ اور تیسرا اعتراض بھی درست نہیں

کیونکہ دوسری مجالس کی شکلیں کئی قسم کی ہیں۔ ایسے قوانین بنائے جاسکتے ہیں جن سے اس امر کی حفاظت ہو جائے کہ جو کام ہم ان مجالس سے لینا چاہتے ہیں وہ بھی لئے جاسکیں اور بلاوجہ کسی کا حق بھی نہ مارا جائے۔ پس ان سب حالات کو مد نظر رکھ کر میرا خیال یہ ہے کہ مرکزی حکومت میں فوراً سیکنڈ چیمبر جاری کی جائے مگر وہ کسی اصول کے ماتحت ہو۔ یہ نہ ہو کہ بجائے پہلی اور دوسری مجلس کے دو مجالس عام قائم ہو جائیں اور یونہی وقت اور روپیہ ضائع ہو۔

صوبہ جات کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ ابھی چونکہ نیابتی حکومت سے ہندوستان پورا واقف نہیں اس لئے قانون اساسی میں تو اس کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے لیکن شرط یہ کر دی جائے کہ پندرہ سال کے بعد ہر مقامی کونسل کو اختیار ہو گا کہ وہ اپنی کثرت رائے سے دوسری مجلس کے قیام کا فیصلہ کر دے۔ لیکن قواعد دوسری چیمبر کے یا کم سے کم اس کے لئے اصول ابھی سے مقرر کر دیئے جائیں۔

دوسری مجلس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اس کی ضرورت بہت اہم ہے اسے فوراً قائم کر دینا چاہئے مگر اس شکل میں نہیں جس میں مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم نے اسے قائم کیا ہے بلکہ اس کی اصل صورت جس کا بیان میں اِنْشَاءَ اللّٰہُ مرکزی حکومت کے ذکر میں کروں گا۔

باب چہارم

عدالت

سائمن کمیشن کی رپورٹ کے کمزور ترین مقامات میں سے اس کی وہ سفارش ہے جو اس نے ہائی کورٹوں کو گورنمنٹ آف انڈیا کے ماتحت کرنے کے متعلق کی ہے اس کی ساری دلیل یہ ہے کہ بنگال کا ہائی کورٹ چونکہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ماتحت ہے اور باقی سب ہائی کورٹ انتظامی لحاظ سے صوبہ جات کی حکومتوں کے ماتحت ہیں اس لئے سب ہائی کورٹوں کو ایک انتظام میں لانے کیلئے ضروری ہے کہ وہ سب گورنمنٹ آف انڈیا کے ماتحت کر دیئے جائیں۔ حالانکہ ایک کورٹ کی خاطر باقی سب ہائی کورٹوں کا انتظام تبدیل کرنا بالکل خلاف عقل ہے اگر وہ یہ سفارش کرتے کہ بنگال ہائی کورٹ بھی گورنمنٹ بنگال کے ماتحت کر دیا جائے تو یہ زیادہ مناسب مشورہ ہوتا۔ کمیشن کی دلیل صرف یہ ہے کہ بنگال ہائی کورٹ کے ساتھ چونکہ آسام کی عدالتیں بھی ملحق ہیں اس وجہ سے ضروری ہے کہ حکومت ہند کے ماتحت وہ ہائی کورٹ ہو اور چونکہ آئندہ اور صوبہ جات کے بننے کا بھی احتمال ہے جو کہ ممکن ہے کہ الگ ہائی کورٹ کا خرچ برداشت نہ کر سکیں اس لئے ضروری ہے کہ اختلافِ انتظام سے بچنے کیلئے سب کورٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس آ جائیں۔ یہ دلیلیں اپنی ذات میں بہت کمزور ہیں۔ آسام کی عدالتیں اگر بنگال کے ساتھ ملحق ہیں تو اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آسام کو کچھ رقم خرچ کیلئے بنگال کے حوالے کرنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ جس کی وجہ سے بنگال ہائی کورٹ کو گورنمنٹ آف انڈیا کے ساتھ ملایا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ بنگال ہائی کورٹ کی گورنمنٹ آف انڈیا کے ماتحت ہونیکی یہ وجہ ہی نہیں۔ یہ تو اس وقت سے چلا آتا ہے جب کہ گورنر جنرل براہ راست بنگال کا حاکم سمجھا جاتا تھا پس اس رسم دیرینہ کے بدلنے کی بجائے جس میں کوئی معقولیت نہیں، باقی ہائی کورٹوں کو کیوں خراب کیا جائے۔ مختلف آزاد ممالک اگر

آپس میں ڈاک کے اخراجات اور آمد کو تقسیم کر سکتے ہیں تو کیا ایک ملک کے دو صوبے ہائی کورٹوں کے اخراجات کی تقسیم نہیں کر سکتے؟

لیکن میں اس امر کو بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ کوئی صوبہ ہائی کورٹ کے اخراجات برداشت نہ کر سکتا ہو۔ یورپ اور امریکہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اگر یہ سب خرچ برداشت کر سکتی ہیں تو کیوں ہندوستان کے صوبے یہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ صوبہ جاتی ہائیکورٹ درحقیقت صوبہ کی حکومت کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور کسی صحیح فیڈرل حکومت کے ماتحت نہیں ہوتے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صوبہ جات کے ہائی کورٹوں کے سپرد عدالت کا انتظامی کام بھی ہوتا ہے اور سب ماتحت عدالتیں انتظامی طور پر ان سے تعلق رکھتی ہیں تو یہ انتظام اور بھی ناقص معلوم ہوتا ہے جب کہ صوبہ کی تمام عدالتیں صوبہ سے تنخواہیں پائیں گی' صوبہ ہی انہیں مقرر کرے گا' اسی کے ماتحت وہ سمجھی جائیں گی تو پھر ہائی کورٹ صوبہ کی طرف سے ان کی نگرانی کرے گا پھر وہ کس طرح کسی دوسری حکومت کا حصہ ہو سکتا ہے۔

اس کے جواب میں شاید کہا جائے کہ آسام کی مثال موجود ہے کہ وہاں ہائیکورٹ کسی اور کے ماتحت ہے اور ماتحت عدالتیں کسی اور کے ماتحت۔ لیکن میرا جواب یہ ہے کہ ایک چیز مجبوری سے کی جاتی ہے اور ایک خوشی سے۔ ان دونوں حالتوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر آسام کے لئے ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم سب جگہ جہاں ضرورت نہیں یہی انتظام کر دیں۔ فیڈریشن کی تکمیل میں ہائی کورٹوں کا صوبہ سے متعلق ہونا شرط ہے۔ پس ہائی کورٹ کسی صورت میں صوبوں کے اختیار سے باہر نہیں جانے چاہئیں بلکہ آئندہ یہ تغیر ہونا چاہئے کہ ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر بھی صوبہ کی طرف سے ہو۔

ہاں ایک بات کی میں تصدیق کروں گا کہ چونکہ عدالتوں کا وقتی اور سیاسی اثرات سے بالا ہونا ضروری ہے اس لئے ججوں کے متعلق یہ قاعدہ باقی رہے کہ جب کوئی شخص ایک دفعہ ہائی کورٹ کا جج مقرر ہو جائے تو اسے اس وقت تک کہ وہ قواعد کے مطابق ریٹائر نہ ہو یا قبل از وقت اپنی مرضی سے استعفاء نہ دے' الگ نہ کیا جائے سوائے اس کے کہ اس کے خلاف رشوت وغیرہ کے الزامات یقینی طور پر ثابت ہو جائیں۔ اس صورت میں لیجسلیٹو کونسل (LEGISLATIVE COUNCIL) کی ساٹھ فیصدی کثرت کے ریزولیوشن کے بعد گورنر جج کو

علیحدہ کردے۔

ججوں کے تقرر کے متعلق بھی ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے کیونکہ ملک کی عدالت پر حکومت کے اچھے یا برے ہونے کا بہت حد تک انحصار ہوتا ہے۔ اس لئے میری رائے تو یہی ہے کہ بہتر ہوگا کہ ججوں کے تقرر میں وزارت کا دخل بالکل نہ ہو بلکہ گورنر ہائی کورٹ سے مشورہ لے کر جج مقرر کیا کرے۔ اس کا طریق میرے نزدیک یہ ہونا چاہئے کہ جب کسی نئے جج کے مقرر کرنے کی ضرورت ہو تو گورنر ہائی کورٹ سے ہر آسامی کے لئے تین تین آدمیوں کا پینل طلب کرے۔ ہائی کورٹ اپنی کثرت رائے سے فی آسامی تین تین آدمی کے نام تجویز کر کے رپورٹ کرے اور گورنر ان میں سے جس کو پسند کرے کام پر مقرر کردے۔ گورنر کو یہ بھی اختیار ہو کہ اگر اس کے نزدیک کسی قوم کو ہائی کورٹ میں اس کے حق سے کم نمائندگی حاصل ہو تو وہ سفارشات طلب کرتے ہوئے ہائی کورٹ کو ہدایت دے کہ وہ اس دفعہ صرف فلاں جماعت کے افراد کے نام تجویز کرے۔ مزید شرط یہ بھی ہو کہ اگر کسی جج کو یہ خیال ہو کہ فلاں شخص خاص طور پر قابل ہے اور اس کا نام پیش نہیں کیا گیا تو وہ اختلافی نوٹ کی شکل میں اپنی رائے گورنر کے پاس بھجوا دے جسے اختیار ہو کہ استثنائی صورتوں میں ان رپورٹوں کو بھی انتخاب میں مدنظر رکھ لے۔

اسی طرح ایک اصلاح میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ایک وزارتِ عدالت قائم کی جائے اور عدالتوں کا تمام انتظامی کام اس کی وساطت سے ہو تاکہ ایگزیکٹو اور عدالت میں اختلاف نہ ہو۔ دوسرے بہت سے ممالک میں ایک عدالت کا وزیر ہوتا ہے چنانچہ انگلستان میں بھی لارڈ چانسلر کے نام سے ایک وزیر ہوتا ہے۔ جس کا کام عدالتی محکمہ کا انتظام ہے۔ وہ کونٹی کورٹ جج (COUNTY COURT JUDGE) نہ صرف مقرر کرتا ہے بلکہ انہیں ڈسمس (DISMIS) بھی کر سکتا ہے۔ ہائی کورٹ کے جج بھی اس کی سفارش پر مقرر ہوتے ہیں۔ [۶۲]

سپریم کورٹ

ہائی کورٹوں کو صوبہ جاتی کورٹ بنانے کے بعد علاوہ اس کانسٹی چیوشنل (CONSTITUTIONAL) سوال کے جس کا میں پہلے ذکر کر آیا ہوں، دوسری ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی ضروری ہے کہ ایک سپریم کورٹ ہندوستان میں بنایا جائے جو فیڈرل کورٹ ہو۔ علاوہ قانون اساسی کے متعلق اختلافوں کا فیصلہ کرنے کے اس

کورٹ کا یہ بھی کام ہو کہ وہ خاص طور پر بڑے مقدمات میں پریوی کونسل کی جگہ پر ہائی کورٹوں کی اپیلیں سنے۔ اسی طرح اس کا کام فیڈرل قانونوں کے متعلق آخری اپیل سننا ہو۔ ایسے مقدمات کی ابتداء کی کارروائی صوبہ جاتی عدالتوں کے ہی سپرد رہے۔ امریکہ کی طرح ضروری نہیں کہ چھوٹی فیڈرل عدالتیں بھی قائم کی جائیں۔ یہ کام صوبہ جاتی عدالتوں کے سپرد رہے صرف اپیل سپریم کورٹ کے پاس آئے۔

چونکہ سپریم کورٹ کا کام قانون اساسی کی تشریح کرنا بھی ہوگا' اس لئے اس کے ججوں کے انتخاب کا سوال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ شاید میرے بہت سے دوست میری اس رائے کو ناپسند کریں گے لیکن میرے نزدیک کم سے کم ابتدائی زمانہ میں اس امر کی ضرورت ہے کہ اس عدالت کے ججوں کا ایک معتدبہ حصہ انگلستان سے مقرر ہو کر آئے۔ اس کورٹ کے ججوں کے متعلق اگر یہ شرط ہو کہ پہلے پندرہ سال تک لازماً دو تہائی جج پریوی کونسل (PRIVY COUNCIL) کی سفارش پر تاج کی طرف سے مقرر ہوں اور ایک تہائی ججوں کے تقرر کے لئے یہ قاعدہ ہو کہ پہلی دفعہ تو گورنر جنرل مختلف ہائی کورٹوں کے چیف ججوں سے مشورہ کر کے ایسے ججوں میں سے جو تین سے پانچ سال کے اندر ریٹائر ہونے والے ہوں سپریم کورٹ کا جج مقرر کر دیں اور آئندہ اس حصہ کی کمی جس کے لئے نامزدگی کا اختیار انہیں دیا گیا ہو وہ سپریم کورٹ سے پینل طلب کر کے جس میں ہر آسامی کے لئے کم سے کم تین آدمیوں کا نام پیش کیا گیا ہو' پوری کریں۔ اس طرح میرے نزدیک وہ سوال ایک معقول حد تک حل ہو جاتا ہے کہ وہ جج کہاں سے آئیں گے جن پر اعتبار کیا جا سکے۔ پریوی کونسل کے مقرر شدہ جج چونکہ غیر ملک سے آئیں گے اور ایسے لوگ انہیں مقرر کریں گے جن کا زیادہ تر تعلق عدالتوں سے ہوتا ہے اس لئے وہ لوگ جہاں تک میں سمجھتا ہوں' عام طور پر قابلِ اعتبار ہونگے۔ اسی طرح وہ ایک تہائی جج جو سپریم کورٹ کی سفارش سے لیکن گورنر جنرل کے انتخاب سے مقرر ہونگے ان پر بھی اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

کانسٹی ٹیوشن کے متعلق جو مقدمات اس کورٹ میں پیش ہوں گے وہ تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو حکومتوں کی طرف سے ہوں۔ یعنی صوبوں یا ریاستوں کی طرف سے (اگر ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہوں)۔ دوسرے مقدمات قومی یا مذہبی اقلیتوں کی طرف سے۔ تیسرے افراد یا مجموعہ افراد یعنی کمپنیوں ٹرسٹوں وغیرہ کی طرف سے۔ جو مقدمات کہ حکومتوں یا

قوموں کی طرف سے ہوں ان کے لئے شرط ہو کہ سات جج ان کا فیصلہ کریں۔ جن میں سے چار لازماً ان ججوں میں سے ہوں جنہیں پریوی کونسل کی سفارش پر تاج نے مقرر کیا ہو اور جو مقدمات افراد یا مجموعہ افراد کی طرف سے ہوں ان کے لئے تین جج کافی ہوں اور کوئی قید نہ ہو کہ وہ کس قسم کے ججوں میں سے ہوں۔

کانسٹی ٹیوشن میں یہ قانون بھی رکھ دیا جائے کہ اگر پندرہ سال کے بعد صوبہ جاتی کونسلوں میں سے اسّی فیصدی کونسلیں حقیقی اکثریت کے ساتھ یہ قانون پاس کر دیں کہ آئندہ سپریم کورٹ کے جج پریوی کونسل کی طرف سے مقرر نہ ہوں بلکہ کسی اور طریق سے جس پر وہ متفق ہوں، مقرر ہوں تو ان کے اس ریزولیشن کے مطابق عمل ہو۔

سپریم کورٹ کے پاس قانون اساسی کے متعلق کیس چلانے کا طریق

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ قانون اساسی کے متعلق مقدمات تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔ جو افراد یا مجموعہ افراد کی طرف سے ہوں۔ جو جماعتوں یا قوموں کی طرف سے ہوں۔ یا جو حکومتوں کی طرف سے ہوں۔ ان تینوں قسم کے مقدمات میں سے دو قسم کے یعنی افراد کی طرف سے یا جماعتوں کی طرف سے جو مقدمات ہوں وہ پھر دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ یعنی جو صوبہ جاتی قانون اساسی کے متعلق ہوں یا جو اتحادی قانون اساسی کے متعلق ہوں۔ ان میں سے جو تو صوبہ جاتی قانون اساسی کے متعلق ہوں، وہ صوبہ جاتی ہائی کورٹوں میں پیش ہوں۔ اور جو اتحادی قانون اساسی کے متعلق ہوں وہ سپریم کورٹ میں پیش ہوں۔

سیاسی حقوق کے مقدمات کس طرح سپریم کورٹ میں جائیں؟

سائمن کمیشن نے لکھا ہے کہ اگر کورٹ کے ذمے مختلف قوموں کے حقوق کے تصفیہ کا سوال رکھا گیا تو مقدمات بہت بڑھ جائیں گے۔ گو تجربہ کے بعد ہی ایسی باتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ لیکن کوئی حرج نہیں کہ اس کی روک کے لئے بھی کچھ قانون مقرر کر دیئے جائیں۔ میرا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل قیود سے اس میں روک تھام ہو سکتی ہے۔

(ا) جب جھگڑا صوبہ جاتی حکومتوں یا ریاستوں اور مرکزی حکومت کے درمیان ہو اور آپس میں سمجھوتہ نہ ہو سکے تب گورنر جنرل سے اپیل کی جائے جو دونوں فریق میں صلح کرانے

کی کوشش کرے۔ لیکن اگر صلح نہ ہو سکے تو پھر دونوں فریق کو اجازت ہو کہ سپریم کورٹ میں اپنے حق کا فیصلہ کرائیں۔

(۲) اگر صوبہ جاتی حکومتوں کا آپس میں یا کسی ریاست سے (اگر ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہوں) جھگڑا ہو تو پہلے گورنر جنرل ایک پنچایت کے ذریعہ سے جس میں ایک ایک نمائندہ فریقین کا ہو اور ایک گورنر جنرل کی طرف سے ہو فیصلہ کرنے کی کوشش کریں اگر اس طرح فیصلہ نہ ہو سکے تو پھر سپریم کورٹ میں جانے کی اجازت ہو۔

(۳) اگر کسی قوم یا مذہب کے افراد کو شکایت ہو کہ ان کے حقوق کو قانون اساسی کے خلاف نقصان پہنچایا گیا ہے تو اگر لیجسلیٹو کے خلاف انہیں شکایت ہو' تو وہ اس ایکٹ کے پاس ہونے کے دو ہفتہ کے اندر صوبہ کے گورنر کے پاس یا بصورت اتحادی اسمبلی کا معاملہ ہونے کے گورنر جنرل کے پاس اپیل کریں۔ اگر گورنر یا گورنر جنرل سمجھے کہ لیجسلیٹو (LEGISLATIVE) نے فی الواقعہ اس جماعت کے قانون اساسی کے بتائے ہوئے حقوق کو توڑا ہے تو وہ اس قانون کو کونسل یا اسمبلی جس کا بھی معاملہ ہو اس کے پاس دوبارہ غور کرنے کے لئے بھیج دے۔ اگر گورنر جنرل یا گورنر کی تسلی کے مطابق اصلاح ہو جائے تو وہ اس پر دستخط کرے' ورنہ وہ اس قانون کی تصدیق کو التواء میں ڈال دے جب تک کہ دوسری کونسل یا اسمبلی کا انتخاب ہو۔ اس وقت اگر وہ اسمبلی یا کونسل جیسی بھی صورت ہو اس قانون کو دوبارہ پاس کر دے تو گورنر جنرل یا گورنر جیسی بھی صورت ہو اس قانون پر دستخط کر دے۔ اس کے بعد اگر اس فریق کو جسے اپنے حق کے نقصان پہنچنے کا خیال ہے ضرورت محسوس ہو' تو وہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ جیسی بھی صورت ہو' اس میں جا کر اپیل کرے۔ اس طرح میرا خیال ہے کہ بہت سے قومی اور ملکی اختلافات سپریم کورٹ میں جانے سے پہلے ہی طے ہو جایا کریں گے۔

اب سوال افراد یا جماعتوں کا رہ جاتا ہے۔ سو ان کی شکایات عام طور پر مالی ہوں گی یا اصولی انسانی حقوق کے متعلق ہوں گی۔ مالی مقدمات تو بہرحال چلتے ہی رہتے ہیں۔ انہیں محدود نہیں کیا جا سکتا اور اصولی انسانی حقوق کے جو سوال ہیں' وہ کثرت سے نہیں ہو سکتے شاذ و نادر ہوں گے۔ سو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ ایک ایسا حق ہے کہ جس کے متعلق مقدمات علم میں کچھ اضافہ کریں گے اور بحیثیت مجموعی ملک کو کچھ فائدہ ہی ہو گا۔ پس ان کے راستہ میں

روک ڈالنے کی میرے نزدیک کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرے ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس قسم کے مقدمات بہت کم ہوتے ہیں۔

گو اوپر کے مضمون کا بیشتر حصہ سنٹرل (CENTRAL) معاملات سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ عدالتوں پر ایک ہی جگہ بحث ہو جائے' میں نے دونوں حصوں کو اکٹھا ہی بیان کر دیا ہے اور اب آئندہ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

باب پنجم

ملازمتیں

سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ کی جلد دو کے نویں باب میں ملازمتوں کے مستقبل پر بحث کی ہے۔ گو اس نے اس باب کو مستقل جگہ دی ہے لیکن میں جو خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں ان کی رو سے اس بحث کی جگہ صوبہ جاتی کونسلوں کے ماتحت ہی آتی ہے۔

لی (LEE) کمیشن کی رپورٹ پر تمام منتقل شدہ محکموں کی بھرتی صوبہ جات کے سپرد کر دی گئی تھی سوائے طبی محکمہ کے کہ اس کی بھرتی کا ایک حصہ آل انڈیا بھرتی کے اصول پر قائم رکھا گیا تھا کیونکہ یہ کہا گیا تھا کہ جب تک انگریز اس ملک میں کام کرتے ہیں' یہ ضروری ہے کہ ان کا علاج کرنے کے لئے انگریز ڈاکٹر بھی رہیں اور دوسرے یہ خیال کیا گیا تھا کہ جنگ کے دنوں میں طبی محکمہ پر بہت کچھ دارومدار ہوتا ہے اگر آئندہ کوئی جنگ ہو اور اس وقت کافی تعداد میں لائق ڈاکٹر نہ ملے تو جنگ کا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پس ہر صوبہ کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ کچھ تعداد فوجی ڈاکٹروں کی ضرور ملازم رکھے۔

لیکن محفوظ محکمہ جات کی بھرتی بدستور آل انڈیا بھرتی کے اصول پر رکھی گئی تھی۔ یعنی ان محکموں کی بھرتی اب تک وزیر ہند کی وساطت سے کی جاتی ہے اور صوبہ کے لئے ان کی تعداد گورنمنٹ آف انڈیا صوبہ جات کے مشورہ سے مقرر کرتی ہے اور اس تعیین میں وہ اپنی ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھتی ہے کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا کے محکموں کے لئے کوئی الگ بھرتی نہیں ہوتی۔

اس بھرتی کے طریق میں کئی فوائد سمجھے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس طرح ضرورت کے موقع پر ایک افسر کی خدمات بغیر اس کے حقوق وغیرہ کے جھگڑوں کے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کی طرف منتقل کی جا سکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ چھوٹے علاقوں کے لئے جو گورنروں کے

صوبوں کے علاوہ ہیں الگ ملازم نہیں رکھے جا سکتے کیونکہ بوجہ صوبہ کی غربت کے انہیں ترقی دے کر اوپر نہیں لے جایا جا سکتا۔ پس ایسے صوبوں میں ضرورت کے مطابق بڑے صوبوں سے آدمی لے لئے جاتے ہیں اور جب ان کی ترقی کا وقت آتا ہے تو انہیں بدل کر ان کی جگہ اور افسر منگوا لئے جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو اپنے دفتروں میں اکثر تجربہ کار افسروں کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر وہ اپنی الگ بھرتی کرے تو جب تک وہ اپنی ضرورت سے بہت زیادہ بھرتی نہ کرے اس وقت تک اس قدر تعداد اعلیٰ افسروں کی اسے نہیں مل سکتی جس قدر کہ اسے ضرورت ہوتی ہے۔ چوتھے اگر آل انڈیا بھرتی کے اصل پر ملازمتوں کا انتظام نہ ہو بلکہ صوبہ جات کی بھرتی الگ الگ ہو اور گورنمنٹ آف انڈیا کی الگ، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے افسروں کو صوبہ جات کی حالت کا کچھ علم نہ ہوگا اور وہ یگانگت جو مرکز اور صوبہ جات میں ہونی چاہئے' پیدا نہ ہو سکے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب ضرورتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں بہت اہم ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ باوجود ان ضرورتوں کے آل انڈیا بھرتی کو جاری رکھنا کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ درست ہے کہ آئندہ صوبہ جات کو آزادی دی جائے گی تو پھر یہ بھی لازمی ہے کہ تمام عہدوں کی بھرتی صوبہ جات کے ماتحت ہو۔ وہ آزادی کیسی جس میں عہدوں کی تعداد تک مقرر کر دی جائے۔ اس قسم کی اتحادی حکومت کو کوئی شخص اتحادی حکومت نہیں کہہ سکتا یہ تو کامل اتّصالی حکومت ہوگی۔

جو ضرورتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی تو آئندہ ضرورت ہی نہ رہے گی مثلاً صوبہ جات کی واقفیت کی آئندہ اس قدر ضرورت نہ رہے گی۔ کیونکہ مقامی ضرورتوں سے تعلق رکھنے والے امور مرکز سے علیحدہ کر کے پورے طور پر صوبہ جات کے اختیار میں آجائیں گے۔ مرکز سے صرف انہی امور کا تعلق رہ جائے گا جن کا مقامی ضرورتوں سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔ باقی رہے چھوٹے علاقے ان کے متعلق میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کا علیحدہ باقی رکھنا صوبہ جاتی آزادی کے راستہ میں روک ہوگا۔ چنانچہ زیر بحث سوال ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا وجود صوبہ جات کی آزادی کے منافی ہے کیونکہ ملازمتوں کو صوبہ جات کے اختیار سے باہر رکھنے کی ایک وجہ ان علاقوں کی موجودگی بتائی جاتی ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ان علاقوں کی وجہ سے صوبہ جات کی آزادی میں فرق لایا جائے کیوں نہ ان صوبوں کو ہی دوسرے صوبوں

سے ملا دیا جائے۔

مگر میرا یہ مطلب نہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا آج ہی سے اپنے ملازم الگ بھرتی کرنے شروع کر دے۔ میرے نزدیک دونوں باتیں ممکن ہیں۔ یہ بھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا اپنی ضرورتوں کے مطابق الگ بھرتی کرے اور یہ بھی کہ وہ صوبہ جات کی حکومتوں سے بطور قرض بعض افسران کی خدمات لے لیا کرے۔ دونوں صورتوں میں آل انڈیا اصول پر بھرتی کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے صوبہ جات کے ساتھ ان کا کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے جس سے وہ چند افسر اپنے کارکنوں کی تعداد میں زیادہ کر لیں۔ صوبہ جات پر اس سے کوئی بار نہیں پڑے گا کیونکہ اس قدر افسر گورنمنٹ آف انڈیا ان سے لے لیا کرے گی۔

لیکن بہر حال یہ عارضی انتظام ہو گا۔ صوبہ جات کی آزادی کی صورت میں ایک نہ ایک دن گورنمنٹ آف انڈیا کو اپنے عہدوں کے لئے الگ بھرتی کرنی پڑے گی اور اس کو ابھی سے مدّ نظر رکھ لینا چاہئے۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور اس کے سب انتظام کو ایک دن میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ منہ سے کامل آزادی کہہ دینا اور بات ہے اور عملاً اس قدر وسیع انتظام کو بغیر خرابی پیدا کرنے کے بدل دینا بالکل اور بات ہے۔ پس یہ تو لازمی بات ہے کہ ان سب تغیرات کا فیصلہ ابھی تو بطور پالیسی کے ہی ہو گا۔ عمل ان امور پر آہستگی اور تدریجی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جو افسر اس وقت ملازمت میں ہیں' ان کی ترقی کے راستوں کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ پس ان کے لئے یہ حق تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ترقی کرتے کرتے گورنمنٹ آف انڈیا کے زیادہ تنخواہ والے عہدوں کو حاصل کریں۔ اسی طرح گورنمنٹ آف انڈیا بھی ایک دن میں اپنی ملازمتوں کا سلسلہ الگ نہیں کر سکتی۔ پس ایسے قواعد تجویز کرنے چاہئیں کہ موجودہ ملازمین کے حقوق بھی محفوظ رہیں اور آئندہ بھرتی دو طریق پر ہو۔ کچھ حصہ آل انڈیا اصول پر اور کچھ حصہ پراونشل اصول پر اور آہستہ آہستہ مثلاً دس سال میں صرف پراونشل اصول پر بھرتی رہ جائے۔ اسی طرح گورنمنٹ آف انڈیا بھی کچھ ملازم براہ راست بھرتی کرے کچھ صوبہ جات سے مستعار لیا کرے اور وہ بھی پندرہ بیس سال تک اپنے محکموں کو صوبہ جات سے بالکل آزاد کر لے۔

میں اس امر کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتا کہ یہ تبدیلی کن مدارج کو طے کر کے ہو

کیونکہ یہ کام صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں کے باہم طے کرنے کا ہے۔ لیکن میں اس امر کے متعلق اپنی رائے بوضاحت ظاہر کرنی چاہتا ہوں کہ فیڈرل اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے صوبہ جاتی ملازمتوں اور مرکزی ملازمتوں کا الگ کیا جانا ضروری ہے۔ ہاں اس امر سے کوئی نہیں روک سکتا کہ بغیر اس کے کہ ان دونوں قسم کی ملازمتوں کو ایک سمجھا جائے' کسی وقت کسی خاص افسر کی خدمات گورنمنٹ آف انڈیا کسی صوبہ سے مستعار لے لے کیونکہ کُلّی طور پر آزاد حکومتیں بھی دوسری حکومتوں سے بعض افسر اس طرح مستعار طور پر لے لیتی ہیں۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر صوبہ کی ملازمتوں کی بھرتی کو اسی صوبہ کے انتظام کے نیچے لانے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ بھرتی انگلستان میں نہ ہو کیونکہ کوئی اسے مانے یا نہ مانے میرا یہ یقین ہے کہ ابھی کافی عرصہ تک انگریز افسروں کی ہندوستان کو ضرورت ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے سیکرٹری آف سٹیٹ (SECRETARY OF STATE) بھرتی نہ کیا کرے بلکہ جس قدر انگریز افسروں کی بھرتی ضروری سمجھی جائے' اس قدر بھرتی ہر اک صوبہ کا گورنر وزیر ہند کی معرفت یا ہندوستان کے ہائی کمشنر کی معرفت خاص اس صوبہ کے لئے کرے اور بھرتی شدہ افسر خاص اس صوبہ کے ملازم سمجھے جائیں۔ ہاں وہ صوبہ اسی طرح وزیر ہند کی معرفت ان کے حقوق ادا کرنے کا ذمہ وار ہو جس طرح اب حکومت ہند اس کی ذمہ وار ہوتی ہے اور چونکہ ان افسروں کی تسلی اور اطمینان پر صوبہ جات کی ترقی کا بہت کچھ دارومدار ہوگا اس لئے میرے نزدیک اس امر کا پورا انتظام ہونا چاہئے کہ ان کی تنخواہوں اور درجوں کا معیار نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا جائے اور اس تغیر سے انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے پائے۔

اس باب سے تو اس کا چنداں تعلق نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس امر کو اور کسی جگہ پر بیان کرنے کا موقع نہیں ملے گا کہ اگر ہندوستان کو برطانوی امپائر (EMPIRE) کا حصہ رکھنا ہے (اور کم سے کم میں تو اسے ایسا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر اس سوال پر اختلاف ہو تو میں شدید ترین سیاسی اتحاد کو بھی اس کی تائید میں توڑنے کے لئے تیار ہوں) تو پھر انگریزی عنصر کا کسی نہ کسی صورت میں ایک لمبے عرصہ تک اس ملک میں قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس وقت تک جو برطانوی نو آبادیات ہیں' وہ یا تو کُلّی طور پر انگریزی نسل سے آباد ہیں جیسے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ یا پھر جزوی طور پر انگریزی نسل سے آباد ہیں۔ جیسے کینیڈا اور ساؤتھ افریقہ۔ اور

ایسے ممالک باوجود دور ہونے کے بوجہ زبان کے اتحاد اور رشتہ داریوں کے تعلقات کے آسانی سے متحد رہ سکتے ہیں لیکن وہ ملک جو ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہو اور جس کی زبان بھی مختلف ہو' تہذیب بھی مختلف ہو' قومیت بھی مختلف ہو' مذہب بھی مختلف ہو' اس کی آزادی کے زمانہ میں اس میں برطانیہ سے وابستگی کا احساس پیدا کرانے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ سامان رہے اور اس کا بہترین ذریعہ انگریزی عنصر کی موجودگی ہے۔ اگر یہ عنصر بھی اس آزادی کے شروع میں کمزور ہو گیا تو کبھی بھی ایک ایمپائر کے فرد ہونے کا وہ احساس ہندوستان میں پیدا نہیں ہو سکے گا جس کے بغیر مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کی آزادی آزادی نہیں بلکہ شدید ترین قید ثابت ہوگی۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ رقابت کا سوال اُسی وقت تک زیب دیتا ہے جب تک کہ خیال کیا جاتا ہے کہ برطانیہ نے زور سے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے لیکن جب برطانیہ آپس کے سمجھوتے کے ساتھ ہندوستان کو نو آبادیوں والی آزادی دینے کے لئے تیار ہو جائے تو ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی قومیت کے نقطہ نگاہ کو بدل کر نہ صرف اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھیں بلکہ برطانوی دُوَلِ متّحدہ......... کا بھی ایک فرد سمجھیں اور جس طرح ایک قومیت کو عزیز سمجھیں' اسی طرح دوسری قومیت کو بھی عزیز سمجھیں۔ اور اس دن سے انگریز اپنے آپ کو ہندوستان میں ایک اجنبی کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک وطنی کی حیثیت میں محسوس کرے۔

مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا ہے جس کا اس جگہ پر بیان کرنا میں ہندوستان اور انگلستان دونوں کے ایک وفات یافتہ دوست کے ذکر خیر کے قائم رکھنے کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ باہمی دوست اس وقت اپنے وطن میں اپنے ملک کے دشمنوں میں اگر نہیں سمجھا جاتا تو دوستوں میں بھی نہیں خیال کیا جاتا۔ میری مراد اس سے مسٹر مانٹیگو (MR. MONTAGUE) ہے۔ جب وہ ۱۹۱۷ء میں بطور وزیر ہند کے ہندوستان کی حالت کا مطالعہ کر کے آئندہ سیلف گورنمنٹ کی سکیم بنانے کے لئے آئے تو میں نے بھی ان سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔ انہوں نے جس دن احمدیہ وفد کو اپنا ایڈریس پڑھنے کا موقع دیا اسی شام کو مجھے بھی ملاقات کا وقت دیا۔ جب میں ملنے کے لئے گیا تو مسٹر رابرٹ (MR. ROBERT) ممبر پارلیمنٹ جو ان کے ساتھ ہندوستان آئے تھے دروازہ پر آکر مجھے اور

میرے ہمراہی کو اندر لے گئے اور گفتگو کے وقت برابر ساتھ رہے۔ ممکن ہے آئندہ جو واقعہ میں بیان کرتا ہوں انہیں بھی یاد ہو۔ ملتے ہی مسٹر مانٹیگو نے مجھ سے پوچھا کہ جو ایڈریس آج احمدیہ جماعت کی طرف سے پڑھا گیا ہے وہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ لکھا ہوا تو میرا ہے لیکن انگریزی ترجمہ دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ مجھے اس ایڈریس کو سن کر احمدیہ سلسلہ سے اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ میں نے فارغ ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہزایکسیلنسی وائسرائے کو (His Excellency Viceroy) کو لکھا کہ اگر ان کی لائبریری میں کوئی کتاب احمدیت کے بارہ میں ہے تو مجھے بھجوادیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک کتاب مجھے بھجوادی۔ جو میں ابھی ابھی پڑھ رہا تھا اور یہ کہہ کر انہوں نے وہ کتاب بھی مجھے دکھائی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مسٹر والٹر (MR. WALTER) کی کتاب احمدیت تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ سے آپ کے سلسلہ کے متعلق باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن ایک بات جو آپ کے ایڈریس میں مجھے غلط معلوم ہوئی ہے پہلے اس کا ذکر کرلوں اور وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے ایڈریس میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی ریلوں وغیرہ پر فارن کیپٹل لگا ہوا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے ریلوں وغیرہ پر یا انگریزی سرمایہ ہے یا ہندوستانی۔ میں نے جواب دیا کہ انگریزی سرمایہ بھی تو اجنبی سرمایہ ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ کم سے کم میں تو انگریزوں اور ہندوستانیوں کو ایک ہی سمجھتا ہوں اور ایک دوسرے کے مقابل میں اجنبی نہیں خیال کرتا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کی آواز میں نہایت ملائمت اور گہرا سوز تھا۔ ان کی آواز اور ان کے چہرہ کی حالت کا جو میرے دل پر اثر ہوا وہ اس قدر گہرا ہے کہ آج تیرہ سال گذر جانے پر بھی وہ فراموش نہیں ہوا۔ اس وقت میرے عزیز چودھری ظفراللہ خان صاحب بیرسٹرایٹ لاء جو احمدیہ جماعت کے ایک فرد ہیں اور اس وقت راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا نمائندہ مقرر ہو کر انگلستان گئے ہوئے ہیں' میرے ہمراہ تھے۔ تاکہ مسٹرمانٹیگو کے سامنے میری باتوں کا انگریزی میں ترجمہ کرتے جائیں۔ ممکن ہے ان کے دل پر بھی اس کا اثر ہوا ہو۔ مگر میرے دل پر تو آج تک ان کی اس بات کا اثر ہے اور جب کبھی میں انگریزی اخبارات میں انگریزوں کے قلم سے نکلا ہوا یہ فقرہ دیکھتا ہوں کہ "مسٹرمانٹیگو جن کی کوئی قومیت بھی نہ تھی۔" انہوں نے ہندوستان کے متعلق سب خرابی پیدا کی ہے تو مجھے فوراً وہ واقعہ یاد آجاتا ہے اور میں حیران ہو جاتا ہوں کہ انسانی علم کس قدر ناقص ہے۔ وہ شخص جس نے مذکورہ بالا فقرہ میں اپنے دل کی

گہرائیوں کو میرے لئے روشن کر دیا۔ جو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستانی انگریزوں کو اجنبی سمجھیں بلکہ چاہتا تھا کہ دونوں قوموں کو محبت کی مضبوط رسی سے اس طرح باندھ دیا جائے کہ وہ پیوندی درخت کی طرح ایک ہی درخت بن جائیں اسے انگریزی قوم کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ بے شک بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے لوگ ان کی قدر نہیں کرتے بعد میں آنے والے لوگ ان کی حقیقت کو سمجھتے ہیں اسی قسم کے لوگوں میں سے مسٹر مانٹیگو تھے۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستانی خیال کرتے تھے کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو دھوکا دیا ہے۔ پھر انگریزوں میں سے بہتوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے فوائد کو قربان کر دیا ہے لیکن اب بہت سے ہندوستانی اپنی غلطی کو جان چکے ہیں اور بہت سے انگریز آئندہ جان لیں گے۔

بہر حال اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر برطانوی نظام کی واقعہ میں کوئی قیمت ہے اور ہندوستان اس میں پرویا جانا چاہتا ہے تو ہمیں اس کے افراد کے اندر وہی احساس پیدا کرنا چاہئے جس کا اظہار مسٹر مانٹیگو نے میرے سامنے کیا۔ تب اور صرف تب ان مختلف المقام اقوام کے اتحاد کی اصل غرض پوری ہو سکتی ہے۔ جس کا نصب العین صرف چند اقوام کو جمع کرنا نہیں بلکہ بنی نوع انسان کو محدود دائروں سے نکال کر انسانیت کے وسیع دائرہ میں لا کر کھڑا کرنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر انگریز اس حقیقت کو سمجھتا ہے نہ یہ کہتا ہوں کہ کوئی انگریز بھی اس حقیقت کو نہیں سمجھتا۔ میں تو صرف قدرت کے اشارہ کی تشریح کرتا ہوں۔ دل خواہ منزل مقصود کی تڑپ سے خالی ہوں' دماغ خواہ اس کے خیال سے ناواقف ہوں' مگر ایک زبردست طاقت قدموں کو اُدھر کی طرف اُٹھا رہی ہے۔ ان باہمت لوگوں کا جو قدرت کے اشاروں کو سمجھتے ہیں کام ہے کہ اس بے مقصد بہنے والے پانی کی رَو کو حدوں میں لا کر ایک آبشار کی صورت میں بدل دیں اور اس کی غیر محدود طاقت کو دنیا کے فائدہ کے لئے استعمال کریں۔ اے کاش! میری بات کو کوئی سمجھنے والا ہو۔

شاید بعض لوگ خیال کریں کہ میں اپنے مضمون سے باہر چلا گیا ہوں لیکن میں اپنے مضمون سے باہر نہیں گیا۔ گو ممکن ہے بعض لوگ میرے ساتھ نہ مل سکے ہوں میرا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی امپائر کا حقیقی طور پر ہم کو حصہ بننا ہے تو ہمیں قومیت کے متعلق بھی اپنے نقطہ نگاہ کو بدل دینا چاہئے اور جب تک نئے حالات ظاہر ہو کر اتحاد کی نئی صورتیں پیدا نہ کر دیں' اس

وقت تک کسی نہ کسی صورت میں انگریزوں کی ایک تعداد کو اس ملک میں اپنا شریک کار رکھنا چاہئے۔ یہ سمجھتے ہوئے نہیں کہ وہ انگریز ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ہماری نئی قومیت کے افراد ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ تمام قومی بندھنوں کو توڑ دینے کے لئے بیتاب اسلامی روح کا ایک مظاہرہ ہے اور اس وجہ سے حب وطن کے جذبات سے سرشار لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ جو چاہیں سمجھ لیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے' وہی راہ ہندوستان کی ترقی کی ہے۔ اسے نظرانداز کر کے دیکھ لو کہ ہندوستانی قومیت کبھی پیدا نہیں ہو گی۔

باب ششم

مرکزی حکومت

صوبہ جاتی حکومتوں، عدالتوں اور ملازمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اب میں مرکزی حکومت کو لیتا ہوں۔ گو مرکزی حکومت خواہ اتّصالی طرز کی ہو یا اتحادی طرز کی، اجزاء کی حکومت سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اس کی اہمیت صرف ملک کے قانون اساسی سے دوسرے درجہ پر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اکثر مطالب جو صوبہ جات اور مرکز کے درمیان میں مشترک تھے بیان ہو چکے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اب میرا کام بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ کیونکہ بہت سے مطالب کی نسبت اب مجھے کچھ لکھنا نہیں پڑے گا صرف اشارہ کرنا کافی ہو گا۔

سائمن رپورٹ نے فیڈرل اصول کو تسلیم کرنے کے بعد اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اصل طریق اتحادی حکومتوں کا یہ ہوتا ہے کہ ان کے مختلف حصص مل کر ملک کے لئے ایک قانون اساسی تجویز کرتے ہیں کیونکہ اتحادی حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے حصوں نے مرکز کو قائم کیا ہے۔ پس جب تک ہندوستان کے صوبہ جات میں آزاد حکومت قائم نہ ہو جائے اس وقت تک مرکزی حکومت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "یہ خیال کہ ہندوستان ترقی کر کے فیڈریشن کے اصول پر حکومت خود اختیاری حاصل کرے گا۔ اس سوال پر کئی لحاظ سے اہم اثر رکھتا ہے کہ مرکزی حکومت میں اس وقت کس حد تک تبدیلی کی جا سکتی ہے ہم اس بات کی طرف اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ صوبہ جات کی موجودہ حدود پر مزید غور ہونا چاہئے اور ہم اس امید کا بھی اظہار کر چکے ہیں کہ آئندہ کسی وقت ایسی ریاستیں بھی ہندوستانی فیڈریشن کا حصہ بن جائیں گی۔ اندریں حالات ہمارے سامنے یہ صورت درپیش ہے کہ ہم ایسے حصوں کو فیڈریشن کے اصول پر متحد کرنا چاہتے ہیں جن میں سے بعض

نے تو ابھی تک اپنی آخری صورت اختیار نہیں کی اور بعض نے ابھی تک اس اتحاد میں شمولیت کی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ اگر ہم ایسی ریاستوں کو نظرانداز بھی کر دیں اور صوبہ جات کو بھی ان کی موجودہ شکل و صورت میں لے لیں۔ تب بھی ابھی تک وہ حالات جو فیڈریشن کے مکمل قیام کے لئے ضروری ہیں ہندوستان میں میسّر نہیں ہیں کیونکہ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے صوبہ جات مستقل خود اختیاری حکومت حاصل کریں۔" ؂۶۳

جہاں تک اصول کا تعلق ہے یہ امر بالکل درست اور صحیح ہے۔ اگر ہم اس امر کو تسلیم کر لیں کہ ہندوستان میں اتحادی طرز کی حکومت ہو گی تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مرکزی حکومت کا فیصلہ صوبہ جات کے اختیار میں ہونا چاہئے اور بجائے اس کے کہ ہم مرکزی حکومت کا ڈھانچہ بنائیں ہمیں اس دن کا انتظار کرنا چاہئے جب کہ صوبہ جات کی آزادی مکمل ہو جائے اور وہ مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کریں کہ مرکزی حکومت کی کیا شکل ہو' اور اس کے کیا اختیارات ہوں' اور اس کا تعلق اس کے آزاد حصص سے کیا ہو۔ لیکن اگر ہم اس امر کو دیکھیں کہ ہندوستان میں اتحادی حکومت ان اصول پر طے ہی نہیں ہو رہی جن کی بناء پر اتحادی حکومتیں قائم ہوا کرتی ہیں تو پھر سائمن کمیشن کا بتایا ہوا اصل کچھ ایسا وزن دار نہیں رہتا۔ کیونکہ اگر اس عام طریق کو لیں جو اتحادی حکومتوں کے قیام کے لئے ہے تو پہلے ہمیں ہندوستان کی حکومت کو توڑ دینا چاہئے اور الگ الگ آزاد صوبے قائم کرنے چاہئیں جن کا کسی مرکز سے تعلق نہ ہو۔ پھر جب ان کی آزادی مکمل ہو جائے تو پھر انہیں باہم اکٹھا کرنا چاہئے اور ان سے مشورہ کروانا چاہئے کہ وہ کن اصول پر آپس میں ملنا چاہتے ہیں اور پھر جو سکیم وہ مقرر کریں اس کے مطابق از سر نو ایک سکیم حکومت ہند کی تیار کر کے اس کے ماتحت ایک مرکزی حکومت قائم کرنی چاہئے۔ پھر ساتھ ہی اس احتمال کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ شاید صوبہ جات جب ملیں تو وہ یہی فیصلہ کریں کہ ہم الگ الگ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی مرکزی حکومت کی ضرورت ہی نہیں لیکن کیا کوئی عقل مند خیال کر سکتا ہے کہ یہ طریق معقول ہو گا اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ پیدا ہو گا؟

ہم سائمن رپورٹ کے لکھنے والوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا اب انہوں نے صوبوں کو جو اختیار دیئے ہیں وہ وہی ہیں جو ہر آزاد حکومت کو حاصل ہوتے ہیں۔ یا انہوں نے نہایت محدود

اختیارات جو یونائیٹڈ سٹیٹس کی ریاستوں سے بھی کم ہیں انہیں دیئے ہیں۔ پھر وہ بقیہ اختیارات جو ہر حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں انہوں نے کس غرض کے لئے علیحدہ رکھے ہیں۔ کیا اسی لئے نہیں کہ وہ مرکز کے پاس رہیں گے۔ پس اس طرح کیا انہوں نے نادانستہ طور پر ایک کانسٹی چیوشن (CONSTITIUTION) تیار نہیں کر دی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عارضی انتظام ہے۔ کیونکہ ان کی سکیم میں ایسی کوئی تجویز نظر نہیں آتی کہ کسی وقت صوبہ جات الگ الگ ٹیکس لگا سکیں گے۔ یا ڈاک خانے نکال سکیں گے یا ریلیں جاری کر سکیں گے بلکہ جو کچھ صوبہ جات کے پاس اس وقت ہے اس میں سے بھی کچھ حصہ انہوں نے لے لیا ہے جیسے ہائی کورٹوں کا انتظام وغیرہ۔ پس آئندہ دس بیس سال کے بعد جب بھی ان کی سکیم کے مطابق صوبہ جات مشورہ کے لئے اکٹھے ہوں گے تو وہ کیا کریں گے۔ کیا وہ اپنے موجودہ اختیارات میں سے مرکز کو کچھ دیں گے ہرگز نہیں، وہ تو پہلے ہی نہایت محدود ہیں۔ یا کیا وہ اس لئے اکٹھے ہوں گے کہ مرکز کے اختیارات میں سے کچھ خود لے لیں۔ اگر یہ صورت مدنظر ہے تو کیوں ابھی سے ان چیزوں کو صوبہ جات کے حوالے نہیں کر دیا جاتا کیونکہ اتحادی اصول کے ماتحت تو تمام اختیارات صوبوں کے پاس ہوتے ہیں۔ یا کیا وہ صرف موجودہ حالات کی تصدیق ہی کریں گے۔ اگر یہ امر ہے تو پھر کانسٹی چیوشن کا تو فیصلہ ہو چکا بعد میں صوبہ جات نے اکٹھے ہو کر کیا کرنا ہے۔

غرض گو عام حالات میں اسی طرح عمل ہوتا ہے جس طرح سائمن کمیشن نے لکھا ہے لیکن چونکہ ہندوستان میں ایک پہلے سے قائم شدہ حکومت کو بغیر توڑنے کے ایک نئی شکل دینی ہے اس لئے کوئی اعتراض کی بات نہیں اگر ایک ہی وقت میں دونوں حصوں کے لئے سکیم تیار کی جائے بلکہ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہ امر ضروری ہے۔ کیونکہ اگر بغیر سکیم تیار کرنے کے اس وقت مرکز کو چھوڑ دیا گیا تو صوبہ جات تو یہ خیال کرتے رہیں گے کہ یہ انتظام عارضی ہے اور اسی وقت تک ہے جب تک کہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں اختیارات ہیں اور ادھر اسمبلی آہستہ آہستہ طاقت پکڑ کر سب اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے گی اور اس وقت نہ برطانیہ صوبہ جات کا ساتھ دے سکے گا اور نہ صوبہ جات ہی میں طاقت ہو گی کہ مرکزی حکومت سے اختیارات تقسیم کرا سکیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ لاعلمی میں ہی اتحادی حکومت اتصالی کی شکل اختیار کرے گی اور زیادہ سے زیادہ اس کی شکل ساؤتھ افریقہ (SOUTH AFRICA) کی حکومت کی طرح کی ہو جائے گی۔ جسے مسلمان اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہندوستان میں بسنے

والے انگریز بھی کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پس مرکزی کانسٹی ٹیوشن کا اسی وقت فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ تاکہ اقلیتیں اطمینان سے بیٹھ سکیں اور ان کا یہ خطرہ جاتا رہے کہ کل کو مرکزی حکومت کے تصفیہ کے وقت کہیں پھر ان کے حقوق تلف کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ لیکن جہاں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان کے قانون اساسی کو آئندہ وقت کیلئے ملتوی نہ کیا جائے وہاں ایک اور امر کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں صوبہ جات اور مرکز کو آزاد حکومت ملنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر اک اپنی اپنی جگہ انتظام کی درستی میں مشغول ہو جائے گا اور نہ مرکزی حکومت دیکھ سکے گی کہ صوبہ جات اس کی ذمہ داریوں کو ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اور نہ صوبہ جات اس امر کی نگرانی کر سکیں گے کہ مرکز کہیں ان کے اختیارات کو تو غصب نہیں کر رہا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک دن یا تو مرکز یہ معلوم کر کے حیران رہ جائے گا کہ اس کی سب طاقتیں صوبہ جات چھین کر واپس لے گئے ہیں۔ یا صوبہ جات یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں گے کہ جس حکومت کا قیام ان کے مدنظر تھا اس کی جگہ ایک ایسی مرکزی حکومت قائم ہو گئی ہے جس نے ان کے سب اختیارات چھین لئے ہیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ صرف قانون کے الفاظ کام نہیں دیتے جب تک ساتھ استعمال کی تشریح بھی موجود نہ ہو۔ پس یہ امر نہایت ضروری ہے کہ جو قانون بنے ابتداء میں اس کے عمل درآمد کی نہایت ہوشیاری سے نگرانی کی جائے ورنہ قانون کے لفظ تو رہ جائیں گے لیکن مفہوم غائب ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس امر کا انکار نہیں کر سکتا کہ ان حالات میں گو فیڈرل قانون اساسی تو اسی وقت تیار ہو جانا چاہئے لیکن اس پر عمل فوراً نہیں شروع ہونا چاہئے اور اتحادی طریق حکومت کے خواہشمندوں کو چاہئے کہ عارضی جوش کے ماتحت اس تجویز کو نظر انداز کر کے اپنے مقصود کو خطرہ میں نہ ڈالیں۔ انہیں لازم ہے کہ پہلے صوبہ جاتی نظام کو مکمل کریں اور مرکزی حکومت کے ڈھانچے کو مکمل کر کے اس پر عمل کو چند سالوں کے لئے ملتوی کر دیں جب صوبہ جاتی حکومتیں اپنا کام کرنے لگیں اور چند سال تک انہیں کام کا موقع مل جائے تب مرکزی حکومت کو آہستگی سے اختیارات ملنے شروع ہوں۔

میری تحریر کا یہ مقصد نہیں کہ مرکز کے متعلق جو کچھ سائمن کمیشن نے لکھا ہے اسے پوری طرح ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے۔ یا یہ کہ موجودہ نظام حکومت کو ہی اس وقت تک قائم

رکھنا چاہئے۔ کیونکہ جس طرح یہ بات اصول کے خلاف ہے کہ اتحادی حکومت کی تکمیل صوبہ جات کی آزادی سے پہلے کی جائے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ صوبہ جات اس وقت تک آزاد ہو سکیں جب تک ان کے لئے آزادی کا ماحول پیدا نہ ہو۔ اگر ایک ایسی گورنمنٹ مرکزی موجود ہو جس کو آئندہ فیڈرل حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو اور اگر کوئی ایسا مقررہ راستہ نہ ہو جس پر چل کر آئندہ فیڈرل انتظام کو مکمل کیا جا سکے تو یقیناً اتحادی حکومت کا قیام ہندوستان کے لئے ناممکن ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ صوبہ جاتی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے۔ پس یہ نہایت ضروری ہے کہ مرکزی حکومت کو ایسے اصول پر قائم کیا جائے کہ اس کے ماتحت صوبہ جاتی حکومت کو آزادی کے حصول کا کافی موقع ہو اور اتحادی حکومت کی اس طرح داغ بیل ڈال دی جائے کہ آئندہ نظام بغیر کسی مشکل کے خود بخود مکمل ہوتا چلا جائے۔

(۱) ہندوستان کی درجہ نَو آبادی والی حکومت

اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے کہ اتحادی اصول پر حکومت کی بنیاد بھی قائم ہو جائے اور یہ خطرہ بھی نہ رہے کہ آئندہ ہندوستان کی آزادی کی تکمیل یا اس کی حکومت کی تشکیل میں کوئی دقّت پیدا ہو میرے نزدیک یہ تجویز بہترین ہوگی کہ ہندوستان کو نَو آبادیات کا درجہ ملنے کا فیصلہ تو ابھی ہو جائے اور آئندہ کیلئے فیڈریشن (FEDERATION) کا ڈھانچہ بھی تیار ہو جائے لیکن بعض تفصیلی امور جن کے اس وقت طے ہونے یا نہ ہونے کا فیڈریشن پر کچھ اثر نہیں پڑتا ان کی جگہ ایک عارضی ڈھانچہ حکومت کا تیار کر لیا جائے جو موجودہ ضروریات کو پورا کرنے والا ہو۔ پھر جوں جوں صوبے اپنے اندرونی انتظامات کو مکمل کرتے چلے جائیں فیڈریشن کے طے شدہ اصول کے ماتحت مرکزی حکومت کو زائد اختیارات ملتے جائیں۔ اس طریق سے ہندوستان میں اصولی طور پر تو اتحادی حکومت شروع سے ہی قائم ہو جائے گی اور عملی طور پر آہستہ آہستہ اس کا نفاذ ہو گا۔

مندرجہ بالا غرض کو پورا کرنے کیلئے میرے نزدیک یہ طریق اختیار کیا جا سکتا ہے کہ جو مسودہ بھی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مشورہ کے بعد پارلیمنٹ میں پیش ہو اس میں صاف طور پر درج کر دیا جائے کہ اس قانون کے پاس ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کو قانوناً نو آبادیوں والی حکومتِ خود اختیاری حاصل ہو جائے گی اور صرف عملی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اس کا نفاذ

ان شرائط کے ساتھ جو ذیل میں بیان کی جاتی ہیں بتدریج ہو گا۔ اس کے بعد ان حفاظتی تدابیر اور مؤقّت قیود کو بیان کر دیا جائے جو درمیانی عرصہ کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس امر کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کہ پہلے صوبہ جاتی نظام مکمل ہو جائے تو پھر مرکز کو مکمل کیا جائے ضروری سمجھی جائیں۔

غرض اس وقت بوضاحت یہ امر بیان کر دیا جائے کہ ہندوستان کو اصولی طور پر درجہ نَو آبادیات دے دیا گیا ہے گو حفاظتی تدابیر بھی ساتھ ہی بیان کر دی جائیں اور اسی طرح آئندہ نظامِ حکومت کی ترقی کی صورتیں بھی بتادی جائیں۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ جب نہ مرکزی حکومت کا نظام مکمل ہوا ہو اور نہ صوبہ جات کو ہی مکمل آزادی ملی ہو تو پھر اس قسم کے اعلان سے کیا فائدہ؟ کیونکہ کسی چیز کا بطور اصول کے مل جانا اس کے عملی حصول میں بہت کچھ مُمِدّ ہوتا ہے۔ ایک شخص اگر کسی سے وعدہ کرے کہ میں تجھے کچھ مال دوں گا۔ اس کی جائیداد میں اور اس یتیم کی جائیداد میں جس کی طرف سے دوسرے لوگ انتظام کر رہے ہوں بہت کچھ فرق ہوتا ہے۔ انتظام کے لحاظ سے تو دونوں برابر ہونگے۔ وہ بھی جس کے پاس کچھ نہیں اور کسی نے اسے کچھ جائیداد دینے کا وعدہ کیا ہے اور صاحب جائیداد یتیم بھی لیکن حقیقت میں دونوں میں بہت فرق ہو گا۔ اول الذکر ایک جائیداد کا وعدہ ہو جانے سے صاحب جائیداد نہیں کہلا سکتا اور ثانی الذکر صاحب جائیداد کہلاتا ہے۔ اگر یہ اعلان نہ کیا جائے کہ ہندوستان کو درجہ نو آبادیات دے دیا گیا ہے تو خواہ کس قدر اختیارات بھی ہندوستان کو مل جائیں پھر بھی اس کے لئے امید و بیم کی حالت باقی رہے گی لیکن اگر یہ اعلان ہو جائے تو خواہ اختیارات محدود ہی ہوں آزادی کی جنگ ختم ہو جائے گی اور صرف اندرونی انتظام کی مہم اس کے لئے باقی رہ جائے گی۔

دونوں حالتوں میں ایک موٹا فرق جسے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے یہ ہے کہ اس اعلان کے بعد ہندوستان کا تعلق پارلیمنٹ سے اسی طرح ختم ہو جائے گا جس طرح کہ دوسری نَو آبادیوں کا۔ اور جو مراحل بھی عملی آزادی کے اس کو طے کرنے ہونگے ان کا طے کرنا ان ہدایات کے ماتحت جو اس اعلان کے ساتھ ہی دے دی جائیں گی صرف اس کا اپنا کام ہو گا یا پھر بعض امور کا تصفیہ ہندوستان کی حکومت تنفیذی اور انگلستان کی وزارت کے درمیان رہ جائے گا اور آئندہ نہ پارلیمنٹ کے کسی اور قانون کی ضرورت رہے گی اور نہ کسی شاہی کمیشن

کی۔

خلاصہ یہ کہ فیڈرل اصول کے ماتحت ہندوستان کی مرکزی حکومت کا ڈھانچہ اِسی وقت تیار ہو جانا چاہئے اور ہندوستان کو درجہ نو آبادیات کے ملنے کا اِسی وقت اعلان ہو جانا چاہئے۔ اس سے ایک تو ہندوستان کی بے چینی دور ہو جائے گی اور دوسرے اقلیتوں کو اطمینان ہو جائے گا۔ مذکورہ بالا فرق کے علاوہ قانونی لحاظ سے بھی ہندوستان کے درجہ میں مندرجہ ذیل فرق پیدا ہو جائے گا۔

(۱) برطانوی پارلیمنٹ قانونی طور پر اس کا فیصلہ کر دے گی کہ ہندوستان تاج برطانیہ کے ماتحت کُلّی طور پر آزاد ہے۔

(۲) صوبہ جات کی عملی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

(۳) آئندہ نظام حکومت کے فیصلہ کا حق برطانیہ سے منتقل ہو کر ہندوستان کے صوبوں کو حاصل ہو جائے گا جس سے گویا عملاً بھی ہندوستان کو آزادی حاصل ہو جائے گی۔

(۴) حقیقی آزادی کی جدوجہد جو اصل میں ملک کے انتظام کی اندرونی درستی کا ہی نام ہے بے خدشہ ہو جائے گی۔ کسی دوسری طاقت کے اس میں دخل انداز ہونے کا خطرہ باقی نہیں رہے گا۔

(۵) ہندوستان کے نمائندے بطور ذاتی حق کے برطانوی ایمپائر کی کانفرنسوں میں شامل ہو سکیں گے۔

(۶) ہندوستان کا تعلق بجائے پارلیمنٹ کے وزارت کے توسط سے مُلکِ معظّم سے ہو گا۔

(۷) گورنروں کا عہدہ یا گورنر جنرل کا عہدہ سب کے سب آئینی ہو جائیں گے۔

(۸) چونکہ ہندوستان کی آزادی کی ترقی کا فیصلہ کسی اور طاقت کے ہاتھ میں نہیں رہے گا بلکہ ایک آئین کے ماتحت فی ذاتہٖ اس میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اس لئے کسی افسر کو خواہ انگریز ہو خواہ ہندوستانی ہو اس کے راستہ میں روکیں پیدا کرنے کی جرأت نہیں ہو گی اور سب کے سب مجبور ہوں گے کہ طوعًا یا کرھًا مقررہ راہ کی طرف قدم اٹھاتے چلے جائیں۔

(۹) گورنر جنرل آئندہ وزارت کا قائم مقام نہیں سمجھا جایا کرے گا بلکہ بادشاہ کا اور جب تک وزارت کونسلوں کے آگے جوابدہ نہیں ہوتی اس وقت تک وہ ایگزیکٹو

(EXECUTIVE) کا سردار ہونے کی حیثیت سے وزیر ہند سے جو خط و کتاب کرے گا وہ اس کا نائب ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستان کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کرے گا۔

غرض گو اس وقت درجہ نَو آبادی دینے کا عملی نتیجہ یہ نکلے کہ فوراً ہی ہندوستان بہر جہت وہ آزادی حاصل کرلے جو مُلکِ معظّم کے ماتحت دوسری نو آبادیوں کو حاصل ہے لیکن بعض اصولی اور اہم فوائد اس سے حاصل ہونگے اور آئندہ کے لئے آخری مقام تک پہنچنے کے لئے کوئی روک باقی نہ رہے گی۔

(۲) قانونِ اَساسی اس فیصلہ کے ساتھ ہی کہ ہندوستان کو آئندہ سے درجہ نو آبادیات حاصل ہے اس قانون کا بھی جو ہندوستان کی اتحادی حکومت کے لئے بمنزلہ اساس رہے گا فیصلہ کردینا چاہئے۔ یہ کہنا کہ ہمارا کیا ہوا فیصلہ ہمیشہ کے لئے ملک کو پابند کیونکر کرسکتا ہے درست نہیں۔ کیونکہ سب دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت کچھ لوگ مل کر ایک فیصلہ کردیتے ہیں اور آئندہ کے لئے وہ قانونِ اَساسی بن جاتا ہے۔ امریکہ کا قانون اساسی بھی چند ایسے لوگوں نے بنایا تھا جو ان معنوں میں ملک کے صحیح نمائندے نہیں کہلا سکتے تھے کہ ملک نے انہیں کثرت رائے سے اس غرض کے لئے منتخب کیا تھا لیکن ان کا بنایا ہوا قانونِ اَساسی اب تک کام دے رہا ہے بلکہ آج تک امریکن قوم اسے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گو وہ لوگ اپنے زمانہ کے لوگوں کے بھی نمائندے نہ تھے لیکن انہوں نے قانونِ اَساسی بناتے ہوئے دیانتداری سے اپنے ملک کی ضرورتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی اور ایک ایسا قانون بنادیا جس سے وہ ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں۔ پس گو وہ لوگ ووٹوں کے ذریعہ سے نمائندے نہ تھے لیکن خیالات کی ترجمانی کے لحاظ سے وہ نمائندے بن گئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قانونِ اَساسی گو ہمیشہ کے لئے ملک کو پابند کردیتا ہے لیکن اس کی تبدیلی کی گنجائش بھی اس میں موجود ہوتی ہے۔ پس اگر اس میں کوئی سخت نقص ہوگیا ہو تو ملک کے لوگ اس کی اصلاح کرنے پر ہر وقت قادر ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ ملک کے لئے مُضِرّ نہیں ہوسکتا۔ ہاں فائدہ اس سے بے شک پہنچ سکتا ہے کیونکہ اس کے بننے سے ایک ایسی شاہراہ تیار ہوجاتی ہے جسے ملک کے لوگ اپنے سامنے رکھ کر بغیر پریشانی کے آگے کی طرف قدم اٹھا

سکتے ہیں۔ تمام دنیا کا یہ تجربہ ہے کہ ناقص پروگرام، پروگرام کے بالکل نہ ہونے سے بہرحال اچھا رہتا ہے۔ پس ان حالات میں بہتر یہی ہے کہ آج ہی ہندوستان کے لئے ایک قانون اساسی تیار ہو جائے۔

ہندوستان کے قانونِ اساسی کے متعلق مَیں اپنی کتاب کے پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ لکھ آیا ہوں اس لئے اب مجھے ان بحثوں میں دوبارہ پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس جگہ میں صرف ان امور کو بِالاختصار بیان کر دیتا ہوں جن کا ذکر ہندوستان کے قانون اساسی میں ضرور ہونا چاہئے۔

(۱) اصول حکومت مکمل اتحادی ہو یعنی صوبہ جات کے ہاتھ میں سب اختیار رہیں سوائے ان اختیارات کے جو وضاحتاً مرکزی حکومت کو دیئے گئے ہوں اور وہ اختیارات انہی امور کے متعلق ہوں جن کا اثر کل ہندوستان پر پڑتا ہے۔

(۲) مجالس واضع قوانین دو ہوں۔ لیکن یہ نہیں کہ دونوں مجلسیں ایک ہی کام کرنے والی ہوں بلکہ دوسری مجلس ایسے رنگ کی ہو کہ اس قسم کی مجلسوں کی جو غرض ہوتی ہے اس سے پوری ہو یعنی ایک مجلس افراد کی نمائندہ ہو اور دوسری علاقوں کی۔

(۳) اس میں مرکز کے لئے بھی اور صوبہ جات کی حکومت کے لئے بھی یہ شرط رکھی جائے کہ وہ مذہب پر عمل یا اس کی تبلیغ یا تعلیم یا مذہب بدلنے پر کسی قسم کی قید نہیں لگائیں گے۔

(۴) کسی قوم کی زبان یا اس کی تہذیب یا اس کی خوراک پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جائے گی۔

(۵) مختلف صوبوں کے ساتھ سلوک میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا نہ مختلف افراد اور اقوام میں کوئی فرق کیا جائے گا۔

(۶) وہ مذاہب جن میں ایک معیّن اہلی قانون ہے اس میں دخل اندازی نہیں کی جائے گی سوائے اس کے کہ اس مذہب کے لوگ خود اپنے مذہب کی فقہ کو اس سوال کے متعلق قانون کے ماتحت لانا چاہیں۔

(۷) ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور مسیحیوں کو حتی الامکان ان کی تعداد کے مطابق سرکاری ملازمتوں میں حصہ دینے کی کوشش کی جائے گی اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا جس میں کسی قوم یا مذہب کے افراد کو جو ہندوستان کے باشندے ہوں کسی ملازمت یا فائدہ

کے کام سے محروم رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔

(۸) کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا جس کی غرض بعض افراد یا جماعتوں کو امتیازی طور پر فائدہ پہنچانا یا بعض افراد یا جماعتوں کو خاص طور پر نقصان پہنچانا ہو۔

(۹) جُداگانہ انتخاب کو پچیس سال تک منسوخ نہ کیا جائے گا سوائے اس صورت کے کہ جو قوم اس سے فائدہ اٹھا رہی ہو اس کے ۸۰ فیصدی منتخب ممبر اسے ترک کرنے کی درخواست کریں لیکن یہ ضروری ہو گا کہ جس مجلس کے انتخاب میں جُداگانہ انتخاب اُڑانے کی درخواست ہو اس مجلس کے اسّی فیصدی ممبروں کی درخواست ہو۔

(۱۰) اتحادی حکومت کے جو حصص پہلی دفعہ مقرر ہو جائیں ان کے توڑنے یا ایک کو دوسرے سے ملانے کا اس حصہ کی مرضی کے سوا جس کا توڑا جانا یا ان حصوں کی مرضی کے سوا جن کو ملانا مقصود ہو کسی کو حق نہ ہو گا۔

(۱۱) اگر سندھ (SIND) نارتھ ویسٹرن (NORTH WESTERN) فرنٹیئر پراونس (FRONTIER PROVINCE) اور بلوچستان کو نیا نظام جاری ہونے سے پہلے صوبہ جاتی آزادی نہ ملے تو یہ بھی قانون اساسی میں درج ہونا چاہئے کہ پہلے پانچ سال کے اندر اندر ان صوبوں کو دوسرے صوبوں کی طرح خود اختیاری حکومت مل جائے گی اور یہ کہ اگر پانچ سال کے اندر مرکزی حکومت اس کا انتظام نہ کرے تو اس کا کوئی قانون اس وقت تک کہ وہ اس غرض کو پورا کرے جائز قانون نہ کہلا سکے گا کیونکہ اس کے وہ حصص جنہوں نے اسے اختیار دیئے ہیں رائے دینے میں آزاد نہ ہونگے۔

(۱۲) افراد کے حقوق کی فہرست دے دی جائے کہ ان میں حکومت کو دخل دینے کا حق نہ ہو گا۔ مثلاً جائیداد کا چھیننا' ووٹ کا حق چھیننا' بغیر مقدمہ کے گرفتار کرنا' قانون کے پاس ہونے سے پہلے جرائم پر گرفتار کرنا یا سزا دینا وغیرہ وغیرہ۔

(۱۳) کسی صوبہ کی اندرونی آزادی کو مرکز کسی وقت اور کسی صورت میں نہیں چھین سکتا اور نہ کم کر سکتا ہے۔

(۱۴) جو اختیارات مرکز کو نہیں دیئے گئے ان کے متعلق کوئی قانون اس کا جائز نہ ہو گا بلکہ اس کے متعلق صوبہ جات کے قانون ہی تنفیذ کے قابل ہونگے۔

(۱۵) سپریم کورٹ کا فیصلہ مرکزی قانون اساسی کے متعلق اور صوبہ کے ہائیکورٹ کا فیصلہ

صوبہ کے قانون اساسی کے متعلق آخری ہوگا اور اگر صوبہ جات یا مرکزی حکومت کو اس پر اعتراض ہو تو وہ صرف مقررہ قواعد کے رو سے قانون اساسی میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

(۱۶) ہر ترمیم قانون اساسی کی جو مقررہ اصول کے مطابق نہ ہو جائز نہ ہوگی۔

(۱۷) عبادت گاہوں کا بنانا' مذہبی نظام کیلئے انجمنوں یا خاص نظام کا بنانا' مذہبی مدارس' اوقاف وغیرہ میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی جائے گی۔

یہ چند امور مَیں نے ایسے گنائے ہیں کہ جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ورنہ کانسٹی ٹیوشن میں اور کئی امر لانے پڑیں گے لیکن یہ کام قانون سازوں کا ہے وہی کامل بحث و تمحیص کے بعد اس کی تفصیلات کو طے کر سکتے ہیں۔ ہاں میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ مرکزی حکومت کے اختیار مقرر کرتے وقت (۱) یہ نہ کیا جائے کہ جو اختیارات اس وقت مرکزی حکومت کو حاصل ہیں انہی کو قائم رہنے دیا جائے کیونکہ وہ اختیارات بہت زیادہ ہیں۔ چاہئے کہ امریکن کانسٹی ٹیوشن اور نہرو رپورٹ کے بتائے ہوئے مرکزی حقوق کو ملا کر اس کے درمیان میں راہ نکالی جائے۔ امریکن نظام حکومت میں بہت تنگی سے کام لیا گیا ہے اور نہرو رپورٹ میں مرکز کو بہت اختیار دیئے گئے ہیں۔ (۲) سِول لاء اس وقت مرکزی حکومت کے ماتحت ہے نہرو رپورٹ نے بھی اسے مرکز کے ماتحت رکھنے کی تجویز کی ہے لیکن کامل فیڈرل حکومتوں میں سِول لاء (CIVIL LAW) زیادہ تر ریاستی حکومتوں کے متعلق ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ سول لاء درحقیقت ملک کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور تہذیب کا اختلاف ہی اتحادی حکومت کا باعث ہوتا ہے۔ پس عقلاً تو سول لاء صوبہ جات کے سپرد ہونا چاہئے لیکن چونکہ اس وقت تک سول لاء ہندوستان میں ایک ہی ہے اس لئے اس کا بدلنا بھی اب ٹھیک نہیں۔

پس اگر یہ شرط کر دی جائے کہ شادی' بیاہ' ورثہ' طلاق وغیرہ معاملات کے متعلق جو اہلی قانون کہلاتا ہے قوانین بنانا مرکزی حکومت کے نہیں بلکہ صوبہ جاتی حکومتوں کے سپرد ہوگا تو اس طرح وہ حصہ قانون کا جس میں مختلف علاقوں کے لوگوں میں مختلف دستور ہیں مرکز کے اختیار سے باہر ہو جائے گا اور بغیر سارے سول لاء کو منسوخ کرنے کے فیڈرل اصول کی حفاظت بھی ہو جائے گی۔ پس اول تو اہلی قانون میں حکومت دخل ہی نہ دے گی اور اگر کسی جماعت کے

اپنے کہنے پر دخل دے گی تو قانون صرف اس صوبہ کے لئے ہوگا اور اس وجہ سے اس علاقہ کے لوگوں کی ضرورتوں کا اس میں پورا لحاظ رکھا جاسکے گا۔

قانونِ اَساسی کی تبدیلی

جس طرح قانون اساسی کا بنانا اقلیتوں اور صوبوں کے حقوق کی حفاظت کیلئے ضروری ہے اسی طرح اس میں تبدیلی کے قواعد بھی ان کے لئے بھی اور ملک کے لئے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کیلئے اس طرح کہ اگر قانونِ اَساسی کا بدلنا حد سے زیادہ آسان ہو تو قانونِ اَساسی کا سب فائدہ ان کیلئے باطل ہو جاتا ہے اور ملک کے لئے اس طرح کہ اگر اس کا بدلنا حد سے زیادہ مشکل ہو تو ملک بعض اوقات اپنی اشدّ ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر سکتا اور اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ پس ان دونوں باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قانونِ اَساسی بنانا چاہئے اور دونوں **نقصوں** سے اسے پاک رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میرے نزدیک وہ طریق جس سے یہ دونوں نقص پیدا نہیں ہو سکیں گے یہ ہے

(۱) جو تبدیلی ایسی ہو کہ اس کا اثر کسی خاص صوبہ پر پڑتا ہو جیسے کسی صوبہ کے علاقہ میں تبدیلی کرنا اس کے لئے تو یہ شرط ہو کہ دو تہائی حقیقی اکثریت کے ساتھ اگر دونوں مرکزی مجالس اسے منظور کریں اور پھر اس صوبہ کی مجلس تین چوتھائی حقیقی اکثریت سے اسے منظور کرے تو وہ تبدیل ہو جائے۔

(۲) اگر وہ تبدیلی جو تجویز کی گئی ہو کسی خاص صوبہ سے تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا اثر سب صوبوں پر پڑتا ہو تو مرکزی مجالس کی دو تہائی حقیقی اکثریت کے بعد دو تہائی صوبوں کی مجالس اگر دو دو تہائی حقیقی اکثریت سے اس تبدیلی کو قبول کرلیں تو قانون اساسی میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی جائے لیکن مزید شرط یہ ہو کہ مرکزی مجالس کے فیصلہ کی تاریخ سے لے کر دو سال کے اندر صوبہ جاتی مجالس شرائط مذکورہ بالا کے مطابق تصدیق کر دیں۔ اگر دو سال کے اندر صوبہ جات کی طرف سے مقررہ قواعد کے مطابق تصدیق نہ ہو تو وہ قانون باطل سمجھا جائے اور جب تک اسمبلی کا دوبارہ انتخاب نہ ہو جائے تب تک اس سوال کو دوبارہ پیش کرنے کی اجازت بھی نہ ہو۔

(۳) کچھ ایسے حصے بھی قانون اساسی میں ہونگے جن کے مطابق قطعی طور پر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ ان کے متعلق کسی صورت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی جیسے کہ مذہب کی

آزادی، تبدیلی مذہب کا اختیار، تبلیغ کی آزادی، زبان کی آزادی، قومی ترقی، مذہبی ترقی یا قومی نظام کی مجالس کی آزادی یا مثلاً تاج برطانیہ سے تعلق کا سوال ہے اس کے متعلق کسی اندرونی فیصلے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ ہاں مؤخّر الذکر سوال اگر کسی وقت برطانیہ کے سمجھوتہ سے طے ہو تو ہو سکتا ہے۔

(۴) جن امور کی تبدیلی کے لئے کوئی خاص قواعد قانونِ اَساسی میں بیان ہو چکے ہوں یا حدبندیاں مقرر ہوں انہیں عام قواعد پر مقدم رکھا جائے گا۔

(۵) سندھ، صوبہ سرحدی اور بلوچستان کی آزادی سے پہلے قانونِ اَساسی کی تبدیلی کے متعلق کوئی قانون پاس نہیں کیا جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں اگر ان قواعد کو منظور کر لیا جائے تو قانونِ اَساسی میں تبدیلی زیادہ مشکل بھی نہ ہوگی اور ایسی آسان بھی نہ ہوگی کہ اقلیتوں یا صوبہ جات کے حقوق کو نقصان پہنچ جائے۔

باب ہفتم

مرکزی حکومت کا وقتی انتظام

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس وقت نہ ہندوستان کے حالات اجازت دیتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے طریق کو پوری طرح ہندوستان کی مرکزی حکومت میں قائم کیا جائے اور نہ نئے انتظام کے ماتحت جب تک صوبہ جات اپنے اپنے علاقہ کے انتظام کو نہ سنبھال لیں' مناسب ہی ہے کہ ایسا کیا جائے اس لئے اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک وقتی حکومت کے قانون کے ڈھانچہ کی بنیاد کن اصول پر رکھنی چاہئے۔ میرے نزدیک اس نظام کے بناتے ہوئے ہمیں مندرجہ ذیل اصول کو مدنظر رکھنا چاہئے:۔

(۱) ہم مرکزی حکومت کی بنیاد ایسے اصول پر رکھیں کہ بجائے اس کے کہ کسی وقت اسے بدل کر ایک نیا نظام اس کی جگہ قائم کرنا پڑے ہم اسی میں تغیر پیدا کرتے ہوئے اسے مکمل کر سکیں۔ کیونکہ جب کبھی ایک بالکل نیا نظام بنایا جاتا ہے تو اس میں کئی قسم کی خامیاں رہ جاتی ہیں جن کے دور کرنے میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے لیکن ایک نظام کو درجہ بدرجہ تبدیل کرتے ہوئے مکمل کرنے میں یہ خطرہ نہیں ہوتا۔

(۲) ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ جو نظام بھی قائم ہو اس کے ذریعہ سے ہندوستانیوں کی ایسی تربیت ہوتی جائے کہ جب بھی ان کے ہاتھ میں کام آئے تو وہ اسے سنبھال سکیں۔

(۳) ہمیں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس نظام میں یہ احتیاط کرلی جائے کہ وہ ہماری اصل سکیم کیلئے مددگار ثابت ہو۔

(۴) اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو مرکزی نظام میں ہندوستانیوں کے دخل کو موجودہ دخل سے کم کردے کیونکہ اس سے بھی فتنہ کا احتمال

ہے اور ڈر ہے کہ طبائع کی بے چینی مقصد کے پورا ہونے میں روک نہ بن جائے۔
ان اصول کے ماتحت عارضی مرکزی نظام کیلئے مندرجہ ذیل سکیم کا اختیار کرنا بہتر ہوگا۔

(۱) گورنر جنرل نو آبادی کے درجہ کی حکومتوں میں حکومت کا محور گورنر جنرل ہوتا ہے کیونکہ وہ ملکِ معظّم کا قائم مقام سمجھا جانے کی وجہ سے اس رشتہ اتحاد کی ظاہری کڑی ہوتا ہے جو برطانوی امپائر (EMPIRE) کے مفہوم میں مرکوز ہے۔ گورنر جنرل کی حیثیت ان نو آبادیات میں جو درمیانی مقام آزادی کے طے کر چکی ہیں کلی طور پر آئینی ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں چونکہ ابھی کچھ مدت تک کامل اختیارات مرکزی اسمبلی کو نہیں دیئے جا سکتے لازماً وہ محفوظ اختیارات ایگزیکٹو (EXECUTIVE) کو حاصل ہونگے اور بوجہ اس کے گورنر جنرل ایگزیکٹو کا سردار بھی ہوگا اور ملک معظم کا نمائندہ بھی، اس لئے اس کے نام سے وہ اختیارات برتے جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چونکہ وہ ہندوستان کے درجہ نو آبادی کے حصول کے ساتھ ہی ایک آئینی گورنر کی حیثیت میں بدل چکا ہوگا اس لئے میرے نزدیک گورنر جنرل کے اختیارات آئندہ تین قسم میں تقسیم ہونے چاہئیں۔

(۱) وہ اختیارات جو اسے مستقل طور پر حاصل ہونگے یعنی اس زمانہ میں بھی حاصل ہونگے جب کہ عملاً ہندوستان کی حکومت کا ہر حصہ درجہ مستعمرات کی آزادی کو حاصل کر چکا ہوگا۔ یہ اختیارات وہی ہوں گے جو دوسری نو آبادیوں کے گورنروں کو حاصل ہیں اور گورنر جنرل انہیں انہی قیود کے ساتھ استعمال کر سکے گا جن قیود کے ساتھ کہ نو آبادیوں کے گورنر انہیں استعمال کرتے ہیں۔

(۲) وہ اختیارات جو اسے عارضی طور پر حاصل ہونگے لیکن مرکزی اسمبلی کے برسرِ اقتدار ہونے پر وہ اس کی طرف منتقل ہو جائیں گے جیسے آرڈیننس (ORDINANCE) وغیرہ قسم کے اختیارات یا وزارت مقرر کرنے کے یا اس کے کاموں میں تصرف کرنے کے اختیارات۔

(۳) کوئی ایسے اختیارات جو صوبہ جاتی معاملات کے متعلق اس کے ہاتھ میں کچھ عرصہ کیلئے رکھے جائیں۔ یہ اختیارات جس وقت ختم ہونگے یا تو باطل ہو جائیں گے یا صوبہ جاتی کونسلوں کے پاس چلے جائیں گے اسمبلی کو حاصل نہیں ہونگے۔

اگر اس تقسیم کو مدنظر نہ رکھا گیا تو لازماً گورنر جنرل کے وقتی اختیارات اسمبلی کے طاقت

پکڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی نمائندہ وزارت کے ہاتھ میں چلے جائیں گے اور اتحادیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔

ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ آرڈیننس وغیرہ قسم کے اختیارات بربریت کی علامت ہیں انہیں یک دم مٹا دینا چاہئے لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ آئرلینڈ کی آزادی کے موقع پر وہ لوگ جنہوں نے انگلستان کے ساتھ سمجھوتے میں حصہ نہیں لیا تھا' انہوں نے اس خیال سے کہ اس طرح ان کے وقار کو صدمہ پہنچا ہے اس سمجھوتے کی قیمت کو کم کر کے دکھانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اور ملک میں ایسے فسادات پیدا کر دیئے تھے کہ جن کی مثال غالباً آزادی سے پہلے زمانہ میں بھی نہیں ملتی۔ ہندوستان میں بھی یہی صورت پیش آنے والی ہے۔ وہ لوگ جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مخالف ہیں' اگر انہوں نے دیکھا کہ کانفرنس کامیاب ہو گئی ہے تو اپنی عزت کو خطرہ میں دیکھ کر وہ ہر اک ممکن کوشش ملک میں فساد پیدا کرنے کی کریں گے اور جب تک غیر معمولی طاقت سے ان کا مقابلہ نہ کیا جائے گا' ان کا فتنہ فرو نہ ہو سکے گا۔ پس اس زمانہ تک کہ حکومت نو آبادیات کے اصول پر خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ جائے غیر معمولی حالات کے لئے غیر معمولی اختیارات کا گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے ورنہ خواہ کسقدر بڑا حصہ آزادی کا ہندوستان کو مل جائے اس کے دشمن اسے تباہ کر کے چھوڑیں گے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جس وقت سے برطانیہ نے ہندوستان کے لئے درجہ مستعمرات کا اعلان کیا' اسی وقت سے اس کے سیاسیین کا نقطۂ نگاہ بدل جائے گا اور وہ ایسے لوگوں کو ہندوستان کا گورنر جنرل کر کے بھیجیں گے کہ جو پوری طرح اسے درجہ مستعمرات کی طرف لے جانے والے ہونگے کیونکہ اس کے بعد خود اس کا فائدہ ہو گا کہ ہندوستان کی خوشنودی کو حاصل کرے۔

(۲) قانون ساز مجالس

اس وقت ہندوستان میں دو مجلسیں ہیں۔ ایک اسمبلی (ASSEMBLY) کہلاتی ہے اور دوسری کونسل آف سٹیٹ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کونسل آف سٹیٹ (COUNSIL OF STATE) تنفیذ کرنے اور قانون کے اسمبلی میں پاس ہونے اور نافذ ہونے کے درمیان کچھ دیر لگانے کا موجب ہو کر اس بات کا سامان مہیا کر دیتی ہے کہ اگر ملک کو قانون ناپسند ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھائی جا سکے لیکن اتحادی حکومت کے جو اصول ہیں ان کی حفاظت کا مقصد اس سے پورا نہیں ہوتا۔ اسی

طرح اسمبلی کی موجودہ صورت نہ تربیت کا موجب ہوتی ہے نہ ملک کی تسلی کا اس لئے ضرورت ہے کہ دونوں مجالس میں کچھ اصلاح کی جائے تاکہ وہ ان مقاصد کو پورا کر سکیں جن کے لئے انہیں قائم کیا گیا ہے۔

اسمبلی سائمن کمیشن کی رپورٹ ہے کہ (۱) اسمبلی آئندہ فیڈرل اسمبلی (FEDERAL ASSEMBLY) کہلائے۔ (۲) اس کے ممبروں کی تعداد اڑھائی سو سے دو سو اسّی تک بڑھا دی جائے۔ (۳) اس کے ممبروں کا انتخاب بجائے براہِ راست ہونے کے بالواسطہ ہو یعنی صوبہ جات کی کونسلوں کے ممبر اس کے ممبر منتخب کریں۔ خواہ اپنے ممبروں میں سے خواہ دوسرے لوگوں میں سے لیکن جس کو بھی وہ چُنیں وہ کونسل کا ووٹر ضرور ہو۔ (۴) ان کا انتخاب "نمائندگی بلحاظ تناسب" کے اصول پر ہو۔ جس کی وجہ سے ہر اقلیت کو اس کا حق مل جائے گا۔ (۵) اگر کونسل کا کوئی ممبر اسمبلی کے لئے ممبر چُنا جائے تو ضروری نہیں ہو گا کہ وہ کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے۔ اگر کونسل کے ساتھ اسمبلی میں بھی کام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ (۶) ممبروں کے اخراجات صوبہ جات کے ہی ذمہ ڈالے جائیں گے۔

اس تبدیلی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ:۔

(۱) اسمبلی کے ممبروں کی تعداد کو بڑھانے کے باوجود ان کا حلقہ انتخاب بہت بڑا ہو گا اس وجہ سے ممبر اپنے ووٹروں سے تعلق نہیں رکھ سکے گا۔

(۲) اتحادی اصول پر حکومت کی بنیاد رکھنے کی وجہ سے ضروری ہے کہ صوبہ جات کی نمائندگی مرکز میں بہ حیثیت علاقہ کے ہو۔

(۳) عام ہندوستانی مرکزی کاموں کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ جب اسمبلی کے ممبروں کو کونسل کے ممبر منتخب کریں گے جو زیادہ سمجھدار اور پڑھے لکھے ہوتے ہیں تو اسمبلی کے ممبروں کو خیال رہے گا کہ ہمارے کام کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

اسمبلی کا نام فیڈرل اسمبلی ہو تو اچھا ہے کیونکہ اس سے اسمبلی کے ممبروں کو یہ خیال رہے گا کہ آئندہ ہندوستان کی حکومت اتحادی اصول پر چلائی جائے گی۔ ممبروں کی تعداد کا بڑھانا بھی ضروری ہے اور میرے نزدیک دو سو اسّی (۲۸۰) بھی نہیں تین سو ممبر ہونے چاہئیں بلکہ اگر اس سے بھی بڑھا دیئے جائیں تو کچھ حرج نہیں۔ ہندوستان سے بہت چھوٹے ممالک کی قانون ساز مجالس کے بہت زیادہ ممبر ہوتے ہیں۔ پس جس قدر زیادہ ممبر کام کی سہولت کو مد نظر

رکھتے ہوئے بنائے جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ لیکن اگر چار پانچ سو ممبر سردست بنانے مناسب نہ سمجھے جائیں تو تین ساڑھے تین سو ممبر ضرور ہونے چاہئیں اس سے کم تعداد سے ٹھیک طرح سے ملک کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔

سائمن کمیشن کی یہ تجویز ہے کہ اسمبلی کے ممبروں کی تنخواہیں صوبہ جات کے بجٹ سے دی جائیں میرے نزدیک کسی طرح بھی مناسب نہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ طریق دوسرے ملکوں میں رائج نہیں ہے کہ فیڈرل اخراجات صوبہ جات ادا کریں۔ گو ان کے اخراجات کو کمیشن نے نان ووٹیبل (NON VOTABLE) رکھا ہے لیکن پھر بھی یہ احساس کہ فیڈرل اسمبلی کے اخراجات مرکز ادا نہیں کرتا بلکہ صوبہ جات ادا کرتے ہیں ان کے درجہ میں تخفیف کر دیتا ہے اور یوں بھی یہی بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ جس جگہ کا کام کیا جائے وہیں سے تنخواہ ملے۔ جب مرکزی ایگزیکٹو کو مرکز کے بجٹ سے تنخواہ ملے گی تو کیوں مجلس واضع قوانین کے اخراجات مرکزی فنڈ سے نہ ملیں۔

اب میں اس سوال کو جو سب سے اہم ہے لیتا ہوں یعنی اسمبلی کے ممبروں کا بالواسطہ طریق سے انتخاب۔ بعض لوگ اس طریق انتخاب کو دنیا کے مقررہ اصول سے بالکل نرالا دیکھ کر جب حیران رہ جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ طریق محض اس وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ چونکہ کمیشن نے انگریز ممبروں کی نمائندگی ان کی تعداد سے تین سو گُنا زیادہ مقرر کی ہے اور اس قدر قلیل جماعت اپنے میں سے اس قدر ممبر مہیا نہیں کر سکتی کہ وہ دونوں جگہ کام کریں اس لئے کمیشن نے اس طریق کو ایجاد کیا ہے تا ایسا نہ ہو کہ انگریز ممبر اپنی نمائندگی کے برابر ممبر بھی مہیا نہ کر سکیں اس طرح ایک ہی جماعت کو دونوں جگہ کام کرنے کی اجازت دے کر کمیشن نے اس مشکل کو دور کیا ہے۔ میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ ہم کسی شخص کی طرف اپنے پاس سے محرکات بنا کر منسوب کریں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عجیب طریق نہ صرف بالکل خلاف عقل ہے بلکہ دنیا کے تجربہ کے بھی خلاف ہے اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں دیئے گئے ہیں سب نہایت کمزور اور بودے ہیں۔

پہلی دلیل جو کمیشن نے دی ہے یہ ہے کہ بِلاواسطہ انتخاب کی صورت میں حلقہ انتخاب اس قدر بڑا ہو جاتا ہے کہ ممبر اپنے منتخب کرنے والوں سے تعلق نہیں رکھ سکتے اور انتخاب میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسمبلی کے حلقے بڑے ہیں اور اس میں بھی

کوئی شک نہیں کہ اتنے بڑے حلقوں میں کوشش کرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ بڑے ملک کے بڑے ہی حلقے ہو سکتے ہیں اور محض بڑے حلقوں کی وجہ سے لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کمیشن کو صرف انگلستان کے حلقوں کو نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ دوسرے بڑے بڑے ملکوں کے انتخاب کے حلقوں کو دیکھنا چاہئے۔ مثلاً آسٹریلین کامن ویلتھ (AUSTRALIAN COMMON WEALTH) کا رقبہ انیس لاکھ چوہتر ہزار پانچ سَو اکاسی مربع میل ہے اور آبادی چوّن لاکھ پینتیس ہزار ہے۔ اس کی مجلس میں بہتر (۷۲) ممبر ہیں اور سینٹ میں چھتیس (۳۶)۔ گویا اسمبلی کا ہر ممبر اوسطاً ستائیس ہزار نو سَو اسّی میل رقبہ کی طرف سے اور پچھتّر ہزار آدمیوں کی طرف سے اور سینٹ کا ہر ممبر پچپن ہزار مربع میل اور ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کی طرف سے ممبر ہوتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کا ملک تیس لاکھ چھبیس ہزار نَو سَو اناسی مربع میل ہے اور اس کی آبادی ساڑھے دس کروڑ ہے۔ ہاؤس آف ریپریزنٹیٹوز (HOUSE OF REPRESENTATIVES) کے ممبر چار سو پینتیس ہیں اور سینٹ کے چھیانوے۔ گویا ہر پہلی مجلس کا ممبر قریباً سات ہزار میل مربع کی طرف سے اور ایک لاکھ چوہتّر ہزار آدمیوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور ہر سینٹر قریباً تیس ہزار میل کی طرف سے اور قریباً تیس لاکھ آدمیوں کی طرف سے نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کا کُل رقبہ اٹھارہ لاکھ پانچ ہزار مربع میل ہے جس میں ریاستوں اور ایجنسیوں کا رقبہ نکال کر کُل رقبہ دس لاکھ اکتالیس ہزار مربع میل رہ جاتا ہے۔ اور ریاستوں کی آبادی منہا کر کے انگریزی علاقہ کی آبادی چوبیس کروڑ چھیاسٹھ لاکھ ہے۔ لیکن برما کو چونکہ ہندوستان سے علیحدہ کرنے کی تجویز ہے اس کا دو لاکھ تیس ہزار مربع میل رقبہ اور ایک کروڑ اکتیس لاکھ آبادی نکال کر ہندوستان کا رقبہ آٹھ لاکھ گیارہ ہزار مربع میل رہ جائے گا اور آبادی تئیس کروڑ پینتیس لاکھ رہ جائے گی۔ اب اگر ہندوستان کی اسمبلی کے تین سَو ممبر فرض کئے جائیں تو فی ممبر قریباً دو ہزار سات سو مربع میل رقبہ کی طرف سے اور سات لاکھ اٹھتر ہزار تین سَو تینتیس آدمیوں کی طرف سے نمائندہ ہو گا۔ گویا ہر ممبر یونائیٹڈ سٹیٹس کے ہر ممبر کے مقابلہ میں صرف تیسرے حصہ رقبہ کی طرف سے اور آسٹریلیا کے ہر ممبر سے دسویں حصہ رقبہ کی طرف سے نمائندہ ہو گا۔ لیکن آبادی کے لحاظ سے اسمبلی کا ہر ممبر یونائیٹڈ سٹیٹس کے ممبر کی نسبت چار گُنی تعداد کا نمائندہ اور آسٹریلین ممبر کے مقابلہ میں دس گُنے زیادہ تعداد کا نمائندہ ہو گا۔ پس علاقہ کے لحاظ سے

یونائیٹڈ سٹیٹس اور آسٹریلیا کا ممبر زیادہ وسیع علاقہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا ممبر زیادہ لوگوں کا نمائندہ ہو گا۔ مگر یہ امر ظاہر ہے کہ اصل تکلیف رقبہ کے بڑا ہونے میں ہوتی ہے ورنہ نہ ہر ممبر ہر ووٹر کے پاس جاتا ہے نہ جا سکتا ہے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ وہ اس علاقہ کے نمائندوں سے تعلق رکھ سکے اور یہ ظاہر ہے کہ جس قدر رقبہ چھوٹا ہو گا ممبر اس میں جلدی پھر سکے گا اور اس میں ہندوستانی ممبر یونائیٹڈ سٹیٹس اور آسٹریلیا کے ممبر سے فائدہ میں رہے گا۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کمیشن کے نزدیک موجودہ انتظام میں اس لئے تغیر کی ضرورت ہے کہ ممبر اپنے علاقہ کے لوگوں سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ تعلق نہیں رکھ سکتا تو اس وقت اسے ووٹ کیونکر ملتے ہیں۔ تب تو چاہئے تھا کہ دور کے علاقے اسے ووٹ نہ دیتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر امیدوار کو ہر جگہ کے ووٹ مل جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ اس کا علاقہ کے سرکردہ لوگوں کی امداد حاصل کرنا ہے اور یہی صحیح جواب ہے۔ لیکن اس صورت میں بِالواسطہ انتخاب کا مخالف کہہ سکتا ہے کہ جن لوگوں کی وہ امداد حاصل کرتا ہے بہرحال ان سے تو وہ تعلق پیدا کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ پس کیا ہزار یا دو ہزار آدمی سے جو ملک کے باا‌ثر لوگ ہیں اور جن کے پیچھے ملک کے ووٹر چلتے ہیں تعلق رکھنے والا شخص اس سے بہتر نہیں جو صرف کونسل کے دس یا پندرہ ممبروں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ عام طور پر نمائندہ اسی علاقہ کا رہنے والا ہوتا ہے جس کا وہ باشندہ ہوتا ہے اور ضرور ایک کافی تعداد ووٹروں کی اس کی واقف بھی ہوتی ہے اور اُن سے ملنے کا اسے موقع بھی ملتا رہتا ہے لیکن کونسل کا چُنا ہوا نمائندہ اگر کونسل کے ممبروں میں سے نہ ہوا تو اسے ان سے ملتے رہنے کا کون سا موقع ملے گا۔ امرتسر کا نمائندہ امرتسر کے ووٹروں سے تو روزانہ ملنے کا موقع پاتا رہے گا۔ لیکن لاہور میں بیٹھنے والی کونسل کے ممبروں سے دہلی اور شملہ میں کام کرتے ہوئے اسے ملنے کا کونسا موقع مل سکتا ہے۔ اسی طرح مثلاً ملتان کا ممبر سارے ضلع میں تو نہیں پھرتا رہے گا لیکن ملتان شہر کے ووٹروں سے اسے روزانہ ہی ملنے کا موقع ملے گا اور ضلع کے لوگ بھی وہاں کام کے لئے آتے رہیں گے ان سے بھی وہ ملتا رہے گا۔ لیکن کونسل کے جن ممبروں نے اسے منتخب کیا ہو گا ان سے ملنے کا اسے بعض دفعہ سال میں ایک دفعہ بھی موقع نہیں ملے گا اور بالکل ممکن ہے کہ اسمبلی کی ساری عمر میں ہی موقع نہ ملے۔ پنجاب کے ممبر کو تو

شاید شملہ میں کہ جہاں دونوں مجلسیں جمع ہوتی ہیں موقع مل بھی جائے لیکن دوسرے صوبوں کے ممبروں کو دہلی اور شملہ میں کام کرتے ہوئے اپنی مقامی کونسلوں کے ممبروں سے ملنے کا کوئی موقع ہی نہیں ہو سکتا۔

غرض جو دلیل کمیشن نے تعلقات کے متعلق دی ہے وہ اس کے خلاف ہے' مؤیّد نہیں۔ بِلاواسطہ انتخاب سے اسمبلی کے ممبر کا اپنے علاقہ سے بھی کوئی تعلق نہیں رہے گا اور کونسل سے بھی ہرگز تعلق پیدا نہ ہو گا۔

دوسری دلیل کمیشن نے یہ دی ہے کہ جب حکومت اتحادی اصول پر ہو تو علاقوں کے لحاظ سے نمائندگی ضروری ہوتی ہے تا کہ اتحادیت کے اصول کی حفاظت ہو سکے۔ یہ دلیل بے شک وقیع ہے۔ اتحادی اصول کی نگرانی کرنے والے لوگ مرکز میں ضرور موجود رہنے چاہئیں لیکن اس کا وہ طریق جو کمیشن نے ایجاد کیا ہے کہیں بھی جاری نہیں ہے۔ دنیا کی تمام پہلی مجالس ملک کے نمائندوں کی طرف سے چُنی جاتی ہیں کوئی فیڈریشن ایسی نہیں کہ جس کی پہلی اسمبلی کے نمائندے صوبہ جات کی طرف سے آتے ہوں۔ ہاں دوسری مجلس کے ممبر یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ میں ۱۹۱۳ء تک ریاستوں کی مجالس کی طرف سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ اور سوئٹزرلینڈ کی بعض کنٹنز (CANTONS) میں اب بھی بجائے بِلاواسطہ کے بِالواسطہ انتخاب ہوتا ہے مگر صرف دوسری مجلس کے لئے، پہلی مجلس کے لئے نہیں۔ لیکن کمیشن یہ مشورہ دیتا ہے کہ دنیا کے دستور کے خلاف پہلی مجلس کو علاقوں کا نمائندہ بنایا جائے۔ حالانکہ اتحادی حکومت کا اصول یہ ہے کہ مرکز میں دونوں حصوں کے نمائندے ہونے چاہئیں علاقوں کے بھی۔ اور افرادِ ملک کے بھی اور اس کا صرف ایک ہی طریق دنیا میں اختیار کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ پہلی مجلس کو جو زیادہ اختیار رکھتی ہے افراد کا نمائندہ بنایا جاتا ہے اور دوسری مجلس کو جو کم اختیارات رکھتی ہے علاقوں کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی یہ وجہ ہے کہ اصل حکومت کا حق افراد کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے اور علاقوں کو صرف اقلیتوں کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے اس لئے دوسری مجلس کے اختیارات حفاظتی تدابیر تک محدود رکھے جاتے ہیں اور پہلی مجلس کو اصل قانون ساز مجلس سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کمیشن تمام اصول سیاست تمام اصول انصاف اور تمام دنیا کے تجربوں کے خلاف یہ عجیب مشورہ دیتا ہے کہ اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ دونوں کا انتخاب صوبہ جات کی کونسلیں کریں۔ جب ایک ہی منتخب کرنے والے ہونگے تو دو قسم کی

مجالس کا فائدہ کیا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ کمیشن اس امر کی بھی امید رکھتا ہے کہ کونسل آف سٹیٹ میں زیادہ قابلیت کے آدمی مثلاً سابق وزراء، سابق جج، اعلیٰ عہدہ دار وغیرہ لانے چاہئیں اور وہ اس طرح کہ اس کی ممبری کی شرائط ایسی رکھی جائیں کہ اسی قسم کے لوگ آسکیں۔ لیکن کمیشن نے اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ صرف ایک ہی کونسل آف سٹیٹ دنیا میں ایسی ہے کہ جس کے ووٹر اور اسمبلی کے ووٹر ایک ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دوسری مجلس اپنے مقصد کے پورا کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے اور وہ آسٹریلیا کی دوسری مجلس ہے۔ لیکن چونکہ اختیارات اور فائدہ پہلی مجلس میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے آسٹریلیا کے تمام قابل لوگ اسی کی ممبری کی کوشش کرتے ہیں۔ باقی سب دنیا کی مجالس میں دونوں مجلسوں کے ووٹروں کی قابلیتیں الگ الگ رکھی جاتی ہیں یا دوسری مجالس کو بعض خاص اختیارات دیئے جاتے ہیں کہ تا قابل لوگ ادھر متوجہ ہوں۔ مگر جہاں یہ دونوں صورتیں نہ ہوں وہاں یہ امید کرنا کہ قابل امیدوار کام کا اچھا میدان چھوڑ کر اور اسمبلی کے امیدواروں کے برابر تکلیف اٹھا کر کونسل آف سٹیٹ میں جائیں گے ایک ایسی خلاف عقل بات ہے جسے کوئی عقل مند تسلیم نہیں کر سکتا اور کمیشن کے تجویز کردہ اصل پر اگر کام ہوا تو ہندوستان کی کونسل آف سٹیٹ میں وہی لوگ جائیں گے جو یا تو اسمبلی کے انتخاب سے مایوس ہو چکے ہوں گے یا جن کی غرض صرف کسی نہ کسی ملکی مجلس کا ممبر کہلانا ہوگی۔

سائمن کمیشن نے اس امر کو بھی بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ دنیا کے تجربہ کردہ سیاسی اصول کے مطابق اتحادی طرز کی حکومت کے مرکز میں صرف علاقوں کے نمائندے نہیں ہونے چاہئیں بلکہ افراد اور علاقوں دونوں کے نمائندے ہونے چاہئیں کیونکہ مرکزی حکومت کا کام صرف ایسے قوانین پاس کرنا نہیں جن کا تعلق علاقوں سے ہو بلکہ وہ ایسے قوانین بھی پاس کرتی ہے جو افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پس دونوں کے نمائندے اس میں ہونے چاہئیں تا کہ دونوں کے حقوق محفوظ رہیں۔ لیکن کمیشن نے افراد کی نمائندگی کو بالکل اڑا دیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قابل وقعت نظام میں نہیں ملتی اور اس امر کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ ایک لمبے تجربہ کے بعد یونائیٹڈ سٹیٹس میں ۳۱۔ مئی ۱۹۱۳ء کو سترھویں اصلاح کے ذریعہ سے دوسری مجلس کے انتخاب بھی براہ راست کر دیئے گئے ہیں۔ پس جب کہ دوسری دنیا تجربہ کے بعد دوسری مجالس کے انتخاب بھی بلاواسطہ کر رہی ہے سائمن کمیشن ہندوستان کے لئے دونوں

مجالس کے انتخاب بالواسطہ تجویز کرتا ہے۔

تیسری دلیل کمیشن نے یہ دی ہے کہ عام ہندوستانی اسمبلی کے کاموں کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ لیکن جب کونسل کے ممبر ہی اسمبلی کے ممبروں کو منتخب کریں گے تو انہیں خیال رہے گا کہ ہماری بھی کوئی نگرانی کر رہا ہے۔ یہ دلیل بھی اوپر کی دلیلوں کی طرح کمزور ہے کیونکہ کونسلوں کے ذریعہ سے انتخاب کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نگرانی اور بھی کم رہ جائے گی کیونکہ کونسلوں میں منتخب ہونے والوں کا نقطہ نگاہ بالکل اور ہوتا ہے اور اسمبلی میں منتخب ہونے والوں کا اور۔ کونسلوں کے ممبروں سے بہت زیادہ نگرانی وہ لوگ کر سکتے ہیں کہ جن کو مرکزی امور سے دلچسپی ہو۔ چنانچہ اس کا روزانہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ اسمبلی میں پیش ہونے والے معاملات کی طرف جب کہ کونسلوں کے ممبروں کو کچھ بھی توجہ نہیں ہوتی عام پبلک میں سے ایک طبقہ میں اس کے متعلق ہیجان پیدا ہو رہا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ **پروپورشنل ریپریزنٹیشن** سسٹم (PROPORTIONAL REPRESENTATION SYSTEM) کے مطابق وہی قوم اپنے نمائندے بھیج سکتی ہے جس کے امیدوار اس کے ووٹوں کے مطابق کھڑے ہوں۔ اگر ووٹر زیادہ ہو جائیں تو اس قوم کی نمائندگی کم ہو جاتی ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ پنجاب کونسل سے نمائندے چُنے جانے لگے ہیں اور فرض کرتے ہیں کہ اسمبلی کے لئے کُل تیس ممبروں کا انتخاب صوبہ کی طرف سے ہونا ہے۔ پس بوجہ مسلمانوں کی آبادی پچپن فیصدی ہونے کے ان کے حصہ میں سولہ ممبریاں آنی چاہئیں لیکن مسلمانوں میں سے کچھ "زمیندار پارٹی" میں ہیں اور کچھ "نیشنل پارٹی" میں جس میں ہندو ممبروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اب یہ انتخاب کس اصول پر ہو گا۔ کیا مسلمان مسلمان کو ووٹ دیں گے یا اپنی پارٹی کے ساتھ ووٹ دیں گے۔ اگر پارٹی کے ساتھ دیں گے تو مسلمان نمائندوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور اگر اپنی پارٹی کے مخالف امیدوار کو دیں گے کیونکہ وہ مسلمان ہے تو ایک تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے ہم بجائے سیاسی اصول کی قیمت بڑھانے کے اس کی قیمت کو کم کر دیں گے کیونکہ محض اس خوف سے کہ میرے ہم مذہبوں کے نمائندے کم نہ ہو جائیں ایک شخص اپنے سیاسی خیالات کو قربان کر دینے پر مجبور ہو گا۔ دوسرے اس طریق سے چنے ہوئے اسمبلی کے ممبر کی نگرانی بالکل نہ رہے گی۔ کیونکہ جس امیدوار کو اس کے مخالف الخیال

شخص نے صرف اس کے مذہب کی وجہ سے ووٹ دیا ہو گا وہ اس کی نگرانی کیونکر کر سکے گا۔ اسے تو امیدوار جواب دے گا کہ میاں تم نے اپنے ہم مذہب کے نمائندوں کی تعداد پوری کرنے کے لئے ووٹ دیا تھا میں نے کب تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری پالیسی کی اتباع کروں گا۔ لیکن جو شخص جُداگانہ انتخاب میں اپنے ہم مذہب کے مقابلہ میں جیتے گا اس کے ووٹر اس سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ کیوں ان کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرتا۔ پس کمیشن کی تجویز پر عمل کر کے نگرانی ہرگز نہیں بڑھے گی بلکہ کم ہو گی۔

کمیشن کے دلائل کو رد کرنے کے بعد میں چند اور دلائل دیتا ہوں۔ جن کی بناء پر میرے نزدیک بِالواسطہ انتخاب کا طریق نہایت خطرناک ہے اور خصوصاً مسلمانوں کے فوائد کے تو بالکل ہی خلاف ہے۔

(۱) سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں سے حکومت کا وعدہ ہے کہ ان کی مرضی کے بغیر مخلوط انتخاب کو جاری نہیں کیا جائے گا اور اس وعدہ میں ہرگز کوئی شرط نہیں ہے کہ کونسلوں میں ان کو یہ حق ہو گا اسمبلی میں نہیں ہو گا۔ پس "انتخاب مطابق تعداد" جس کے معنی مخلوط انتخاب کے ہیں کسی صورت میں بھی مسلمانوں کی مرضی کے برخلاف جاری نہیں کیا جا سکتا اور اگر مسلمانوں کے نمائندے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اس کو تسلیم بھی کر آئے تب بھی مسلمان پبلک اس کو ہرگز نہیں مانے گی۔ کیونکہ وہ بحیثیت جماعت اس اصل کو فوراً جاری کرنے کے سخت مخالف ہے اور اگر سائمن رپورٹ کی اس تجویز کی وہ مخالفت نہیں ہوئی جو نہرو رپورٹ کی ہوئی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عام طور پر مسلمان اس طریق انتخاب کو سمجھتے نہیں۔ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ممبر مسلمان امیدواروں کو ووٹ دیں گے اور ہندو ہندوؤں کو۔ لیکن جس وقت مسلمان پبلک کو یہ معلوم ہوا جیسا کہ اب میری کتاب کے شائع ہونے پر ہو جائے گا کہ اس انتخاب کے معنی مخلوط انتخاب کے ہیں تو مسلمان ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی مخالفت کریں گے اور اس میں کیا شک ہے کہ اسمبلی میں مخلوط انتخاب کا دروازہ کھول کر مسلمان کونسلوں میں بھی اپنے اس حق کو اصولاً کھو بیٹھتے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے مخلوط انتخاب میں وہ نقائص نہیں ہیں کہ جو عام مخلوط انتخاب میں ہیں کیونکہ اس میں ہر مذہب کے افراد مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے آدمیوں کو ووٹ دیں ورنہ ان کے اپنے ممبر کم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ جواب درست نہیں کیونکہ اس

طریقِ انتخاب کی رو سے بھی دوسری پارٹی کو کمزور کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس طریق انتخاب میں کسی جماعت کے عدد میں جو زائد کسر ہو اس کی امداد سے وہ دوسرے مذہب کے بعض اپنے زیر اثر آدمیوں کو ممبر کروا سکتے ہیں۔ اس طرح ان کی کسر بالواسطہ طور پر ان کے کام آجائے گی اور دوسرے مذہب کی نمائندگی کمزور ہو جائے گی۔ پس یہ درست نہیں کہ اس صورت میں مسلمان کو خطرہ نہیں اس میں بھی ویسے ہی خطرات ہیں جیسے کہ عام مخلوط انتخاب میں۔

علاوہ ازیں جہاں مسلمان بہت کم ہیں وہاں اس اصول کے ماتحت ان کے حقوق انہیں نہیں مل سکیں گے۔ مثلاً صوبہ جات وسطی میں مسلمانوں کی آبادی کل چار فیصدی ہے۔ گو ان کے ممبروں کی تعداد ۹۶۰ہ ہے۔ اب اگر فرض کر لیا جائے کہ اس صوبہ سے دس ممبر مرکزی انجمن کے لئے چُنے جائیں گے تو اس صوبہ سے ایک بھی مسلمان نہیں چُنا جا سکے گا۔ اسی طرح اور کئی جگہ پر تھوڑی تھوڑی کسر کی وجہ سے مسلمانوں کا سالم ممبر جاتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا کیونکہ اسی بنیاد پر تو مخلوط انتخاب ہندو مانگ رہے ہیں کہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، زیادہ مالدار ہیں، زیادہ تجربہ کار ہیں اور مسلمان ان کے مقروض ہونے کے سبب سے بہت کچھ ان کے زیر اثر رہتے ہیں۔ پس یہ امید کرنا کہ اس مخلوط انتخاب سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچے گا درست نہیں بلکہ یہ یقینی بات ہے کہ ہندو مالی دباؤ سے بھی اور مسلمانوں کو پھاڑ کر بھی اسلامی نمائندگی کو کم کر دیں گے۔ یا پھر ایسے لوگوں کو نمائندہ بنائیں گے جو صحیح معنوں میں مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہونگے۔ میں نے پنجاب کونسل کے بعض ممبروں سے سنا ہے کہ یہ طریق اچھا ہے اس سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تجربہ کیا ہے کہ اس ذریعہ سے ہمارا حق مل جایا کرتا ہے۔ لیکن اس امر کی موجودگی میں کہ سائمن کمیشن کے ساتھ بیٹھنے کے لئے جو صوبہ کی کمیٹی اسی اصل کے مطابق چُنی گئی تھی اس میں دو مسلمان، تین ہندو اور ایک سکھ اور ایک انگریز چُنا گیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ذریعہ کامیاب ہے۔ نیز مسلمانوں کا تجربہ پنجاب میں مذہب کی بناء پر نمائندگی کا نہیں ہے بلکہ زمیندار پارٹی کے لحاظ سے ہے اور اس میں شک نہیں کہ پارٹیوں کو ایک حد تک اپنی تعداد کے مطابق "انتخاب مطابق تعداد" کے اصول پر ان کا حق مل جاتا ہے۔ لیکن مذہب کی بناء پر جس قوم کو نمائندگی کا دعویٰ ہو اس کا حق محفوظ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک مذہب

کے آدمی ضروری نہیں کہ سیاسی طور پر بھی ایک ہی خیال کے ہوں۔ اور جب سیاسی اختلاف ہو تو یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ انسان صرف اس وجہ سے ایک امیدوار کو ووٹ دے کہ وہ اس کا ہم مذہب ہے۔

دوسری دلیل اس طریق نمائندگی کے خلاف یہ ہے کہ اس سے حلقہ انتخاب بہت محدود ہو جاتا ہے یعنی مختلف صوبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سو سے تین سو تک ممبر ہونگے جو اسمبلی کے نمائندے چنیں گے اور اس قدر قلیل تعداد ووٹروں کی ہو تو دوستیاں بھی اور رشوتیں بھی بہت اثر کرتی ہیں۔ پس یہ طریق انتخاب اخلاقی بگاڑ کا زیادہ موجب ہو گا۔ جب حلقہ وسیع ہو' تب بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن نہ کوئی انسان ہزاروں آدمیوں سے دوستانہ طور پر ووٹ لے سکتا ہے اور نہ ان کو لالچ دے سکتا ہے۔

تیسرے کونسلوں اور اسمبلی کے فرائض بالکل جُداگانہ ہونگے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی شخص کے ذریعہ سے دونوں امور کا ملک خیال رکھ سکے نتیجہ یہ ہو گا کہ اسمبلی کبھی بھی ملک کی صحیح نمائندہ نہیں ہوگی۔ یہ امر بالکل عقل میں نہیں آسکتا کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں مقامی اور مرکزی دونوں مجالس کی ضروریات کو ملک کے سامنے پیش کر سکے گا اور وہ کر بھی کب سکتا ہے جب کہ وہ خود دوسری مجلس کا امیدوار ہی نہیں۔ اور اگر کوئی امیدوار ہو بھی تو بھی وہ بسا اوقات اپنے خیالات اسمبلی کے کام کے متعلق ظاہر نہیں کر سکے گا کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس کے خیالات مقامی کونسل کے کاموں کے متعلق تو اپنے علاقہ کے اکثر ووٹروں سے متفق ہوں لیکن اسمبلی کے معاملات کے متعلق مختلف ہوں۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے کہ وہ اپنے اس اختلاف کو ظاہر کر کے اپنے انتخاب کے مواقع کو خراب کر لے گا؟ اور اگر وہ ظاہر بھی کرے تو اکثر ووٹر ایسے ہوں گے کہ اگر مقامی اور مرکزی سوالوں کا مقابلہ آ پڑے تو وہ مقامی سوال کو ترجیح دیں گے۔ پس اگر ایک مقامی کونسل کا مناسب امیدوار مرکزی امور میں خلاف رائے بھی رکھتا ہو تب بھی بہت سے ووٹر مقامی معاملات کے اتحاد کی وجہ سے اسی کے حق میں رائے دیں گے اور اس طرح اسمبلی ملک کی نمائندگی سے بالکل محروم رہ جائے گی اور صرف اس وجہ سے کہ مقامی کونسلوں کے ممبر اس کے ممبروں کا انتخاب کریں گے اسے ملک کا نمائندہ کہنا درست نہ ہو گا۔ اور کوئی شخص جو سیاسیات کے مبادی سے بھی واقف ہے اس طرح منتخب ہونے والی اسمبلی کو ملک کی نمائندہ اسمبلی نہیں کہہ سکے گا۔ ہندوستان تو ابھی تعلیم میں بہت پیچھے

ہے مہذب ملکوں کا ابھی تک یہ حال ہے کہ لوکل معاملات کو لوگ مقدم رکھتے ہیں۔ چنانچہ میرے سفر انگلستان کے موقع پر ایک با اثر کانسر ویٹو ممبر پارلیمنٹ (CONSERVATIVE MEMBER PARLIAMENT) نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے یہاں اس قدر اس شخص کے سیاسی خیالوں کو نہیں دیکھا جاتا جس قدر اس امر کو کہ اس نے اپنے حلقہ انتخاب کے لوگوں کے لئے کیا کیا ہے۔ اگر کوئی اپنے حلقہ کے لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوا ہو تو پھر بہت سے لوگ جو سیاسی اصول کی طرف سے بے پرواہ ہوتے ہیں اسے ووٹ دے دیتے ہیں۔ پس جب اس ملک میں جس میں اس قدر عرصہ سے نمائندہ حکومت چلی آ رہی ہے لوگوں کا یہ حال ہے تو ہندوستان کا کیا حال ہو گا۔

چوتھا نقص اس طریق انتخاب سے یہ پیدا ہو گا کہ چونکہ کونسلوں کے ممبروں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے ممبروں کو بھی اسمبلی کے لئے چُن سکتے ہیں اور ایسے چنے ہوئے ممبر چاہیں تو دونوں مجالس کے ممبر رہ سکتے ہیں اکثر ایسا ہی ہو گا کہ ممبر آپس میں ہی ایک دوسرے کو اسمبلی کے لئے چُن لیں گے اور پھر وہ دونوں عزتوں کو جمع رکھنے کے لئے دونوں ہی مجالس کے ممبر رہیں گے۔ جس سے یہ نقص پیدا ہو جائے گا کہ تمام حکومت دھڑا بندی کے اثر کے نیچے آ جائے گی اور لانگ پارلیمنٹ (LONG PARLIAMENT) کے ممبروں کی طرح ملک کا سب اختیار ایک خاص پارٹی کے قبضہ میں آ جائے گا۔ اور پھر ایک ہی وقت اگر اجلاس ہونگے اور ضرور اکثر اوقات ایسا ہی ہو گا تو دونوں مجالس یعنی صوبوں کی اور مرکزی، نقصان اٹھائیں گی کیونکہ نہ ممبر اس طرف توجہ دے سکیں گے اور نہ اُس طرف۔ اگر یہ شرط بھی کر دی جائے کہ جو صوبہ کی کونسل کا ممبر اسمبلی کے لئے چُنا جائے وہ کونسل سے استعفیٰ دے دے تو پھر ہر انتخاب کے موقع پر فوراً ہی ایک معقول تعداد کے حلقوں میں ان لوگوں کی جگہ پُر کرنے کے لئے دوبارہ انتخاب کرنا پڑے گا جسے لوگ قدرتاً ناپسند کرتے ہیں۔

غرض یہ طریق انتخاب نہ صرف خلاف عقل ہے اور اصول سیاست کے مخالف ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور ملک کے لئے عموماً سخت مضر ہے۔ اس سے مرکزی حکومت بھی بہت کمزور ہو جائے گی اور یقیناً درجہ نو آبادیات کے حصول میں دیر واقع ہو گی۔ پس اسمبلی کا انتخاب براہِ راست پبلک کی طرف سے ہونا چاہئے اور اس میں مسلمانوں کا حق جُداگانہ انتخاب کا قائم رہنا چاہئے۔

میں اس موقع پر یہ امر بھی بیان کرنے سے نہیں رہ سکتا کہ اسمبلی میں مقامی کونسلوں کی نمائندگی کی تجویز سب سے پہلے میری طرف سے ہی سائمن کمیشن کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ چنانچہ احمدیہ جماعت کی طرف سے جو میمورنڈم (MEMORANDUM) سائمن کمیشن کو بھیجا گیا تھا اس کے یہ الفاظ ہیں۔

"علاوہ ازیں ہماری رائے میں یہ مناسب ہے کہ صوبہ جاتی کونسلوں کو مرکزی مجالس میں نیابت حاصل ہو کیونکہ اس سے فیڈریشن کے صحیح نشوونما میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سے یقیناً صوبہ جاتی کونسلوں اور مرکزی اسمبلی میں زیادہ رابطہ و اتحاد پیدا ہو جائے گا جو دونوں کے لئے مفید ہو گا۔" [۶۴]

میری اس رائے کو پنجاب سائمن کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں شامل کر لیا۔ پس اس خیال کا بانی میں ہی ہوں لیکن باوجود اس کے میں سائمن کمیشن کی سفارش کا مخالف ہوں۔ اس لئے کہ میری سفارش اس اصل پر مبنی تھی کہ:۔

(۱) کونسل آف سٹیٹ کی موجودہ شکل بے اصول ہے اس کو توڑ دیا جائے اور اس کی جگہ اسمبلی میں ایک حد تک کونسلوں کو نمائندگی دے کر دونوں ضرورتیں اسمبلی میں پوری کر لی جائیں۔

(۲) سب ممبر نہیں بلکہ کچھ ممبر کونسلوں سے لئے جائیں۔ باقی براہ راست منتخب ہوں۔ پس میری سفارش سیاسی اصول پر مبنی تھی لیکن سائمن کمیشن کی سفارش کسی اصل پر مبنی نہیں۔ اس نے کونسل آف سٹیٹ کو بھی قائم رکھا ہے اور اسمبلی کے قریباً سب ممبر کونسلوں سے بھیجنے کی سفارش کی ہے۔

کونسل آف سٹیٹ

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کونسل آف سٹیٹ کی موجودہ شکل بالکل غیر اصولی ہے۔ اس کا کوئی خاص کام نہیں جس کی وجہ سے اسے قائم رکھا جائے۔ اس وجہ سے میری رائے شروع سے یہ رہی ہے کہ اگر اس کی صورت بدلی نہ جائے تو اس کو توڑ دیا جائے۔ سائمن کمیشن نے اس میں کچھ اصلاح کی ہے لیکن ویسی ہی صورت اسمبلی کے متعلق پیدا کر کے بھی اس کی غرض کو باطل کر دیا ہے۔ پس میرے نزدیک ضرورت ہے کہ اسمبلی کی نشستیں تو براہ راست انتخاب کے ذریعہ سے پُر کی جائیں اور کونسل آف سٹیٹ کا انتخاب اس سے مختلف ہو۔ میں اس کے لئے مندرجہ ذیل تجویز پیش کرتا ہوں۔

(۱) کونسل آف سٹیٹ کے ممبر اسمبلی سے ایک تہائی ہوا کریں۔

(۲) ان میں سے ۴/۵ ممبر صوبہ جات کی کونسلیں منتخب کیا کریں اور ۱/۱۰ ممبر گورنر جنرل اِن کونسل (GOVERNOR GENERAL IN COUNCIL) ایسے لوگوں میں سے جنہوں نے علمی یا عملی خدمت ملک کی کی ہو یا زمیندارہ، تجارت وغیرہ خاص مفاد کی نیابت کرنے والے لوگوں میں سے نامزد کریں۔ ان نامزد شدہ ممبروں میں قومی توازن کو قائم رکھا جائے۔ کونسلوں کی نمائندگی علاقہ کے اصول پر ہو اور ہر ایک صوبہ خواہ بڑا ہو، خواہ چھوٹا ہو اسے برابر کے ممبر بھیجنے کا اختیار ہو۔ ووٹنگ واحد قابل انتقال ووٹ کے اصول پر ہو۔ اگر اسے کسی وجہ سے پسند نہ کیا جائے تو "انتخاب مطابق تعداد" کے طریق کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن میرے نزدیک اقلیتوں کے فوائد کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے پہلا طریق زیادہ مفید ہو گا۔ مگر یہ امور مختلف اقوام کے نمائندے بحث کے بعد بہتر طور پر طے کر سکتے ہیں۔

شاید اس پر اعتراض ہو کہ اب کیوں میں نے مخلوط انتخاب کے طریق کو پسند کر لیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری مجلس کا انتخاب علاقہ کے اصول پر ہوتا ہے اور پہلی کا افراد پر۔ اس لئے پہلی چیمبر کے انتخاب پر جو افراد کی نمائندہ تھی مجھے اعتراض تھا۔ دوسری چونکہ افراد کی نمائندہ ہی نہیں ہے۔ اس میں مخلوط انتخاب پر مجھے اعتراض نہیں۔ گو "انتخاب مطابق تعداد" پر اعتراض ہے کیونکہ اس طرح اسلامی صوبوں کے الگ بنانے میں جو زائد حفاظت مسلمانوں کے حقوق کی مدنظر رکھی گئی تھی وہ کمزور ہو جائے گی۔

جو ممبر گورنر جنرل نامزد کریں ان کے متعلق انہیں اختیار ہو کہ خواہ ایک عرصہ انتخاب کے لئے منتخب کریں خواہ عمر بھر کے لئے مقرر کریں کیونکہ کچھ لائف ممبروں کا مقرر ہونا بھی ایسی کونسل میں مفید ہوتا ہے۔ اس سے قومی کاموں میں خاص طور پر حصہ لینے کا شوق بھی لوگوں میں پیدا ہو گا کیونکہ سمجھا جائے گا کہ خاص خدمت کرنے والوں کو ملک میں دائمی حقِ نیابت کی صورت میں اعزاز دیا جاتا ہے۔

(۳) کونسل آف سٹیٹ کی عمر سات سال ہوا کرے تاکہ جس وقت اسمبلی کا انتخاب ہو رہا ہو ایک مجلس ایگزیکٹو مدد دینے کے لئے موجود رہے۔

قانون ساز مجالس کے اختیارات

میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ قانونِ اَساسی کے طے ہونے کے فوراً بعد مرکز میں اس پر عمل شروع نہ ہو بلکہ ایک وقتی انتظام پہلے قائم کیا جائے جو حسب قوانین تبدیل ہوتا ہوا قانون اساسی کے مطابق ہو جائے اس لئے جو کچھ میں اب لکھوں گا وہ اس امر کو مدّ نظر رکھ کر ہو گا کہ پہلی اسمبلی جو نئے نظام کے ماتحت منتخب ہو اس کے کیا اختیارات ہوں۔

میرے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ فوراً ہی ایگزیکٹو کو اسمبلی کے تابع کر دیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک مناسب یہ ہو گا کہ چند سال تک موجودہ تعلق اسمبلی اور ایگزیکٹو کا بہت حد تک قائم رکھا جائے۔ لیکن اس امر کا خیال رکھتے ہوئے کہ آئندہ حکومت، خود اختیاری اصول پر چلائی جائے گی مندرجہ ذیل تغیر کر دیئے جائیں۔

(۱) اسمبلی کو آئندہ مالی معاملات میں پوری آزادی ہو اور اس کا فیصلہ اس امر میں ناطق ہو سوائے اس کے کہ گورنر جنرل کسی امر کو ملک کے مفاد کے خلاف دیکھ کر رد کر دیں۔ مالی بِل جس قدر پیش ہوں ان کی اصلاح کا بھی اسمبلی کو اختیار ہو اور بغیر اس کی اجازت کے بل کو واپس لینے کا حکومت کو اختیار نہ ہو۔

(۲) اس وقتی نظام کے دوران میں اگر دونوں مرکزی مجالس تین چوتھائی کی کثرت سے کوئی فیصلہ کر دیں تو گورنمنٹ اس پر عمل کرنے کی پابند ہو۔ بشرطیکہ وہ امر کانسٹی چیوشن (CONSTITUTION) یا ایگزیکٹو (EXECUTIVE) کے اختیارات یا نان ووٹیبل (NON VOTABLE) امور سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ گورنر جنرل کو بھی اس فیصلہ کو رد کرنے کا اختیار نہ ہو۔ صرف یہ اختیار ہو کہ وہ پہلے دونوں مجالس کے پاس اس فیصلہ کو واپس کریں اور دوبارہ غور کرنے کی ہدایت کریں اور اس کی وجوہ بیان کر دیں۔ اگر دونوں مجالس ان کی مرضی کے مطابق اصلاح کر دیں تو فبِہا، ورنہ اگر اصلاح نہ ہو یا مرضی کے مطابق نہ ہو اور گورنر جنرل یہ سمجھیں کہ اس فیصلہ کا اجراء خطرناک ہے تو وہ دونوں مجالس کو برخاست کر کے نئی مجالس کا انتخاب کرائیں اور اس وقت تک اس فیصلہ کو ملتوی رکھیں۔ اگر دوسری منتخب شدہ مجالس بھی تین چوتھائی کی اکثریت سے اس

فیصلہ کی تائید کریں تو پھر بہرحال اس کا اجراء کیا جائے۔

(۳) چونکہ یہ امر بھی ضروری ہے کہ ملکی عنصر کو حکومت کے طریق سے آگاہ کیا جائے اور ایک حد تک اس کا اثر ایگزیکٹو پر بھی ہو۔ دوسری طرف یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ ڈائی آرکی (DIARCHY) کی موجودہ صورت کو جو فی الواقع مُضِر ہے دور کیا جائے اس لئے میرے نزدیک ایک درمیانی تجویز یہ مناسب ہو گی کہ ہر انتخاب کے بعد اسمبلی کے ممبر کونسل آف سٹیٹ کے ممبروں سے مل کر تیس آدمیوں کی ایک فہرست تیار کر کے گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا کریں جو ان میں سے چند آدمیوں کو منتخب کر کے ان میں سے ایک ایک کو ہر ایگزیکٹو ممبر کے ساتھ پارلیمنٹری سیکرٹری کے طور پر لگا دیں۔ یہ سیکرٹری تنخواہ دار ہوں اور اسی طرح ڈسپلن کے پابند ہوں جس طرح دوسرے ملازم ہوتے ہیں اور ان کا فرض ہو کہ وہ محکمہ کی پالیسی کی پابندی کریں اور اس کے رازوں کو محفوظ رکھیں اور پورے طور پر اپنے افسر اور گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ ہوں نہ کہ اسمبلی کے سامنے۔ ان کے ساتھ ایک مستقل آفیشل سیکرٹری بھی ہو لیکن یہ فرق نہ کیا جائے کہ چند محکمے مستقل طور پر ان منتخب سیکرٹریوں کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں بلکہ دونوں سیکرٹریوں کے جو کام سپرد ہو ان پر باری باری منتخب اور مستقل کارکن لگتے رہیں تا کہ محکمہ کی تمام شاخوں کا منتخب سیکرٹریوں کو علم اور تجربہ ہوتا رہے۔ اسمبلی کے برخاست ہونے یا کئے جانے پر یہ لوگ بھی کام سے علیحدہ ہو جائیں۔ اور پھر نئے انتخاب پر نیا پینل تیار ہو جس سے گورنر جنرل نئے وزراء کا انتخاب کریں لیکن اسمبلی کے برخاست ہونے سے پہلے انہیں گورنر جنرل تو علیحدہ کر سکیں لیکن اسمبلی ان کے خلاف کوئی ووٹ پاس نہ کر سکے۔ اس طرح ایک تو ایگزیکٹو اپنا کام بغیر کسی قسم کی روک کے کر سکے گی دوسرے ایسے لوگ حکومت کا کام کرنے کی مشق پیدا کر لیں گے جن پر مجالس قانون ساز کو اعتبار ہو گا۔ تیسرے وہ لوگ جو سیکرٹری مقرر ہوں گے باوجود ایگزیکٹو کا جزو ہونے کے بوجہ منتخب مجالس میں سے آنے کے ملک کی صحیح ترجمانی ایگزیکٹو مشوروں کے وقت کر سکیں گے۔ اور ایگزیکٹو پر اپنا اخلاقی اثر ڈال کر اسے ایک حد تک مجالس کے منشاء کے مطابق چلانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ چوتھے یہ لوگ گورنمنٹ کے لئے بھی مفید ہوں گے کیونکہ بوجہ مختلف پارٹیوں کا نمائندہ ہونے کے اس پر ان کا اثر ہو گا اور

منتخب نمائندوں اور ایگزیکٹو کے درمیان میں بطور ایک واسطہ کے بن جائیں گے کیونکہ ایک طرف ان کے سامنے حکومت کی مشکلات ہوں گی اور دوسری طرف پبلک کی خواہشات۔

(۴) چوتھے بعض محکمے ایسے نامزد کر دیئے جائیں۔ جیسے کہ مثلاً تعلیم ہے' حفظان صحت ہے' صنعت و حرفت ہے کہ ان محکموں کے متعلق اسمبلی کو حق ہو کہ وہ سال کے شروع میں ایک عام ہدایت طریق کار کے متعلق دے دے اور وہ محکمے اس ہدایت کی حتی الوسع پابندی کریں۔ حتی الوسع سے مراد یہ کہ جب خاص وجوہ سے عمل نہ ہو سکتا ہو تب اسمبلی کے منشاء کے خلاف عمل ہو۔ ورنہ اسی کے مطابق ہو مجھے معلوم ہے کہ یہ محکمے اصل میں صوبہ جاتی ہیں لیکن کچھ کام ان کے ماتحت مرکز سے بھی متعلق ہے۔ نیز میں نے ان کا ذکر صرف بطور مثال کے کیا ہے ورنہ اگر یہ مناسب نہ ہوں تو اور ایسے محکمے اس غرض کے لئے چُنے جا سکتے ہیں۔

(۵) فوج' فارن اور پولیٹیکل معاملات کے متعلق اسمبلی کو ریزولیوشن پاس کرنے کی اجازت نہ ہو عام اظہار رائے کر سکتی ہے۔

کونسل آف سٹیٹ کا کام علاوہ پینل تجویز کرنے کے یہ ہو:۔

(۱) اسمبلی کے پاس شدہ مسودات پر نظر ثانی جس کے بعد مسودہ پھر پہلی مجلس میں جائے۔ اگر اسمبلی سفارشوں کو منظور کر لے تو فبہا اگر منظور نہ کرے تو دونوں مجلسوں کی جائنٹ کمیٹی کے سپرد ہو۔ اگر پھر بھی کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکے اور اسمبلی ساٹھ فیصدی حقیقی اکثریت سے اسے دوبارہ پاس کر دے تو وہ پاس شدہ سمجھا جائے ورنہ رد ہو جائے۔ لیکن نیا مسودہ پاس کرنے یا اس پر بحث کر کے اسے رد کرنے کی کونسل آف سٹیٹ کو اجازت نہ ہو۔ ہاں اسے ایگزیکٹو سے سفارش کرنے کا اختیار دیا جائے کہ فلاں امر کے متعلق قانون کی ضرورت ہے۔

(۲) مالی مسودات میں ترمیم کرنے کا اسے اختیار نہ ہو لیکن سفارش کر کے دوبارہ غور کرنے کے لئے وہ بجٹ یا مالی مسوّدہ کو بھیج سکے لیکن پورے طور پر بجٹ کو یا کسی اور مالی مسوّدہ کو رد کرنے کا اسے اختیار ہو۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ سمجھا جائے کہ اگر اسمبلی ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو دونوں مجالس برخاست ہو جائیں اور اگر نئے

انتخاب کے بعد بھی اسمبلی اس مسوّدہ کو پاس کردے تو پھر اسے پاس سمجھا جائے۔

دونوں کو برخاست کرنے کی غرض یہ ہے کہ تابغیر کافی وجہ کے کونسل آف سٹیٹ بجٹ کو رد نہ کرے اور تا ممبروں کو احساس رہے کہ اگر ہم نے بِلا وجہ ایسا کام کیا تو صوبہ جات ہمیں دوبارہ منتخب نہ کریں گے۔

(۳) کونسل آف سٹیٹ کو یہ بھی اختیار ہو کہ جس مسوّدہ کے متعلق وہ یہ فیصلہ کردے کہ اس سے صوبہ جات کے ان حقوق پر زد پڑتی ہے جو قانون اساسی کے ذریعہ سے انہیں حاصل ہیں تو وہ مسوّدہ کسی مزید کارروائی سے پہلے صوبہ جات کی کونسلوں کے پاس بھیجا جائے اور اگر کونسلوں کی اکثریت کا یہ فیصلہ ہو کہ اس سے ان کے حقوق پر زد پڑتی ہے تو وہ مسوّدہ رد کر دیا جائے۔ لیکن گورنر جنرل کو اختیار ہو کہ اگر وہ یہ دیکھیں کہ معاملہ اہم ہے اور فوری توجہ چاہتا ہے تو کونسل کے فیصلہ کو رد کر کے مسوّدہ پر مزید کارروائی ہونے کی اجازت دے دیں۔ اس صورت میں جو صوبہ یہ سمجھتا ہو کہ اس سے اس کی یا صوبہ جات کی حق تلفی ہوئی ہے وہ اس معاملہ کو سپریم کورٹ میں پیش کر کے فیصلہ کرا سکتا ہے یا اگر صوبہ جات اور مرکز کے درمیان یا صوبہ جات اور صوبہ جات کے درمیان فیصلہ کے لئے ثالثی کا طریق زیادہ پسند کیا جائے تو امریکن شرائط اتحاد **مَابَیْنَ الدُّوَل** (ARTICLES OF CONFEDERATION) کی دفعہ ۹ کے مطابق کچھ اصول طے کر لئے جائیں اور اختلاف کے موقع پر ان کے ماتحت فیصلہ کیا جایا کرے۔

مجلس عاملہ (ایگزیکٹو کونسل) میرے نزدیک ڈومینین سٹیٹس (DOMINION STATUS) کے اصول پر کام چلانے کے لئے ایگزیکٹو کے موجودہ طریق میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے اس وقت ایگزیکٹو کونسل (EXECUTIVE COUNCIL) کا ایک ممبر کمانڈر انچیف بھی ہوتا ہے۔ یہ طریق جیسا کہ سائمن کمیشن نے لکھا ہے درست نہیں کیونکہ کمانڈر انچیف ایک مستقل عہدہ دار ہے اور بوجہ اپنے سیاسی خیالات کے نہیں بلکہ اپنے ماہرِ فن ہونے کے' اپنے اس کام پر مقرر کیا جاتا ہے۔ پس اسے ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنانا درست نہیں۔ میرے نزدیک آئندہ اصلاحات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک جنگی وزیر مقرر کر دیا جائے جو سویلین (CIVILIAN) ہو، تا کہ جب بھی حکومتِ خود اختیاری مکمل ہو، آسانی سے اس صیغہ کو منتقل کیا جا سکے اور میری اوپر کی

بیان کردہ سکیم کے ماتحت اس محکمہ میں بھی مرکزی مجالس کی سفارش پر ایک غیر سرکاری افسر مقرر کیا جا سکے۔ ہاں اس صیغہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات قانون میں ضرور آجانی چاہئے کہ ایک تجربہ کار افسر سیکرٹری کے عہدہ کا وزیر جنگ کے ساتھ مقرر کیا جائے تاکہ فنی (TECHNICAL) معاملات میں وہ مشورہ دے سکے۔

دوسری اصلاح میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ سائمن رپورٹ نے جو لیڈر آف دی ہاؤس (LEADER OF THE HOUSE) ایک نیا عہدہ تجویز کیا ہے اس کی زیادتی کی جائے اور لیڈر آف دی ہاؤس پر مقرر ہونے والا شخص صرف قانون ساز مجلس میں ہی لیڈر کا کام نہ دے بلکہ ایگزیکٹو کونسل کا بھی وائس پریذیڈنٹ ہو اور اس کی حیثیت وزارت میں وزیرِ اعظم کی سی ہو۔ گورنر جنرل کو اختیار ہو کہ وہ اہم معاملات میں وزارت کو بلوا کر اپنے سامنے مشورہ کرے اور خود مجلس وزارت کی صدارت کرے۔ لیکن عام طور پر جیسا کہ آئینی حکومتوں میں دستور ہے صدارت کے کام کو وزیر اعظم پر چھوڑ دے۔ اس سے آہستہ آہستہ اسی راہ پر کام پڑ جائے گا جس پر اسے ڈالنا مقصود ہے۔

تیسری اصلاح یہ ضروری ہے کہ سائمن کمیشن کی سفارش کے مطابق آئندہ انتخاب ممبروں کا وائسرائے کی مرضی پر رہے۔ یہ بھی اچھی اصلاح ہے اس سے آئندہ وزارت کے لئے داغ بیل پڑ جائے گی اور بغیر کسی تغیر کے آہستگی سے سروسز (SERVICES) کی بجائے اسمبلی کے ممبروں کی طرف وزارت منتقل ہو سکے گی۔

چوتھی اصلاح یہ بھی مفید ہو سکتی ہے کہ ایگزیکٹو کے ممبر' ممبر کہلانے کی بجائے سیکرٹری یا منسٹر کہلائیں اس صورت میں اسمبلی کے منتخب ممبر جن کے بطور نائب مقرر کرنے کے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں بجائے سیکرٹری کے نائب سیکرٹری کہلائیں۔ یہ اصلاح گو نام کی ہے لیکن نام کا بھی انسان کی طبیعت پر اثر ہو جاتا ہے اور نام اسے اس طریق عمل کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے جو اس کے لئے پسند کیا گیا ہے۔ ایگزیکٹو کونسل کے ممبر دونوں مرکزی مجلسوں کے بہ حیثیت عہدہ ممبر ہوں اور ان کے سوا اسمبلی میں کوئی نامزد شدہ ممبر نہ ہو۔

مرکزی حکومت میں انتخابی عنصر کی ترقی

یہ انتظام میرے نزدیک پہلے پانچ سال تک کسی صورت میں تبدیل نہ ہو سکے۔ پانچ سال کے بعد دونوں مرکزی مجالس میں اگر تین چوتھائی ممبروں کی کثرت سے یہ ریزولیوشن پاس

ہو جائے کہ اب دوسرا قدم آزادی کی طرف اٹھانے کا وقت آگیا ہے تو اس ریزولیوشن کے بعد حکومت ہندوستان میں مزید تغیر کر دیا جائے اور وہ میرے نزدیک یہ ہو کہ علاوہ ان نائب سیکرٹریوں کے جو پہلی اسمبلی میں مقرر کئے گئے تھے۔ اس ریزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد آٹھ میں سے (لیڈر آف دی ہاؤس کو ملا کر آئندہ آٹھ ممبر ہو جائیں گے) پانچ ایگزیکٹو ممبر ہندوستانی کر دیئے جائیں۔ نیز ان کا تعیّن بجائے موجودہ طریق کے اسی طرح دونوں مجالس کے منتخب پینل سے ہو جس طرح کہ میں نے سیکرٹریوں یا ممبروں کا نام سیکرٹری ہو جانے کی صورت میں نائب سیکرٹریوں کے لئے تجویز کیا ہے لیکن اسمبلی اور ایگزیکٹو کے تعلقات وہی رہیں جو پہلی کونسل میں تھے۔ یعنی یہ سیکرٹری (میری مراد ایگزیکٹو ممبر سے ہے) بھی اسی طرح گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ ہوں جس طرح ایگزیکٹو ممبر ہوتے ہیں صرف اپنے اخلاقی دباؤ سے ملک کی رائے پر اثر ڈالیں۔

اسی طرح یہ مزید اختیار مرکزی مجالس کو دیا جائے کہ پہلی کونسل میں جن امور کے متعلق ان کا فیصلہ تین چوتھائی ووٹ سے لازمی ہوتا تھا اب ساٹھ فیصدی حقیقی (ABSOLUTE) اکثریت سے جو فیصلہ دونوں مجالس کریں بشرطیکہ قانون اساسی نان ووٹیبل امور یا ایگزیکٹو کے اختیارات سے تعلق نہ رکھتا ہو وہ فیصلہ انہی شرائط کے ساتھ جو پہلے بیان ہو چکی ہیں ایگزیکٹو کے لئے [illegible] ہو۔ اس کے پانچ سال تک پھر کسی مزید امر کا فیصلہ کرنے کا مجالس کو اختیار نہ ہو۔ [illegible] دوسرے پانچ سال کے گزرنے پر پھر دونوں مرکزی مجالس کو اختیار ہو کہ وہ تیسرے قدم کے اٹھانے کا ریزولیوشن تین چوتھائی ممبروں کی رائے سے پاس کریں جس کے بعد میرے نزدیک مزید اختیارات اسمبلی کو ملیں جو یہ ہوں۔

آئندہ سے گورنر جنرل رسپانسیبل منسٹری (RESPONSIBLE MINISTERY) بنائیں جس میں یہ شرط ہو کہ جس کے سپرد وزارت کا کام کیا جائے وہ کم سے کم دو انگریز ممبر سروسز میں سے اپنے ساتھ شامل کرے جن میں سے ایک فوج کے محکمہ کا انچارج ہو۔ ان کا انتخاب اس کے اختیار میں ہو لیکن وہ پابند ہو کہ سول سروس کے دو انگریز ممبروں کو ضرور شامل کرے۔ اس وقت سے وزارت پوری طرح مجالس کے ماتحت ہو اور صرف گورنر جنرل کو ویٹو کا اختیار ہو۔ یا مسودہ کو واپس نظر ثانی کے لئے بھیجنے کا اختیار ہو۔ پولیٹیکل اور فارن معاملات گورنر جنرل سے براہ راست متعلق رہیں اور ملٹری بجٹ نان ووٹیبل (NON VOTABLE)

رہے۔ باقی سب امور میں مرکزی مجالس کو پورا اختیار ہو۔

اس کے بعد بہت چھوٹی اصلاحات باقی رہ جائیں گی جو آہستگی سے ہوتی چلی جائیں گی۔ اور قانون ساز مجلس کے زور دینے پر ان میں خود بخود اصلاح ہوتی چلی جائے گی کیونکہ اس موقع پر پہنچ کر اسمبلی کا زور اس قدر ہو جائے گا کہ ملک کی کوئی صحیح خواہش بغیر پوری ہونے کے نہیں رہے گی۔

حکومت ہند اور صوبہ جات کا تعلق

صوبہ جاتی آزادی کے بعد مرکز کا دخل صوبہ جاتی معاملات میں نہیں رہنا چاہئے اور رہنا ممکن بھی نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر انتظام میں خرابی ہو تو اس کا کیا علاج ہوگا؟ کیونکہ یہی سوال مرکزی حکومت کے متعلق کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس کا انتظام خراب ہوا تو اس کا کیا علاج ہوگا؟ انسانی کاموں کا یہی حال ہے کہ آخر ایک جگہ پر یہ اعتبار کیا جاتا ہے کہ ذمہ وار ٹھیک طور پر کام کریں گے۔ جب کونسلیں مقرر ہو جائیں گی اور ملک کی براہ راست نگرانی میں حکومت آجائے گی تو پھر یہی سمجھنا چاہئے کہ مرکز کی ذمہ داری ادا ہو گئی۔

ہاں سوال ان امور کا رہ جاتا ہے جو مرکزی ہیں چونکہ ان میں سے بھی بہت سے امور کا عمل درآمد اگر فضول اخراجات سے بچنا ہو تو صوبہ جات کی حکومتوں کے ذریعہ سے ہوگا اس لئے صوبہ جات کی ایگزیکٹو ایسے تمام امور میں مرکزی حکومت کے ماتحت ہونی چاہئے اور ان احکام کی تعمیل میں اور ان کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں وہ پوری پابند ہونی چاہئے اور صوبہ جات کے گورنر اس امر کی نگرانی کے ذمہ وار ہونے چاہئیں کہ مرکزی امور کی تعمیل صوبہ جات میں پوری طرح ہوتی ہے یا نہیں۔ **یونائیٹڈ** سٹیٹس میں اس غرض کے لئے مرکزی حکومت کی طرف سے الگ عہدہ دار ہیں۔ لیکن ہندوستان میں میرے نزدیک اس قدر علیحدگی کی ضرورت نہیں ہے۔

باب ہشتم

فوج

تمام سوالات میں سے جو ہندوستان کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں فوج کا سوال سب سے اہم ہے۔ کیونکہ اس محکمہ پر ملک کے اندرونی اور بیرونی امن کا دارومدار ہے اور سب سے زیادہ اس محکمہ میں ہی ہندوستانیوں کی کمی ہے۔ فوجی اسلحہ کا بنانا اور ہر قسم کے ہتھیاروں کی درستی اور مرمت اور ہر محکمہ کے ماہرین فن کی موجودگی میں ہندوستان بہت ہی پیچھے ہے لیکن باوجود اس کے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس وجہ سے ہندوستانیوں کو ان کے ملک میں آزادی نہ دی جائے۔ ہمارے سامنے جاپان کی مثال موجود ہے۔ جاپان بے شک جزیرہ ہے اور اسے خشکی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن دو بحری طاقتیں اس میں دخل پیدا کر چکی تھیں۔ ایک یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ اور دوسرے برطانیہ۔ باوجود اس کے جاپان نے نہایت سُرعت سے اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کر لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرنیل ایک دن میں نہیں بنتے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ضرورت کے وقت جرنیلوں کے بنانے میں اس قدر دیر لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ امن کے دنوں میں۔ عام طور پر جرنیل پچیس تیس سال کی نوکری کے بعد بنتا ہے لیکن جنگ عظیم کے دنوں میں ہر قوم کے فوجی افسر کس طرح جلد جلد جرنیل اور کرنیل بنتے تھے۔ غرض موقع کی بات ہوتی ہے جیسا موقع ہوتا ہے ویسا انسان کام کر لیتا ہے۔ پس اگر ابتدائی دنوں میں بعض عام قواعد کو ترک کر کے ہندوستانی افسروں کو نسبتاً جلدی ترقی دے دی جائے اور بجائے عرصۂ ملازمت کے دیکھنے کے لائق افسروں کی قابلیتوں کا امتحان لے کر انہیں ترقی دے دی جائے تو عام اندازے سے بہت جلد ہندوستانی فوج تیار ہو سکتی ہے۔

سائمن کمیشن نے لکھا ہے کہ چونکہ ہندوستان کی فوج کا مقصد صرف ہندوستان کی

حفاظت نہیں بلکہ ایمپائر (EMPIRE) کی حفاظت ہے اس لئے ہندوستانی فوج کو ایمپائر کے نقطہ نگاہ سے ہی دیکھنا چاہئے اور اس دلیل کو قائم کر کے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ آئندہ ہندوستان سے ایک مقررہ رقم فوج کے اخراجات کی لی جائے باقی انگلستان ادا کرے لیکن باوجود پورا غور کرنے کے میں کمیشن کی اس دلیل کو نہیں سمجھا۔

میں یہ تو تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان برطانوی ایمپائر کا ایک اہم حصہ ہے لیکن یہ امر کہ اس کی حفاظت کا سوال اس سے زیادہ امپیریل ہے جس قدر کہ آسٹریلیا یا کینیڈا کی حفاظت کا سوال میری سمجھ سے باہر ہے۔ کمیشن نے تحریر کیا ہے کہ ہندوستان کے اعمال کا ہی ہندوستان کی سرحدوں پر اثر نہیں پڑے گا بلکہ دوسری جگہوں پر بھی اگر برطانوی امپائر کا کسی سے جھگڑا ہوا تو ہندوستان پر اس کا اثر پڑے گا۔ اس وجہ سے یہ امپیریل کا سوال ہے۔

اگر اس وجہ سے یہ سوال امپیریل ہے تو پھر بجائے ہندوستان کو اس کے جائز حق سے محروم کرنے کے یہ چاہئے تھا کہ سب برطانوی علاقے اس کی مالی امداد کرتے لیکن کمیشن تجویز یہ کرتا ہے کہ اس وجہ سے اس کی فوجیں برطانوی محکمہ جنگ کے ماتحت رہنی چاہئیں۔ یہ ایسی ہی دلیل ہے جیسے کہ ڈومینین (DOMINION) حکومتیں کسی وقت یہ کہہ دیں کہ چونکہ برطانوی امپائر کی حفاظت میں بحری فوج کا بہت کچھ دخل ہے اس لئے اس کا بحری انتظام نَو آبادیوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دینا چاہئے تا کہ وہ مطمئن رہے کہ انتظام ٹھیک ہے۔ اگر ہندوستان کو یہ یقین ہو جائے کہ برطانوی حکومت کا ایک قیمتی حصہ بننے کے یہ معنے ہیں کہ اسے آزادی سے محروم رکھا جائے تو ہندوستان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس تعلق کو قدر کی نگاہ سے دیکھے۔ ہندوستانی اسی وقت تک برطانوی تعلق کو قدر سے دیکھتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں جب تک وہ اسے ترقی اور آزادی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی وقت تک وہ برطانوی امپائر کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ پس ایسی کوئی سکیم خواہ فوج کے متعلق ہو، خواہ کسی اور محکمہ کی نسبت جو عملاً ہندوستان کو آزادی سے محروم کر دے کسی صورت میں ہندوستان اور انگلستان میں اچھے تعلقات پیدا کرنے میں مُمِدّ نہیں ہو سکتی اور ایسی سکیم کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

پس میرے نزدیک ہندوستانی فوج کو بھی ایسے طریق پر چلانا چاہئے جس سے وہ ایک دن ہندوستان کی مجالس حکومت کے ماتحت لائی جا سکے۔ یہ یقینی بات ہے کہ جب ایسا دن آیا اس

دن ہندوستان کی قیمت...... انگریزوں کی نسبت ہندوستانیوں کی نظر میں زیادہ ہوگی اور اس لئے وہ کبھی بھی پسند نہیں کریں گے کہ اس کی آزادی کو خطرہ میں پڑنے دیں۔

میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں فوج کا سوال حل کرنے کے لئے سکین کمیٹی (SCAN COMMITTEE) کی رپورٹ سے بہتر طریق کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کمیٹی میں برطانیہ کے بہترین جرنیلوں میں سے ایک جرنیل شامل تھا۔ یعنی آرمی سیکرٹری شامل تھا اور ہندوستانی رائے عامہ کے بہترین نمائندے بھی شامل تھے۔ پس وہ رپورٹ جو ایک طرف جنرل سکین (GENERAL SCAN) جیسے آدمی کی تصدیق اپنے ساتھ رکھتی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی رائے کی تائید رکھتی ہے نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔ اس رپورٹ میں تین باتوں کی خاص طور پر سفارش کی گئی ہے۔

(۱) ہندوستان میں ایک فوجی کالج سنڈھرسٹ کے نمونہ پر بنایا جائے۔

(۲) جب تک یہ بات حاصل نہ ہو ہندوستانیوں کو ہر سال بڑھنے والی تعداد میں سنڈھرسٹ میں داخل کیا جائے حتّٰی کہ ۱۹۵۲ء تک فوج کے نصف عہدہ دار ہندوستانی ہو جائیں۔

(۳) وہ آٹھ رجمنٹس جن میں خالص ہندوستانی افسروں کو بھرتی کرنے کی کوشش ہو رہی ہے توڑ دی جائیں اور ہندوستانی افسروں کو سب قسم کے فوجی محکموں میں انگریزوں سے مل کر کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

افسوس ہے کہ گورنمنٹ ہند نے اس سکیم کو رد کر دیا اور تینوں میں سے ایک تجویز کو بھی قبول نہ کیا۔ گو اب مجھے ایک نہایت ہی ذمہ وار اتھارٹی کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں سنڈھرسٹ کی سکیم کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا باوجود کمانڈر انچیف کی مخالفت کے زور دے رہی ہے مگر صرف یہی ایک سوال قابل غور نہیں اس سے تو صرف یہ فائدہ ہوگا کہ ہندوستانی افسر زیادہ جلدی تیار ہو سکیں گے اور مسلمانوں کو جو اب تک فوجی خدمات کرتے آئے ہیں اور جو بوجہ غربت انگلستان جا کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے اعلیٰ فوجی تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن دوسرے دونوں امور بھی نہایت اہم ہیں۔ جب تک کالج کھلے ہندوستانیوں کو زیادہ تعداد میں سنڈھرسٹ میں بھیجنا چاہئے اور اگر وہاں زیادہ گنجائش نہ ہو تو زائد رقم خرچ کر کے بھی گنجائش نکالی جائے گو وہ بار ہندوستان پر ڈال دیا جائے۔ اسی طرح ہندوستانی اور انگریز افسروں کو اکٹھا ہی کام کرنے کا موقع دینا چاہئے تاکہ وہ ایک دوسرے کے

مزاج شناس بھی ہوں اور ہندوستانیوں کا یہ وہم بھی دور ہو کہ ہمیں الگ فوج میں رکھ کر حکام کی غرض یہ ہے کہ ہم کو پورا موقع ترقی کا نہ دیا جائے۔

میں حیران ہوں کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اس وقت تک میں نے ایک ہی اعتراض سنا ہے کہ انگریز افسر ہندوستانی کے ماتحت کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر یہ درست ہے تو ہندوستانی بھی انتہاء درجہ کے بے غیرت ہوں گے اگر انگریزوں کے ماتحت کام کرنے پر تیار ہوں۔ اگر اس دلیل کی وجہ سے حکومت دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو میرے نزدیک حکومت بھی اس جُرم کی مؤیّد ہے اور ایسی صورت میں اسے ہرگز یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی اس کے ساتھ مل کر کام کریں اور اس صورت میں کانگریس کے تمام مظاہرات محض قومی غیرت کا ثبوت ہیں اور اس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔ لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ لارڈ اِروِن (LORD IRWIN) جیسا شریف انسان کبھی اس دلیل کا مؤیّد نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ طبیعت تو انتہائی درجہ کی بداخلاقی پر دلالت کرتی ہے اور لارڈ اِروِن ایک اعلیٰ درجہ کے شریف انسان ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اس بارہ میں طبائع کے اختلاف کو دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ باوجود اس اختلاف کے ہندوستانی افسر انگریزوں کی ماتحتی کرتے ہیں پھر انگریز افسر کیوں ہندوستانی کی ماتحتی نہیں کر سکتا اگر اس میں یہ برداشت نہیں تو وہ ہندوستانی سے بہت کم مہذّب ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ حکومت اس کے ہاتھ میں دی جائے۔

غرض سکین کمیٹی (SCAN COMMITTEE) کی رپورٹ کے خلاف جو کچھ سنا جاتا ہے وہ معقول نہیں اور اس پر جلد سے جلد عمل کر کے ہندوستانی افسروں کو اس قابل کر دینا چاہئے کہ وہ ہندوستانی فوجوں کا خود انتظام کر سکیں۔ لیکن اس وقت تک کہ وہ دن آئے جب خود ہندوستانی، فوج کی تمام شاخوں کا چارج لے سکیں اور اس کی سب ضرورتوں کو سمجھ سکیں وہی طریق جاری کیا جائے جو میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ فوجی سیکرٹری الگ ہو اور اس کا نائب ایک ہندوستانی اسی پینل میں سے منتخب کیا جائے کہ جسے دونوں مرکزی مجالس نے اس غرض کے لئے گورنر جنرل کے سامنے پیش کیا ہو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایسی سکیم ہر خطرہ سے خالی ہوگی جس میں یہ انتظام ہو کہ فوج کا انتظام تیس سال تک کُلّی طور پر ہندوستان کی مجالس واضع قوانین کے ہاتھ میں آجائے اور

ہمیں فوجی سکیم اس امر کو مدنظر رکھ کر بنانی چاہئے۔

میرے نزدیک سیکرٹری کے علاوہ ہمیں کچھ عرصہ کے بعد ایک ملٹری کمیٹی بھی مقرر کردینی چاہئے جس میں کچھ والیانِ ریاست ہوں اور کچھ ہندوستانی جو فوجی تجربہ رکھتے ہوں اور شرط کر دی جائے کہ فوجی بجٹ وغیرہ ان کی منظوری کے بعد اسمبلی میں پیش ہو۔ اس قسم کی کمیٹی فوراً نہیں بن سکتی کیونکہ گو تجربہ کار والیانِ ریاست فوراً مل سکتے ہیں لیکن تجربہ کار فوجی افسر اس وقت نہیں مل سکتے۔ لیکن آٹھ دس سال کے عرصہ تک جب موجودہ فوجی افسر تجربہ حاصل کر لیں گے ان سے کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر مسٹرونسٹن چرچل (SIR WINSTON CHURCHILL) تھوڑے سے تجربہ کے بعد وزیر جنگ ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے نوجوان پندرہ بیس سال کی جنگی خدمت کے بعد فوجی ضروریات کے متعلق ہمیں مشورہ نہ دے سکیں۔

باب نہم

ریاست ہائے ہند

اب میں ریاست ہائے ہند کا سوال لیتا ہوں کہ اس نئے نظام میں ان کا کیا درجہ ہو؟ ریاستیں ہندوستان کی آبادی کے قریباً چوتھے حصے اور اس کے رقبہ کے قریباً تیسرے حصے پر مشتمل ہیں۔ اس وجہ سے ان کا نظامِ حکومت سے الگ رہنا ہندوستان کی ترقی پر ضرور اثر ڈالے گا اس لئے ضرورت ہے کہ کسی نہ کسی اصول پر برطانوی ہندوستان اور ریاستوں میں تعلق پیدا کیا جائے۔

ریاستوں کا نقطہ نگاہ جو مجھے معلوم ہے یہ ہے کہ وہ اصل میں تو براہِ راست سیکرٹری آف سٹیٹ سے تعلق رکھنا پسند کرتی ہیں لیکن اگر اس کی کوئی صورت نہ ہو سکے تو پولیٹیکل محکمہ سے تعلق قائم رہنے کو برطانوی ہند سے وابستہ ہونے پر ترجیح دیتی ہیں۔ ☆

میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ ریاستیں اس امر سے خائف ہیں کہ اگر ان کا برطانوی ہند سے تعلق ہو گیا تو برطانوی ہند زور دے گا کہ ان کے علاقہ میں بھی ویسے ہی آزاد نظامِ حکومت قائم ہو جائیں جس قسم کے برطانوی ہند میں ہوں گے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ صورت تو نہیں ہو گی لیکن اس امر کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ریاستوں کے باشندوں میں آزادی کی تحریک پیدا ہوئی تو برطانوی ہند کے باشندوں کو قدرتاً اس تحریک سے ہمدردی ہو گی۔ کیونکہ ایک انسان جن مشکلات میں سے خود گزر چکا ہو ویسی ہی مشکلات میں سے گزرنے والے دوسرے انسان سے اسے طبعاً ہمدردی ہوتی ہے۔ مگر یہ ہمدردی بہرحال پیدا ہو گی خواہ ریاستوں کا تعلق برطانوی ہند سے ہو۔ یا نہ ہو اور ریاستوں کو پہلے سے ہی سمجھ لینا چاہئے کہ

☆ بعض بہی خواہانِ ملک کے زور دینے پر ریاستوں کا نقطۂ نگاہ بدل گیا ہے اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر اکثر والیانِ ریاست نے فیڈریشن میں شمولیت کو پسند کر لیا ہے۔

جب ان کے چاروں طرف انسانیت، آزادی سے متمتع ہو رہی ہو گی وہ اپنی رعایا کو اس تحریک سے غافل نہیں رکھ سکتے۔ اور ہندوستان کے نو آبادیوں والی حکومت کے حاصل کر لینے کے بعد وہ یہ امید نہیں کر سکتے کہ برطانیہ اس خواہش کے دبانے میں ان کی کچھ زیادہ مدد کرے گا۔

پس جو واقعات کل سختی سے پیش آنے والے ہیں ان کا احساس آج ہی کر کے ان کی سختی کو کم کر دینا چاہئے۔ میسور اور بعض دوسری جنوبی ہند کی ریاستیں اس طرف قدم اٹھا رہی ہیں پس اگر دوسری ریاستیں بھی ان کے نقش قدم پر چلیں تو انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اس سے ان کو یہ بھی فائدہ ہو گا کہ پولیٹیکل افسر جو ان کے کاموں میں روزانہ دخل دیتے ہیں دخل نہیں دے سکیں گے کیونکہ آئینی حکومت میں بہت سے امور تمام مُلک کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں اور ایگزیکٹو کو دبانا آسان ہے لیکن مُلک کی رائے کو دبانا آسان نہیں۔ اور ایسی حکومت جو مُلک سے مشورہ لے کر کام کرتی ہو اسے کوئی کہہ بھی کیا سکتا ہے کیونکہ وہ حکومت ہر تجویز پر عمل کرنے سے پہلے مجبور ہوتی ہے کہ مُلک کے نمائندوں سے مشورہ لے لے پس اگر پولیٹیکل افسر اس حکومت سے کوئی کام لینا چاہے گا تو وہ حکومت مجبور ہو گی کہ اس کے مشورہ کو مُلک کے نمائندوں کے سامنے پیش کرے اور یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی پولیٹیکل افسر اس کی برداشت کرے کہ اس کی ہدایت کو مجلس قانون ساز کے سامنے رکھ دیا جائے۔ مگر بہرحال یہ معاملہ ریاستوں کا ہے اور اس میں ہم صرف مشورہ دے سکتے ہیں۔ ہمارا تعلق تو اس وقت اس امر سے ہے کہ کیا ریاستیں ہندوستان کی اتحادی حکومت میں شامل ہو سکتی ہیں؟ میرا جواب افسوس کے ساتھ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں نہیں۔

ہاں مجھے یقین ہے کہ اگر ریاستیں ہندوستان فیڈرل سسٹم میں شامل نہیں ہوں گی تو انہیں سخت نقصان پہنچے گا۔ کیونکہ:۔

(۱) ریاستوں کا علاقہ بالکل پراگندہ ہے پھر سب ریاستیں ایک جیسی طاقتور نہیں۔ کوئی کمزور ہے تو کوئی طاقتور۔ پس اگر کسی وقت برطانوی ہند اور ریاستوں میں رقابت پیدا ہوئی تو ریاستیں کسی صورت میں برطانوی ہند کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی اور برطانیہ ہندوستان کو آزادی دینے کے بعد کسی صورت میں بھی اس جنگ میں دخل نہیں دے گا اور نہیں دے سکے گا کیونکہ یہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اقتصادی تدابیر سے ہو گی۔

(۲) ریاستوں میں سے صرف چند ساحل سمندر پر ہیں اور ان کا علاقہ باقی ریاستوں سے نہیں

ملتا۔ اگر آپس میں اتحاد نہ ہوا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کسٹمز وغیرہ کے سوال میں برطانوی ہند ریاستوں کی خواہشات اور ضروریات کی پرواہ نہیں کرے گا اور اس سے انہیں بہت مالی نقصان پہنچے گا۔

(۳) ریلوں وغیرہ کے معاملہ میں بوجہ پراگندہ ہونے کے برطانوی ہند ریاستوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ برطانوی ہند کو صرف ایک ریل کی مشکل ہے ورنہ وہ بالکل آزاد ہے اور بالمقابل ریلیں جاری کر کے اور ریاستوں کی ریلوں سے تعلق قطع کر کے وہ انہیں سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ غرض ریاستوں کا جائے وقوع ایسا ہے کہ بغیر ہندوستان کی فیڈریشن میں داخل ہونے کے ان کے لئے سخت مشکلات ہوں گی۔

لیکن اس کے مقابلہ میں دوسری طرف بھی مشکلات ہیں ریاستوں کے لئے بھی اور برطانوی ہند کے لئے بھی۔ ریاستوں کے لئے تو یہ دقّت ہے کہ فیڈریشن میں شامل ہونے سے انہیں اور ان معاملات میں اپنے حق کو چھوڑنا پڑے گا جو مرکزی ہوں گے۔ دوسرے ان کے طے کرنے میں انہیں زیادہ سے زیادہ اپنی رعایا کی آبادی کے برابر اپنی آواز کی قیمت تسلیم کرنی ہو گی۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں نہ تو وہ اس امر کے لئے تیار ہیں کہ مرکزی امور میں وہ ہندوستانی مجالس کے قانونوں کو تسلیم کر لیں اور نہ وہ اس امر کے لئے تیار ہیں کہ ایک چوتھائی نمائندگی حاصل کریں۔

برطانوی ہند کے راستہ میں بھی ان کے شامل ہونے سے مشکلات ہیں۔ اول یہ کہ ریاستوں کی نمائندگی کس طرح پر اور کس مجلس میں ہو گی؟ اگر تو ان کے نمائندوں کا انتخاب پبلک کرے گی تو یہ ناممکن ہو گا کیونکہ اکثر ریاستیں ایسی ہیں کہ ان کی رعایا اتنی نہیں کہ آبادی کی بناء پر اپنا نمائندہ منتخب کر سکے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ مختلف ریاستوں کی آبادی مل کر اپنے نمائندوں کا انتخاب کرے کیونکہ بہت سی ریاستیں بالکل پراگندہ ہیں۔ دوسرے ابھی والیانِ ریاست بھی اس امر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ تمام اہم امور ان کی رعایا کے نمائندے طے کر آئیں اور ان کا اس مشورہ میں دخل ہی نہ ہو۔

دوسری صورت اب یہ رہ جاتی ہے کہ ریاستوں کے نمائندے والیانِ ریاست کی طرف سے مقرر ہوں اور والیان ریاست غالباً سردست اس کے بغیر اور کوئی صورت مانیں گے بھی نہیں۔ لیکن اس صورت کو برطانوی ہند کبھی قبول نہیں کر سکتا کہ دو تین سو ووٹر مل کر ایک

چوتھائی ممبروں کو نامزد کریں۔ کیونکہ اول تو منتخب مجالس میں نامزد ممبروں کی جگہ ہی نہیں ہوتی لیکن اگر اس کی برداشت بھی کر لی جائے تب بھی کسی مجلس کے ایک چوتھائی ممبروں کا چند افراد کا نمائندہ ہونا اور ان کے حکم کے ماتحت ہونا اصول سیاست کے خلاف ہے اور اس سے وہ مجالس ہرگز آزاد مجالس نہیں کہلا سکتیں اور ان کی آزادی بالکل دہی ہو جاتی ہے۔

نیز منتخب شدہ ممبر گو ووٹروں کی مرضی کا لحاظ کرتا ہے لیکن وہ ان کا نوکر نہیں ہوتا اور نہ ہر بات میں ان کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے لیکن ریاستوں کے نمائندے ان کے ملازم اور ہر امر میں ان کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ پس وہ لوگ ووٹنگ مشینیں تو ہوں گے لیکن ایک منتخب مجلس قانون ساز کے ممبر کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے اور مجلس کا توازن بالکل خراب کر دیں گے۔

علاوہ ازیں برطانوی ہند کا جائز طور پر خوف ہو گا کہ ریاستوں کے نمائندے درحقیقت برطانوی ہند کے نمائندے ہوں گے اور ان کی مدد سے ایک نیا آفیشل بلاک (OFFICIAL BLOCK) بن جائے گا کیونکہ جب تک ریاستیں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ (POLITICAL DEPARTMENT) کے ماتحت ہیں وہ اس کے اشارہ پر چلنے کے لئے مجبور ہیں۔ پس اگر برطانیہ نے ان کے نمائندوں کو ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف آفیشل بلاک کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تو ہندوستانی گویا ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں جا پڑیں گے۔

پھر یہ بھی سوال حل طلب ہے کہ ریاستیں اگر شامل ہوں تو کس مجلس میں؟ اگر کہو کہ اسمبلی میں تو اسمبلی افراد کی نمائندہ ہے نہ کہ علاقوں کی۔ پھر اسمبلی میں بجٹ وغیرہ بھی پاس ہوتے ہیں جن کے ساتھ ریاستوں کا کوئی تعلق نہ ہو گا۔ اگر کونسل آف سٹیٹ میں نمائندگی رکھی جائے تو ریاستوں کو قدرتاً اعتراض ہو گا کہ ان کو اس کونسل میں جگہ دی گئی ہے جس کے اختیارات محدود ہیں اور اس طرح ان کی رائے پر حد بندیاں لگا دی گئی ہیں۔ پس بوجہ اس کے کہ ان سے مشورہ پوری طرح نہیں لیا گیا وہ مرکزی مجلسوں کے فیصلوں کے پابند نہیں ہو سکتے۔

پھر ایک اور دقّت برطانوی ہندوستان کے لئے پیش آئے گی اور وہ یہ ہے کہ کونسل آف سٹیٹ کو بہر حال علاقوں کا قائم مقام رکھنا ہو گا لیکن اگر ریاستیں اس میں شامل ہوئیں تو صوبوں کا توازن خراب ہو جائے گا اور قانون اساسی بالکل خطرہ میں پڑ جائے گا کیونکہ صوبوں کے حقوق

سے ریاستوں کو کوئی دلچسپی نہ ہو گی کیونکہ وہ خود معاہدات کے رو سے دخل اندازی سے محفوظ ہوں گی۔ پس ان کے نمائندے اگر ان لوگوں سے مل گئے جو اتصالی حکومت کی تائید میں ہوں گے تو صوبہ جات کی آزادی تباہ ہو جائے گی۔

یہ اور ایسی ہی اور بہت سی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے جب تک ریاستیں پولیٹیکل محکمہ کے ساتھ وابستہ ہیں اور جب تک ان میں انتخابی حکومت کا طریق جاری نہیں ہو تا وہ ہندوستان کی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ میں شامل نہیں ہو سکتیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان دونوں امور میں تبدیلی ریاستوں کے لئے مفید ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس فائدہ کو ابھی تسلیم نہیں کرتیں اور جب تک وہ تسلیم نہ کریں انہیں نہ مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس صورت میں ہندوستان کے مفاد کو عموماً اور اقلیتوں کے مفاد کو خصوصاً خطرہ میں ڈالا جا سکتا ہے۔ پس ضرورت ہے کہ اس سوال کو کسی اور نقطہ نگاہ سے دیکھا اور حل کیا جائے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اتحادی حکومت کا طریق برطانوی ہند اور ریاستی ہند میں الگ الگ جاری کیا جائے۔ ریاستی ہند کا اتحاد کس قسم کا اتحاد ہو ہمیں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال چیمبر آف پرنسز (CHAMBER OF PRINCES) کے ذریعہ سے یا کسی اور ذریعہ سے وہ بھی اپنے نظام میں ایک یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کریں اور پھر ان دونوں نظاموں کی ایک کانفیڈریشن (CONFEDERATION) بنا دی جائے۔ وہ ہندوستان کی فیڈریشن (FEDERATION) میں تو شریک نہ ہوں لیکن کانفیڈریشن میں شریک ہوں اور انہیں ہندوستان کے قانون سے تو کچھ تعلق نہ ہو لیکن کسٹمز' ریلوے' سکہ' صرافی' پوسٹ آفس' تار' ہوائی جہاز' سڑکوں' بے تار برقی کا آلہ' تجارت' بنکنگ' ماوراء البحر ہندوستانیوں کے حقوق' افیون وغیرہ (یہ فہرست سائمن کمیشن رپورٹ سے لی گئی ہے۔) قسم کے امور کے تصفیہ کے لئے سرِدست ریاستوں کی فیڈریشن برطانوی ہند کے ساتھ شریک ہو جائے۔

سائمن کمیشن نے دونوں حصوں کے تعاون کے لئے ایک کمیٹی تجویز کی ہے جس میں کچھ لوگ تو برطانوی ہند سے شامل ہوں اور کچھ لوگ والیان ریاست کی طرف سے۔ حکومتِ ہند کے نمائندے کمیشن نے دو قسم کے تجویز کئے ہیں۔ یعنی کچھ تو مجالس قانون ساز سے چنے جائیں

اور کچھ وائسرائے مقرر کریں۔ لیکن جو سب سے اہم سوال تھا کمیشن نے اسے حل نہیں کیا' یعنی ان کے آپس میں ملنے اور مشورہ کرنے کا فائدہ کیا ہو گا؟ اس نے صرف یہ ذکر کیا ہے کہ اس کمیٹی کے غور و خوض کا نتیجہ اسمبلی اور چیمبرز آف پرنسز دونوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ لیکن گو اس سے بِالواسطہ طور پر تو کچھ فائدہ ہو لیکن بلاواسطہ طور پر اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ پس میرے خیال میں سائمن کی تجویز سے زیادہ اتحاد پیدا کرنے والی تجویز ہونی چاہئے تا کہ آپس میں اتحاد کا راستہ نکل آئے۔

میں لکھ چکا ہوں کہ سب سے پہلے ضروری ہے کہ ریاستوں کا آپس میں کوئی نظام ہو۔ والیانِ ریاست کے دلوں میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ یہ امران کے درجہ کے منافی ہے کہ وہ ہندوستان کے باشندوں سے مل کر کام کریں اور ان کا یہ احساس کسی زیادہ گہرے تعلق کے پیدا کرنے میں روک ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی کہ ایک علاقہ کی حکومت جمہوری ہے اور دوسری شخصی، روک پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر ریاستوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو جائے کہ ان کی چیمبرز آف پرنسز بجائے خالی غور کرنے والی مجلس کے ایک قسم کی اتحادی مجلس ہو تو پھر ہندوستانی اور ریاستی علاقوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ انتظام کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کی ایگزیکٹو آپس میں مشورہ کر لیا کرے لیکن یہ تدبیر تبھی کامیاب ہو سکتی ہے کہ جب دونوں کا نظام نیابتی ہو۔ یعنی دونوں شاخوں کا نظام کثرت رائے کا آئینہ ہو تا کہ دونوں مجالس جو رائے مشورہ سے قائم کریں اسے اپنی اپنی مجالس میں منظور بھی کروا سکیں۔ گویا یہ اس قسم کا مشورہ ہو گا جیسا کہ برطانیہ کی امپیریل (IMPERIAL) کانفرنس ہوتی ہے کہ مجلس عاملہ کے ممبر آپس میں مل کر ایک پالیسی طے کر لیتے ہیں اور پھر اپنی اپنی مجالس میں اپنے اثر اور رسوخ سے اسے منظور کروا لیتے ہیں۔

اگر اس قسم کے نظام کے بنانے میں ہم کامیاب ہو جائیں تو اس سے کئی قسم کے فوائد ہوں گے۔

(۱) ریاستوں کو آپس میں ایسے اتحاد سے دریغ نہ ہو گا جس میں والیان ریاست یا ان کے نمائندے شامل ہوں اور ایک ایسی مرکزی مجلس بنا لیں جس میں ایسے امور جو مرکزی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مشورہ سے طے کیا کریں اور اس مجلس کا فیصلہ ان مشترک امور میں سب ریاستوں کے لئے واجب الاطاعت ہو۔

(۲) ریاستوں کو اس طرح نیابتی حکومت کرنے کی عادت ہو جائے گی اور گو شروع شروع میں وہ صرف اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کریں گے لیکن اس عادت کے پڑ جانے کے بعد امید ہے کہ برطانوی ہند کے نمائندوں سے مل کر کام کرنے میں بھی انہیں اعتراض نہ ہو گا۔ مل کر کام کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ اس مجلس کے فیصلوں کے ماننے سے انہیں انکار نہ ہو گا جس میں وہ اپنی تعداد کے مطابق نیابت رکھتے ہوں گے۔

(۳) اگر اس قسم کی فیڈریشن ریاستوں میں قائم ہو گئی تو ریاستوں کا انتظام بھی پہلے سے اچھا ہو جائے گا۔ اس وقت فرداً فرداً تو بعض ریاستوں کا بہت اچھا انتظام ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض ریاستوں سے برطانوی ہند بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لیکن یکسانیت ریاستوں میں مفقود ہے۔ بعض ریاستوں کا انتظام ایسا خراب ہے کہ اسے حکومت نہیں کہہ سکتے صرف خدا تعالیٰ کا عذاب کہہ سکتے ہیں۔ پس اگر فیڈریشن قائم ہو جائے گی تو نیابتی حکومت کی عادت اندرونی معاملات پر بھی اثر انداز ہو گی اور مشترک تصفیہ سے ریاستوں میں ایک یکسانیت بھی پیدا ہو جائے گی۔

(۴) برطانوی ہند کا نظام خراب ہوئے بغیر برطانوی ہند اور ریاستی ہند مشترک ہو کر کام کر سکیں گے۔

(۵) اس اشتراک کے نتیجہ میں نوّے فیصدی امید ہو گی کہ دونوں حصوں کی مجلسوں میں سمجھوتے کے مطابق قانون پاس ہو جائے۔

(۶) آئندہ کے لئے دونوں فریق کے فیڈریشن میں شامل ہونے کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ یہ سوال کہ ریاستیں کوئی بڑی اور کوئی چھوٹی ہیں۔ ان کی فیڈریشن کس اصول پر بن سکتی ہے کوئی زیادہ اہم نہیں کیونکہ اس کا حل ہم پرانی امپیریل جرمن بنڈیسریٹ (BUNDESRAT) کے اصول پر کر سکتے ہیں جس میں کہ جرمن ریاستوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ ان جرمن ریاستوں کے رقبے اور آبادی میں اس قدر فرق تھا کہ امریکہ کے پریذیڈنٹ مسٹر لاول نے ان کے اتحاد کے متعلق کہا تھا کہ یہ ایک اتحاد ہے جس میں

"ایک شیر، نصف درجن کے قریب لومڑیاں اور بیس کے قریب چوہیاں شامل ہیں۔"

ہندوستان کی ریاستوں کا تفاوت بھی اسی قسم کا ہے۔ پس اسی اصل پر کہ جو جرمن ریاستوں نے قبول کیا تھا ہندوستانی ریاستیں اپنا نظام قائم کر سکتی ہیں۔

وہ اصل جو جرمن ریاستوں نے اپنی نیابت کے لئے تسلیم کیا تھا یہ تھا کہ کسی ریاست کو حق نیابت نہ اس کے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دیا جائے گا اور نہ چھوٹی بڑی ریاستوں کو یکساں حق ملے گا بلکہ دونوں امور کو مدنظر رکھ کر ایک نسبت نکال لی جائے گی جس کے مطابق مختلف ریاستوں کو حق دیا جائے گا۔ چنانچہ اس اصل کے مطابق انہوں نے پرشیا کو جس کی آبادی باقی سب ریاستوں کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ تھی اٹھاون میں سے کُل سترہ ووٹ دیئے تھے۔ یہاں بھی اسی اصول پر ریاستوں کی نمائندگی رکھی جائے۔ یعنی چھوٹی ریاستوں کو اس لحاظ سے کہ وہ اپنے گھر میں ویسی ہی آزاد ہیں جیسے کہ بڑی ریاستیں، کچھ زائد حق دیا جائے اور بڑی ریاستوں کو بوجہ اس کے کہ ان کی نمائندگی اگر ان کے رقبے اور آبادی کے مطابق ہو تو وہ چھوٹی ریاستوں کی آواز کو بالکل دبا دیں گی ان کے حق سے کم ملے۔

اسی طرح ریاستوں کی مجلس کی ساخت بھی اس امپیریل بنڈسٹریٹ کے اصول پر ہو کیونکہ دوسری تمام دنیا کی مجالس سے اس میں یہ فرق ہو گا کہ اس میں یا والی ریاست ممبر ہو گا یا اس کا مقرر کردہ شخص اور جس ریاست کے زیادہ ممبر ہوں گے وہ سب کے سب ایک رائے دینے پر مجبور ہوں گے۔ کیونکہ وہ والی ریاست یا ریاست کے نمائندے ہوں گے نہ کہ افراد کے۔ اور یہی حال جرمن بنڈیسریٹ (BUNDESRAT) کا ۱۹۱۰ء سے پہلے تھا۔ پروفیسر ڈبلیو۔ بی مانرو (W.B.MANROE) اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جرمن کی فیڈرل مجلس بنڈیسریٹ (BUNDESRAT) کے ممبر معیّن میعاد کے لئے مقرر نہیں ہوتے تھے بلکہ ان ریاستوں کو جن کے وہ نمائندے تھے اختیار ہوتا تھا کہ جب چاہیں انہیں واپس بُلالیں۔ یہ ممبراُن ہدایات کے ماتحت رائے دیتے تھے جو اُن کو اُن کی ریاستوں کی طرف سے ملتی تھیں اور اسی لئے ہر ایک ریاست کے جملہ ممبر متحدہ صورت میں ووٹ دیتے تھے۔ بلکہ ہر ریاست کا ہر ممبر اپنی ریاست کی طرف سے ووٹ دے سکتا تھا اور اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ کسی ریاست کے دوسرے ممبر بھی حاضر ہوں۔ اس جہت سے بنڈیسریٹ گویا ایک سفراء کا مجمع تھی نہ کہ نمائندوں کی مجلس...... یہ محض ایک بین الاقوام مجلس شوریٰ نہیں

تھی۔ بلکہ نظام اساسی کا حصہ تھی۔ جسے قانون سازی کا اختیار حاصل تھا۔"۶۵ٖ
اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ جرمن سینٹ کی ساخت ایسی تھی جیسے کہ سفیروں کی کونسل کی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اسے قانون پاس کرنے کی بھی اجازت تھی اور اسی قسم کی کونسل کی اس وقت ریاستوں کو ضرورت ہے۔ یعنی اس کے نمائندے والیان ریاست کے نمائندے ہوں اور انہیں ووٹ کا حق ذاتی حیثیت میں حاصل نہ ہو بلکہ ریاست کا نمائندہ ہونے کی حیثیت میں ہو اور جب ریاست چاہے پہلے نمائندہ کو واپس بلا لے اور نیا نمائندہ بھیج دے اور اگر ایک نمائندہ غیر حاضر ہو تو دوسرا اس کا ووٹ بھی دے دے کیونکہ ووٹ نمائندہ کا نہیں بلکہ ریاست کا ہے۔

اس طریق عمل کو اختیار کر کے ریاستیں پہلا قدم فیڈریشن کے اصول کی طرف اٹھا سکتی ہیں ورنہ ان کا اتحاد مشکل ہے کیونکہ حیدر آباد، میسور، کشمیر، بڑودہ وغیرہ بڑی ریاستیں جب قانون ساز مجالس کے بنانے کا سوال آئے گا ضرور اپنی بڑائی کا سوال اٹھائیں گی پس ان کے مطالبہ کا حل اور چھوٹی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت مذکورہ بالا اصل کے ماتحت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اس نظام کے ماتحت بڑی ریاستوں کو ایک حد تک زائد نمائندگی بھی مل سکتی ہے اور پھر ریاستوں میں جو شخصی حکومت کا طریق ہے اس کے قائم رہتے ہوئے ایک نمائندہ مجلس بھی تیار ہو سکتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بعض ریاستیں ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہونے کو تیار ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے جب تک ریاستیں پولیٹیکل سیکرٹری کے ماتحت ہیں اور جب تک ان کے نمائندوں کو والیانِ ریاست نے خود چننا ہے اور جب تک ان کے نمائندوں کی رائے والیانِ ریاست کے تابع رہنی ہے اس وقت تک ہندوستان کی آزادی کو خطرہ میں ڈالے بغیر وہ ہندوستانی فیڈریشن میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ ان سوالات کو وہ حل کر دیں تو پھر ان کے فیڈریشن میں شامل ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب تک یہ نہ ہو تو صرف یہی طریق ہے کہ وہ بھی صوبہ جاتی اور مرکزی اصول پر ایک تقسیم اپنے کاموں کی کریں۔ صوبہ جاتی قسم کے کاموں میں ہر ریاست خود مختار ہو۔ مرکزی قسم کے کاموں میں وہ مرکزی مجلس کے فیصلوں کی پابند ہو۔ اس مرکزی مجلس کی ایگزیکٹو نمائندگی کے اصول پر ہو اور اکثریت کی نمائندہ ہو۔ وہ امور جن کے متعلق یہ مجلس اور برطانوی ہند اشتراکِ عمل کا فیصلہ کر

لیں ان کے متعلق جب کوئی سوال ہو تو اس وقت کی برطانوی ایگزیکٹو اور ریاستی ایگزیکٹو مل کر ایک مسودہ تیار کرلیں۔ چونکہ دونوں کو اپنی اپنی مجلس میں اکثریت حاصل ہوگی اس لئے دونوں ان مسودات کے پاس کرانے میں کامیاب ہو سکیں گی۔ اگر مسودات کے پیش کرنے کے بعد ممبران مجلس میں زیادہ مخالفت نظر آئے تو دونوں پھر مل کر مشورہ کرلیں اور ایسے تغیرات کر لیں جو دونوں کے لئے تسلی کا موجب ہوں۔ اس طرح اکثر امور میں مشورہ کے ساتھ کام ہو سکے گا اور جب تک فیڈریشن مکمل نہ ہو یہی ہو سکتا ہے کہ جس قدر اتحاد ہو سکے اسے قبول کر لیا جائے۔

لیکن ایک اور امر بھی غور طلب ہے اور وہ یہ کہ اوپر کی سکیم اسی وقت چل سکتی ہے جب کہ دونوں فیڈریشنوں کی ایگزیکٹو مجلسیں کونسلوں کے آگے جواب دہ ہوں۔ جب تک یہ بات نہ ہو ایگزیکٹو کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی اور وہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ پس اس وقت تک کے لئے کیا انتظام ہوگا؟

میرے نزدیک اس وقت تک کے لئے یہ علاج ہو سکتا ہے کہ ایک سب کمیٹی اس قسم کی جیسی کہ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کی مجلس مندوبین میں ہوتی ہے بنا دی جائے۔ اس میں مجلس کی سب پارٹیوں کے ممبر شامل ہوں۔ اسی قسم کی ایک کمیٹی چیمبر آف پرنسز کی طرف سے ہو۔ ان دونوں کمیٹیوں کا یہ کام ہو کہ جو مسودہ بھی ایگزیکٹو کی طرف سے ان امور کے متعلق پیش ہونا ہو۔ جن میں اشتراک کا فیصلہ کیا گیا ہو وہ پہلے ان کے مشترک اجلاس میں پیش ہو اور اس صیغہ کا سیکرٹری اور اسی طرح مجالس مرکزی کے پینل سے چُنا ہوا اسسٹنٹ سیکرٹری ان لوگوں سے مشورہ کرے اور جس قدر اثر یہ کمیٹی ڈال سکے ڈال کر مسودہ ایسی شکل میں تجویز کیا جائے جو سب کے لئے قابل منظوری ہو۔ اس صورت میں چونکہ ایگزیکٹو کو مجلس میں اکثریت نہ ہوگی اس لئے اس قدر فائدہ تو نہ ہوگا جو اول الذکر صورت میں ہے لیکن بہرحال ایک حد تک تعاون کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

میں اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک دفعہ پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ریاستوں کو ایک دفعہ سنجیدگی سے اور پھر زمانہ کی رفتار پر غور کر کے اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں۔ اس میں ان کی بھی عزت اور ان کی رعایا اور ان کے ملک کی بھی بہتری ہے۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ ان سے بہت زیادہ

صاحبِ اقتدار اور بہت زیادہ اختیار رکھنے والی حکومتیں آخر میں نیابتی اور اتحادی اصول کی طرف مائل ہونے کے لئے مجبور ہوئی ہیں۔ پس جو کل ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہو گا اور خراب صورت میں ہو گا وہ کیوں آج عمدگی اور نظام کے ساتھ نہ ہو جائے۔ اگر وہ فوراً فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو جائیں تو ہم پھر امپیریل جرمنی کانسٹی ٹیوشن کی نقل کر کے اپنی مشکلات کا حل سوچ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ مجلس مندوبین میں صوبوں اور ریاستوں کی رعایا کے افراد کے نمائندے ہوں اور دوسری مجلس کو بجائے کونسل آف سٹیٹ کے سٹیٹس کونسل قرار دے دیا جائے اور اس میں ریاستوں اور صوبہ جات کی حکومتوں کی نمائندگی کا طریق جاری کر دیا جائے۔ اس وقت یہ بات آسانی سے ہو سکتی ہے لیکن بعد میں اس قسم کے تغیرات مشکل ہوں گے۔

باب دہم

متفرق

میں نے مالی امور کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور نہ اس مضمون کی مجھے اس قدر واقفیت ہے۔ لیکن صوبہ جات اور مرکزی خزانوں کی تقسیم میں یہ دو امور مدنظر رکھنے ضروری ہیں:-

(۱) علمی اور تمدنی ترقی کے تمام کام صوبہ جات کے اختیار میں ہوں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اموال کی تقسیم ایسی ہو کہ صوبہ جات ان اہم محکموں میں ترقی کر سکیں' ورنہ حکومت کے جو اصل مطلوب امر ہیں وہ بغیر کافی توجہ کے رہ جائیں گے۔

(۲) صوبہ جات کو اپنے اعتبار پر قرض لینے کی اجازت ہونی چاہئے گو یہ شرط ہو جائے کہ ہر صوبہ صرف اپنے علاقے کے اندر قرض لے سکتا ہے۔ بیرون ہند کی منڈی سے یا دوسرے صوبوں سے بغیر اجازتِ مرکز قرض نہ لے تا کہ ناجائز مقابلہ نہ ہو۔ اس قسم کی اجازت دینے سے مرکز سے مقابلہ کی صورت پیدا ہونے کا ہرگز احتمال نہیں کیونکہ اول تو بڑے بڑے مالداروں کے تعلقات مرکزی حکومت کے ساتھ ہی ہوں گے' کیونکہ بڑا گاہک لوگوں کی توجہ کو زیادہ کھینچتا ہے' دوسرے ہندوستان سے باہر کی منڈیاں اسی کے اختیار میں رہیں گی۔

(۳) جن صیغوں کی آمد صوبہ جات کے اخراجات کی وجہ سے بڑھے ان کی آمد کی ترقی میں صوبہ جات کو بھی حصہ دار مقرر کیا جائے ورنہ آزادی کے حصول کے بعد تو مرکزی حکومت انہیں مجبور نہ کر سکے گی۔ پس وہ ان صیغوں کی طرف کم توجہ دیں گے اور مرکز کے مالیات کو نقصان پہنچے گا یا کم سے کم آپس کے تعلقات کشیدہ ہوں گے۔

اب ایک اور بات ہے جس کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ مرکزی حکومت اور سیکرٹری آف سٹیٹ کا تعلق ہے۔ میرے نزدیک وزیر ہند کی کونسل کو تو فوراً منسوخ کر دینا

چاہئے۔ اس کی کوئی ذمہ واری نہیں ہے اور وہ خواہ مخواہ وزیر ہند کے کام کو ایک کونسل کے کام کے مشابہ دکھا کر لوگوں کو غلطی میں ڈالتی ہے اور جب اصولاً ہندوستان کی نسبت حکومتِ خود اختیاری کا فیصلہ ہو گیا تو پھر اس مجلس کی ضرورت بھی نہیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کا تعلق آئندہ حکومت ہند سے محدود ہو جانا چاہئے۔ یعنی صرف انہی معاملات میں اس کا تعلق گورنر جنرل سے رہے جو ابھی حکومت ہند کے قبضہ میں رہیں گے یعنی پولیٹیکل اور فوج اور فارن یا اس کام کے متعلق جو گورنر جنرل یا گورنروں کے سپرد بحیثیت گورنر جنرل یا گورنر کیا گیا ہو۔ باقی سب امور کا تصفیہ گورنر جنرل ہندوستان میں کریں اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ واری رپورٹ یا ماہواری، وزیر ہند کو جایا کرے جس سے انہیں حالات سے آگاہی رہے۔

تتمہ میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے محض اس نیت سے لکھا ہے کہ شاید ان باتوں سے کوئی امر ہندوستان کے نمائندوں یا برطانیہ کے نمائندوں کی توجہ کو کھینچ لے اور اس عظیم الشان سوال کے حل کرنے میں جو اس وقت دو عظیم الشان ملکوں کے سامنے اور جس کے حل ہونے پر خدا تعالیٰ کی تینتیس کروڑ مخلوق کے آرام یا تکلیف کا انحصار ہے میں کچھ حصہ لے کر ثواب کا مستحق ہو جاؤں۔ اور اگر میں کسی جگہ تفصیلات میں پڑا ہوں تو محض اس وجہ سے کہ ان سے میرے مقرر کردہ اصول کی تشریح ہو جائے ورنہ مجھے خوب معلوم ہے کہ سیاسی مسائل بھی دوسرے مسائل کی طرح سینکڑوں طریق پر حل کئے جا سکتے ہیں اور کسی شخص کا یہ کہنا کہ اس کی بتائی ہوئی تفصیل ہی کام کو درست کر سکتی ہے نرم سے نرم لفظوں میں بھی ایک بے دلیل بات کہلانے کا مستحق ہے۔ ہاں اصول ایک ایسی چیز ہیں جنہیں ہم دعویٰ کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں اور ان اصول کے متعلق جو میں نے پیش کئے ہیں میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے نہایت معقول اور منصفانہ ہیں اور ان کو نظر انداز کر کے ہندوستان میں عدل اور انصاف کا قائم کرنا قریباً ناممکن ہے۔

میں آخر میں تمام نمائندگان راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، ممبرانِ پارلیمنٹ اور ہندوستان اور انگلستان کے بارسوخ افراد سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک اہم ذمہ واری کی ادائیگی اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے۔ پس تمام قسم کے تعصّبات سے بالا ہو کر اس کام کو کرنے کی کوشش کریں تا کہ آئندہ آنے والی نسلیں ان کے نام کو یاد رکھیں اور ان کے فیصلوں سے سُکھ پانے والوں کی دعائیں ان کو ہمیشہ پہنچتی رہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل کے

مستحق ہو جائیں۔

نفسانیت عارضی معاملات میں بھی بُری ہے لیکن وہ فیصلے جن کا اثر شاید سینکڑوں ہزاروں سال تک قائم رہنا ہے اور اربوں انسانوں پر پڑنا ہے ان پر پہنچتے وقت ذاتی رنجشوں یا دنیوی فوائد کی خواہش کو اپنے اوپر غالب آنے دینا ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی نیتوں کو صاف اور ارادوں کو بلند اور عقلوں کو تیز کرے اور اس اجتماع اور اس اجتماع کے نتیجہ میں ہونے والے فیصلوں کو ہندوستان اور انگلستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رشتہ اتحاد کے پیدا کرنے کا موجب بنائے تا کہ ہم سب خدا تعالیٰ کی ذمہ واریوں سے بھی اور اپنے ہمعصروں اور اپنی آئندہ نسلوں کی ذمہ واریوں سے بھی عزت کے ساتھ سبکدوش ہوں اور تا اس وقت کہ ہم اس دنیا سے جدا ہوں دنیا اس وقت سے جب کہ ہم اس میں آئے تھے نیکی، محبت اور یگانگت میں ایک لمبا فاصلہ طے کر چکی ہو۔ آمین۔ ثم آمین وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

انگلینڈ اور ہندوستان کے چیدہ اصحاب کی آراء

چونکہ گول میز کانفرنس میں مسائل ہند کے متعلق گفتگو شروع ہو چکی تھی اس لئے مسلمانوں کے حقوق اور مطالبات اور ان کی معقولیت سے سیاسی لیڈروں اور حکومت ہند اور برطانیہ کے ارکان کو آگاہ کرنے کے لئے اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن انگلستان اور ہندوستان میں بکثرت مفت تقسیم کیا گیا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے پر جو آراء ظاہر کی گئیں ہیں ان میں سے چند ایک بطور نمونہ درج ذیل کی جاتی ہیں:۔

○ لارڈ میسٹن سابق گورنر یو۔پی:۔

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے امام جماعت احمدیہ کی نہایت دلچسپ تصنیف ارسال فرمائی ہے۔ میں نے قبل ازیں بھی ان کی چند تصنیفات دلچسپی سے پڑھی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا پڑھنا میرے لئے خوشی اور فائدے کا موجب ہوگا"۔

○ لفٹیننٹ کمانڈر کینورذی ممبر پارلیمنٹ:۔

"کتاب ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" کے ارسال فرمانے پر آپ کا بہت ممنون ہوں۔ میں نے اسے بہت دلچسپی سے پڑھا ہے"۔

○ سر میلکم ہیلی (SIR MALCOLM HAILEY) گورنر صوبہ یو۔پی و سابق گورنر پنجاب:۔

"میرے پیارے مولوی صاحب (امام مسجد لندن)

اس کتاب کے لئے جو آپ نے امام جماعت احمدیہ کی طرف سے میرے نام بھیجی ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ جماعت احمدیہ سے میرے پُرانے تعلقات ہیں اور میں اس کے حالات سے خوب واقف ہوں۔ اور اس روح کو خوب سمجھتا ہوں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جسے لیکر وہ ہندوستان کے اہم مسائل کے حل کے لئے کام کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ

یہ کتاب میرے لئے مفید ہوگی اور میں اسے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھوں گا۔

○ سردار محمد اسماعیل بیگ دیوان ریاست میسور:۔

"سر مرزا آپ کی کتاب پا کر بہت ممنون ہیں۔ وہ اسے بہت دلچسپی سے پڑھیں گے۔ علی الخصوص اس وجہ سے کہ وہ آپ کی جماعت کے امام سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں۔"

آپ کا صادق

آئی۔ ایم۔ ایس۔ سیکرٹری

○ مسٹر اے۔ ایچ غزنوی آف بنگال:۔

"کتاب ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" کے لئے مسٹر اے۔ ایچ غزنوی مولوی فرزند علی صاحب کے بہت ممنون ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو بہت دلچسپ پایا ہے۔"

○ مسٹر ڈبلیو۔ پی۔ بارٹن (Mr.W.P.Barton)

"میں جناب کا امام جماعت احمدیہ کی تصنیف کردہ کتاب کے ارسال کرنے کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ایک نہایت دلچسپ تصنیف ہے۔ میرے دل میں اس بات کی بڑی وقعت ہے کہ مجھے اس کے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔"

○ مسٹر آر۔ ای ہالینڈ (انڈیا آفس) Mr. R. E. Holland (India Office)

"جناب کے ارسال فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے اسے بہت دلچسپ پایا ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

○ سر ہون اوملر (SIR HONEO'MILLAR)

"اس چھوٹی سی کتاب کے ارسال کے لئے جس میں مسئلہ ہند کے حل کے لئے امام جماعت احمدیہ کی تجاویز مندرج ہیں۔ میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سائمن کمیشن کی تجاویز پر یہی ایک مفصل تنقید ہے جو میری نظر سے گزری ہے۔ میں ان تفصیلات کے متعلق کچھ عرض نہ کروں گا جن کے متعلق اختلاف رائے ایک لازمی امر ہے۔ لیکن میں اس اخلاص، معقولیت اور وضاحت کی داد دیتا ہوں جس سے کہ ہز ہولی نس (HIS HOLINESS) (امام جماعت احمدیہ) نے آپ کی جماعت کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور میں ہز ہولی نس کے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے اس امر کے متعلق بلند خیالی سے بہت متأثر ہوا ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک بارنس میں حاضر ہو کر آپ کی مسجد کو نہیں دیکھ سکا اور

نہ آپ سے ملاقات کر سکا ہوں۔ کل امید ہے کہ اگر موسم نے مجھے اتنا سفر کرنے کی اجازت دی تو میں چوہدری ظفراللہ خان کی دعوت سے فائدہ اٹھا کر آپ کے ساتھ آپ کے اپنے لوگوں میں ملاقات کروں گا۔"

○ لارڈ کریو۔ سابق وزیر ہند

"لارڈ کریو مسئلہ ہند پر امام جماعت احمدیہ کی تصنیف کردہ کتاب کے ارسال کے لئے امام مسجد لنڈن کے بہت ممنون ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی ہے۔"

○ سرای گیٹ (SIR. E. GATT)

"میں جناب کا کتاب "ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" کے ارسال کے لئے نہایت شکر گذار ہوں اور اسے نہایت دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔"

○ سر گریہم بوور

"میں مسئلہ ہند پر آپ کی ارسال کردہ کتاب کے لئے آپ کا بہت مشکور ہوں اور میں اسے نہایت دلچسپی سے پڑھوں گا۔ گول میز کے مندوبین نے ابتداء تو اچھی کی ہے۔ یوں تو میرا خیال ہے کہ فیڈرل سسٹم کو سبھی پسند کرتے ہیں لیکن تفاصیل کے متعلق دقتیں ہیں۔ مثلاً ہندوستان کی فوج اقوام کی اکثر مسلمان ہوں اور ہندی افواج میں اعلیٰ ترین رجمنٹیں مسلمانوں کی ہیں۔ تو کیا یہ تجویز ہے کہ انگریز افسروں کی بجائے ہندی افسر مقرر کر دئے جائیں؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نظام چل نہ سکے گا۔ یہی میری رائے پولیس کے متعلق ہے۔ فوج اور پولیس کا سوال ظاہراً تو بہت آسان ہے لیکن عملاً اتنا آسان نہیں۔ میں یہ کتاب سر جیمز۔آرانز سابق چیف جسٹس جنوبی افریقہ کو بھیجوں گا اور اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اخبار (کیپ ٹائمز) کے ایڈیٹر کو اس کا دیباچہ شائع کرنے پر آمادہ کریں۔

جنوبی افریقہ میں یہودیوں کا بڑا اثر ہے اور ریاستہائے متحدہ کے یہودیوں کے علاوہ دوسرے درجہ پر صیہون فنڈ میں چندہ دینے والے یہیں کے یہودی ہیں۔ یہی صوبہ جاتی تحریک انہیں مسلمانوں کا دشمن بنائے ہوئے ہے۔ یورپین لوگ خاص کر انگریز مسلمانوں کے حق میں ہیں اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ اخبار (کیپ ٹائمز) ہز ہولی نس کی اس تصنیف کا دیباچہ شائع کرے۔"

○ سر جان کر (SIR. JOHN KERR)

کتاب "ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" کی ایک جلد ارسال فرمانے کے لئے میں آپ کا بہت مشکور ہوں اور میں اسے بہت دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔"

○ لارڈ ڈارلنگ (LORD DARLING)

"لارڈ ڈارلنگ امام مسجد لندن کی طرف سے مسئلہ ہند کے متعلق کتاب پاکر بہت مشکور ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اس کتاب سے انہیں بہت سی کار آمد معلومات اور تنقید ملے گی۔"

○ سر جیمز واکر (SIR. GAMES WALKER)

"مجھے ایک جلد "ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" مصنفہ جناب امام جماعت احمدیہ ملی ہے۔ میں اس کے لئے آپ کا بہت مشکور ہوں۔ میں نے اس کے بعض جستہ جستہ مقامات دیکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تصنیف قابلِ دید ہو گی۔"

○ میجر آر۔ ای۔ فشر۔ سی۔ بی۔ ای (MAJOR R. E. FISHER)

"آپ نے از راہ کرم مجھے مسئلہ ہند پر امام جماعت احمدیہ کی تصنیف کردہ کتاب ارسال فرمائی۔ اس کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ میں اسے بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ مجھے ہندوستان اور دوسرے ممالک میں جو تجارب حاصل ہوئے ہیں ان کی بناء پر آپ کے مقاصد سے ہمدردی ہے۔ بطور ممبر انڈین ایمپائر سوسائٹی (INDIAN EMPIRE SOCIETY) کے میں یقیناً ہمیشہ اس بات کا حامی رہوں گا کہ اسلام کے متعلق جو برطانیہ کی ذمہ واری ہے وہ ہماری قوم کے اعلیٰ ترین اخلاقی فرائض میں سے ہے۔

میں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال مسلمانوں میں رہ کر گزارے ہیں۔ وہ رواداری اور مہمان نوازی اور سخاوت جو مسلمان دوسری موحد اقوام سے برتتے ہیں اسلام کے اعلیٰ معیارِ تعلیم کی شاہد ہے ہر دو مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت میں ایک مجانست ہے۔ اسلام عیسائیت کی روایات کو قدر اور عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس سے دونوں مذاہب میں ایک مضبوط اتحاد پیدا ہو جانا چاہئے۔ اگرچہ میں خود عیسائی ہوں لیکن پھر بھی میں اسلامی روح کو جس نے ترقی اور تہذیب کے پھیلانے میں بڑی مدد دی ہے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔"

○ آنریبل پیٹرسن۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ای (Honourable Peterson)

کتاب "ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" کے ارسال کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے ابھی تک اس کے ختم کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ امید ہے چند دنوں میں ختم کرلوں گا۔ لیکن جس

قدر میں نے پڑھا ہے اس سے ضرور اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصنیف موجودہ گتھی کے سلجھانے کے لئے ایک دلچسپ اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ مسلمانوں کا نقطۂ نظر اس میں بہت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ میں آپ سے جلد ملوں گا۔"

○ لارڈ ہیلشم (LORD HALISHAM)

"میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے وہ کتاب ارسال کی جس میں سائمن رپورٹ کے متعلق مسلمانوں کی رائے درج ہے۔ میں اس بات کی اہمیت کو سمجھتا ہوں کہ سائمن رپورٹ کو خالی الذہن ہو کر پڑھنا بہت ضروری ہے اور اسے ناحق ہدفِ ملامت بنانا یا غیر معقول مطالبات پیش کرنا درست نہیں۔ اس لئے مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ مجھے اس کے متعلق ہندوستان کے ایک ذمہ وار طبقہ کی رائے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔"

○ لارڈ سڈنہم

"میں اس بات کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مہربانی فرما کر مجھے جماعت احمدیہ کے خیالات سے جو ہز ہولی نس نے بڑی خوبی سے بیان فرمائے ہیں آگاہ ہونے کا موقع دیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہز ہولی نس اس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان ابھی درجہ نو آبادیات کے لائق نہیں اور یہ کہ بہت سے دوسرے مبصرین کی طرح ہز ہولی نس بھی اس خیال کے ہیں کہ انگریزی DEMOCRACY کے نمونہ پر ہندوستان کی حکومت ہونی چاہئے۔ مگر شاید انہیں یہ پتہ نہیں کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا پریذیڈینٹ اپنے وزراء خود چُنتا ہے اور یہ وزراء اس کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں نہ کہ ملک کی کانگریس کے سامنے۔ فیڈرل نظام پر عملدر آمد کرنے میں بعض خاصی دقتیں ہیں۔ اضلاع متحدہ امریکہ کو چار سال کی جنگ اور دس لاکھ آدمیوں کی جانوں کی قربانی کے بعد یہ درجہ ملا تھا۔ فی الحال جیسا کہ سائمن کمیشن کی رائے ہے ہندوستان فیڈرل حکومت کے قابل نہیں ہوا۔ کبھی ہندوستان کے سے حالات میں کسی ملک میں فیڈرل حکومت قائم نہیں ہوئی۔ فیڈریشنیں قدرتی طور پر خود بخود بن جایا کرتی ہیں جب لوگ ان کے لئے تیار ہوں۔

ہندوستان کو جو بہت کافی حد تک حکومت خود اختیاری دی جا چکی ہے اس پر جو کچھ بغیر کسی قسم کے خطرہ کے مستزاد کیا جا سکے اس میں دریغ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن میرے خیال میں سب سے اہم معاملہ پبلک کی بہبودی کا ہے جسے کانگریس اور بالشویک خیال کے لوگ مزید نقصان پہنچا

رہے ہیں۔"

○ برطانیہ کا مشہور ترین اخبار ٹائمز آف لندن (TIMES OF LONDON) مؤرخہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۰ء کے نمبر میں فیڈرل آئیڈیل (FEDERAL IDEAL) کے عنوان کے ماتحت ایک نوٹ کے دوران لکھتا ہے کہ:۔

"ہندوستان کے مسئلہ کے متعلق ایک اور ممتاز تصنیف مرزا (بشیرالدین محمود) خلیفۃ المسیح امام جماعت احمدیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔"

○ ایل۔ ایم ایمری۔ مشہور ممبر کنزرویٹو پارٹی

"میں نے اس کتاب کو بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے اور میں اس روح کو جس کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اور نیز اس محققانہ قابلیت کو جس کے ساتھ ان سیاسی مسائل کو حل کیا گیا ہے۔ نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

○ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب آف علی گڑھ تحریر فرماتے ہیں۔

"میں نے جناب کی کتاب نہایت دلچسپی سے پڑھی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی یورپ میں بہت اشاعت فرمائیں۔ ہر ایک ممبر پارلیمنٹ کو ایک ایک نقل ضرور بھیج دی جائے اور انگلستان کے ہر مدیر اخبار کو بھی ایک ایک نسخہ ارسال فرمایا جائے۔ اس کتاب کی ہندوستان کی نسبت انگلستان میں زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ جناب نے اسلام کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔"

○ سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون صاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ کراچی

"میری رائے میں سیاسیات کے باب میں جس قدر کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان میں کتاب "ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل" بہترین تصانیف میں سے ہے۔"

○ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال لاہور تحریر فرماتے ہیں۔

"تبصرہ کے چند مقامات کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ نہایت عمدہ اور جامع ہے۔"

○ اخبار انقلاب لاہور اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء میں رقمطراز ہے:۔

"جناب مرزا صاحب نے اس تبصرہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ بڑی بڑی اسلامی جماعتوں کا کام تھا جو مرزا صاحب نے انجام دیا۔"

○ اخبار سیاست اپنی اشاعت مؤرخہ ۲ دسمبر ۱۹۳۰ء میں رقمطراز ہے:۔

"مذہبی اختلافات کی بات چھوڑ کر دیکھیں تو جناب بشیر الدین محمود احمد صاحب نے میدانِ تصنیف و تالیف میں جو کام کیا ہے وہ بلحاظ ضخامت و افادہ ہر تعریف کا مستحق ہے اور سیاسیات میں اپنی جماعت کو عام مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو چلانے میں آپ نے جس اصولِ عمل کی ابتداء کر کے اس کو اپنی قیادت میں کامیاب بنایا ہے وہ بھی ہر منصف مزاج مسلمان اور حق شناس انسان سے خراج تحسین وصول کر کے رہتا ہے۔ آپ کی سیاسی فراست کا ایک زمانہ قائل ہے۔ اور نہرو رپورٹ کے خلاف مسلمانوں کو مجتمع کرنے میں سائمن کمیشن کے روبرو مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے میں، مسائل حاضرہ پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے مدلّل بحث کرنے اور مسلمانوں کے حقوق کے متعلق استدلال سے کتابیں شائع کرنے کی صورت میں آپ نے بہت ہی قابل تعریف کام کیا ہے۔

زیر بحث کتاب سائمن رپورٹ پر آپ کی تنقید ہے جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ جس کے مطالعہ سے آپ کی وسعتِ معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کا طرز بیان سلیس اور قائل کر دینے والا ہوتا ہے۔ آپ کی زبان بہت شُستہ ہے۔"

○ ایڈیٹر صاحب اخبار ہمت لکھنؤ مؤرخہ ۵۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کے پرچہ میں رقمطراز ہیں:۔

"ہمارے خیال میں اس قدر ضخیم کتاب کا اتنی قلیل مدت میں اردو میں لکھا جانا، انگریزی میں ترجمہ ہو کر طبع ہونا، اغلاط کی درستی، پروف کی صحت اور اس سے متعلقہ سینکڑوں دقّتوں کے باوجود تکمیل پانا اور فضائی ڈاک پر لنڈن روانہ کیا جانا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک ایسی جماعت ہے جو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اپنے فرائض سمجھ کر وقت پر انجام دیتی ہے اور نہایت مستعدی اور تندہی کے ساتھ۔ غرضیکہ کتاب مذکور ظاہری اور باطنی خوبیوں سے مزیّن اور دیکھنے کے قابل ہے۔"

۱؎ Modern Political Constitutions by Dr, C.F.Strong. M.A.P.H.D London Page 222 Published in London 1930.

۲؎ Constitutional Government in the United States by Mr. Woodrow Wilson Page, 54.

۳؎ ڈوور: شہر اور بندر گاہ۔ کینٹ انگلستان کی کھریا مٹی کی ڈھلوان چٹان کے نیچے ایک خلیج کے کنارے واقع ہے۔ یہ پانچ بندر گاہوں میں سب سے بڑی ہے جسے انگلستان کی کلید کہا

جاتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں اہم بحری اڈہ تھا اور دوسری عالمی جنگ میں دور مار جرمن توپوں کا مسلسل نشانہ بنا رہا۔ ڈوور کا تاریخی حصار اور شیکسپیئر کی چٹان قابلِ دید مقامات ہیں۔

(اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۶۲۸ مطبوعہ ۱۹۸۷ء لاہور)

۴؎ India as I Knew it by Sir, Michael O'Dwyer Page 414,415.

۵؎ India as I Knew it by Sir, Michael O'Dwyer Page 219.

۶؎ India as I Knew it by Sir, Michael O'Dwyer Page 225.

۷؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I Page 89.
Published in London 1929.

۸؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,II
Page 548,549 Published in London 1929.

۹؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol, II
Page 566,567 Published in London1929.

۱۰؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I
Page 568 Published in London 1929.

۱۱؎ MONTAGUE CHELMSFORD REPORT۔ جنگِ عظیم اول میں حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے حکومت کو امداد پہنچائی تو انہیں زیادہ سے زیادہ مراعات کا مستحق سمجھا جائے گا جب جنگ ختم ہوئی تو ہندوستانیوں کی طرف سے مطالبات شروع ہوئے جو ایجی ٹیشن کا رنگ اختیار کر گئے۔ لارڈ چیمس فورڈ جو لارڈ ہارڈنگ کے بعد ۱۹۱۶ء میں ہندوستان آئے تھے اور اب وائسرائے تھے نے مسٹر مانٹیگو (MR. MONTAGUE) کی معیت سے ہندوستان کے سیاستدانوں اور مدبّروں سے تبادلہ خیالات کر کے ایک رپورٹ تیار کی جو مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کے نام سے مشہور ہے۔ پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد یہ سکیم گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا نفاذ ۱۹۲۱ء میں ہوا جس کے تحت ہندوستانیوں کو حکومت کے انتظام میں حصہ دیا گیا اور بعض وزارتوں پر ہندوستانیوں کو مقرر کیا گیا۔

(ملخّص از نیو تاریخ انگلستان صفحہ ۳۱۳ مطبوعہ لاہور' آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان صفحہ ۱۳۶

مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء یونیورسٹی ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۳۶۵، ۳۶۶ مطبوعہ لاہور)

۱۲ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۵

۱۳ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۸

۱۴ Modern Political Constitutions by Dr, C.F.STRONG M.A.P.H.D London Page 163 Published in London 1930.

۱۵ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I Page 67 Published in London 1929.

۱۶ سناتن دھرم پرچارک ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء صفحہ ۲

۱۷ مسافر آگرہ (اخبار) جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۲

۱۸ ہندو سنگھٹن اور آریہ سماج صفحہ ۱۸۸

۱۹ ویدک انڈیا طبع دوم صفحہ ۹۷

۲۰ گدھ کا پراچین اتھاس صفحہ ۲۷، ۲۳

۲۱ سٹیٹس مین کلکتہ

۲۲، ۲۳ اخبار وکیل ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء

۲۴، ۲۵، ۲۶ ملاپ لاہور ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

۲۷، ۲۸ ملاپ ۲۳ جون ۱۹۲۸ء

۲۹ اخبار تیج دہلی

۳۰ آریہ ویر

۳۱ گرو گھنٹال اشاعت ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء

۳۲ پرتاب

۳۳ "India which we served" by Sir Walter Lawrance.

۳۴ سائمن رپورٹ جلد اول صفحہ ۳۰

۳۵ The protection of Minorities by L.P.Mair Page 118 Printed at the Chapel River Press Kingston Surry London Published in 1928.

London Published in 1928

۳۶؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۴۳

۳۷؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۲۳

۳۸؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۱۳۰

۳۹؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۱۲۹، ۱۳۰

۴۰؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I Page 542 Published in London 1929.

۴۱؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I Page 401 Published in London 1929.

۴۲؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I Page 401‘402 Published in London 1929.

۴۳؎ The Goverments of Europe by Professor William Bennett Munroe P.H.D.L.L.B Page 738. Printed in the U.S.A 1963.

۴۴؎ Constitution of the United State by Mr. M.James Beck Saltus General Page 117.

۴۵؎ Constitution of the United State by Mr. M.James Beck Saltus General Page 116.

۴۶؎ Modern Democracies by Lord James Bryce Vol,I Page 382‘384 Published in London 1929

۴۶؎ DRAVIDIAN: آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے قدیم باشندوں کا سب سے بڑا گروہ۔ دراوڑی نسل کے لوگ اب بھی جنوبی ہند میں مدراس سے لے کر راس کماری تک آباد ہیں۔ آریوں نے ان لوگوں پر تشدد کر کے انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا تھا۔ ان لوگوں کی لسانی اور تہذیبی بنیادیں بھارتی ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ طرز تعمیر خصوصاً مندروں کی صورت بھی مختلف ہے۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۵۹۵

مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء)

۴۷؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۱۸

۴۸؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۸۲

۴۹؎ Constitution of the United State by Mr. M.James Beck Saltus General Page 127

۵۰؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۳۶

۵۱؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۵۶

۵۲؎ Important indian problems by Sir. Mohammad Shafee Page 89

۵۳؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱

۵۴، ۵۵؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۷۱

۵۶، ۵۷؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۷۱، ۷۲

۵۸؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۷۶

۵۹؎ The Constitution Administration and laws of the Impire by Mr. R.B.C.Keth Page 172.

۶۰؎ سائمن رپورٹ جلد ۱ صفحہ ۵۱

۶۱؎ سائمن رپورٹ جلد ۱ صفحہ ۵۲

۶۲؎ How Briton is Governed by Mr. Romsay Muse P.22.

۶۳؎ سائمن رپورٹ جلد ۲ صفحہ ۱۹

۶۴؎ میمورنڈم پیش شدہ روبرو سائمن کمیشن صفحہ ۴

۶۵؎ The Goverments of Europe by Professor William Bennett Munroe P.H.D.L.L.B Page 543 Printed in the U.S.A 1963.